فاتح

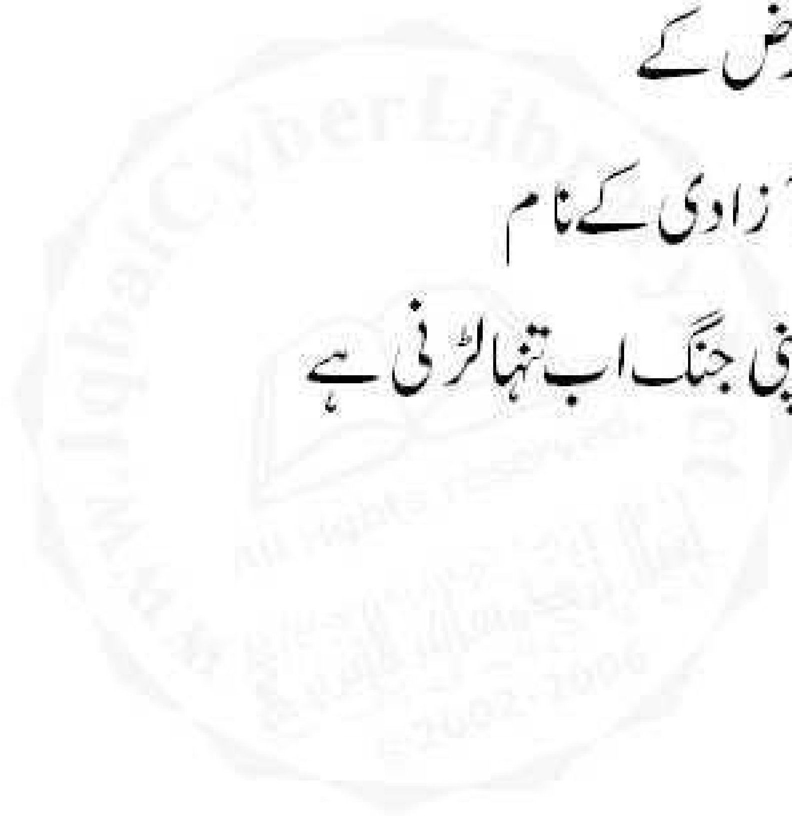
ہارون الرشید

www.pdfbooksfree.pk

ہیرالڈلیم

مترجم ابن الحسن

انتساب



اس خط ارض کے

مجاہدین آزادی کے نام

جنہیں اپنی جنگ اب تنہا لڑنی ہے

ہدیہ تبریک

میں جنرل اختر عبدالرحمٰن سے ذاتی طور پر واقف نہ تھا۔ ایک یا دو مرتبہ سرکاری تقاریب میں رسمی سی ملاقات ہوئی تھی۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم کیوں کہ مجھے عزیز رکھتے تھے اور میں بھی ان کے اخلاق، کردار اور صلاحیتوں کا قدردان تھا۔ اس تعلق سے میں بھی موانست کے جذبات رکھتا تھا۔ دونوں دوستوں اور ان کے قریب ترین ساتھیوں کی شہادت کے بعد جب میں نے بکھرے ہوئے حقائق کو یکجا کیا اور افغانستان میں روسی فوجوں کے داخلہ سے لے کر ان فوجوں کے انخلاء تک کے تقریباً آٹھ برس کا جائزہ لیا تو از خود ہی بے شمار حیرت انگیز انکشافات ہوئے اور اس میں ان دونوں شہداء کی مساعی اور اشتیراک عمل کے بعض عجیب و غریب گوشے وا ہوئے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جنرل اختر عبدالرحمٰن کی شخصیت سے ان کی زندگی میں پوری طرح متعارف نہ ہونے کا اب بہت ملال ہوتا ہے۔ ان کی شہادت کے بعد ان کے صاحبزادے عزیزی ہمایوں اختر سے ملاقات ہوئی۔ قدو قامت، شکل و صورت، طور و اطوار غرضیکہ ہر طرح جاذب نظر شخصیت مسکراتا ہوا چہرہ اور ملنے جلنے میں گرمجوشی اور اپنائیت، پھر اعلیٰ تعلیم و تربیت سے آراستہ، خدا ترس اور نیک چلن، منکرات سے اجتناب اور دینی احکام کی پابندی کرنے والے اس نوجوان سے مل کر اور بھی زیادہ احساس ہوا کہ بیٹے سے مل کر اگر اتنی خوشی ہوئی ہے تو باپ سے مل کر کس قدر فرحت ہوتی۔ معلوم ہوا کہ اختر عبدالرحمٰن کا سارا گھرانا اور اولاد ایسی ہی خوش جمال اور خوش فعال ہے۔ جو شخص اپنے پیچھے ہونہار، نیک اور خوش خصلت اولاد چھوڑ کر جائے پھر اسے یہ حاجت نہیں رہتی کہ اس کی نیک نامی داد و تحسین کے لئے سرکاری انتظامات کیے جائیں یا اس کے نام سے شہر اور عمارتیں، ریل گاڑیاں اور سڑکیں موسوم کی جائیں "مشک آن است کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید"

کچھ دن بعد میری ملاقات جواں سال اور صاحب طرز صحافی برادر عزیز ہارون

الرشید سے ہوئی۔ بہت حساس، بہت جذباتی، بہت مخلص، بہت صاف گو اور شاید سخت گیر بھی۔ ایک ہی نشست میں انہوں نے مجھے صبح نو بجے سے شام کے آٹھ بجے تک اپنے ممدوح اختر عبدالرحمن مرحوم کی شخصیت کے موضوع پر لکھا ہوا تقریباً تین سو صفحات کا مسودہ سنا ڈالا۔ کتاب شائع کرانے کی تیاری تھی۔ مجھ سے فرمائش کی کہ دیباچہ لکھ دوں۔ میں نے پوچھا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند۔ کہنے لگے بس میں نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ دیباچہ آپ سے لکھوانا ہے۔ میں بھی اب عمر کے اس حصہ میں ہوں جہاں میری طرف سے فیصلے دوسرے ہی لوگ کرتے ہیں اور وہ آخری فیصلہ جو کفن دفن کا ہونا ہے وہ تو بہر حال پس ماندگان کو ہی کرنا ہے۔ صاحب کتاب کے فیصلہ کے علاوہ اس دیباچہ کا اور کوئی جواز نہیں۔ نہ میں داناؤں فرزانوں میں شامل نہ علماء و فضلاء میں میرا شمار۔ نہ جنرل مرحوم سے واقفیت اور قربت کا دعوے دار، ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ آج جب کہ ضیاء الحق مرحوم اور اختر عبدالرحمن مرحوم اس دنیا میں نہیں ہیں ان سے کسی بھی قسم کی وابستگی اپنے لئے سعادت سمجھتا ہوں اور اب جو اس دیباچہ سے یہ سعادت حاصل ہو گی تو اس پر ہارون الرشید صاحب کا شکر گزار ہوں۔

ساری دنیا میں ایک معقول طریقہ یہ ہے کہ ایسے لوگ جنہوں نے اپنی زندگی کسی اعلیٰ مقصد کے لئے وقف کر دی ہو، اگر اس مقصد کو حاصل بھی نہ کر سکے ہوں تو انہیں ان کی کوششوں، ان کے ایثار ان کے خلوص کے تعلق سے یاد رکھا جاتا ہے۔

لیکن ہمارے ملک کی بے اختیار اور سوگوار تاریخ میں اس تہذیبی رکھ رکھاؤ سے برابر انحراف کیا جاتا رہا ہے۔ یہاں مرحومین کو بڑی آسانی سے بددیانتی کے ساتھ معتوبین قرار دے دیا جاتا ہے۔ جب مرنے والا اپنے بارے میں کچھ بتانے، کچھ سنانے کے قابل نہیں رہتا۔ جب اس کا سارا حساب اللہ کی بارگاہ میں ہی کیا جانا مقرر ہوتا ہے، تب نئے اہل اختیار اور ارباب اقتدار اس پر نام دھرنے اور الزام

تراشیاں کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ یہ نئے آنے والے، جانے والوں کو بد نام و خوار کر کے خود نیک نام ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کارناموں اور خدمات کو جو جانے والوں نے وطن اور اہل وطن کے لئے انجام دی ہوئی ہیں، فراموش اور مسخ کرنے کی سعی لاحاصل میں اپنی تمام توانائیاں اپنے تمام وسائل ضائع کرتے ہیں لیکن اللہ کا نظام ایسا اٹل اور بے لاگ ہے کہ جو دوسروں کا برا چاہتے ہیں وہ خود بھی اچھائیاں نہیں سمیٹ پاتے اور جو دوسروں کی خوبیاں ڈھونڈتے اور ان کا اعتراف کرتے ہیں خود بھی معاشرے میں سرخرو ہوتے ہیں اور معاشرہ کو بھی شاد و آباد کرتے ہیں۔

قوموں کا بھی یہی حال ہے جو اقوام اپنے مشاہیر اور نابغہ ہائے روزگار کے کارناموں اور خدمات کی قدر کرتی ہیں۔ اسلاف کے نام اور کام کو یاد کر کے فخر سے اپنا سر بلند کرتی ہیں وہ ہمیشہ سرفراز رہتی ہیں۔ ان کے جانے والے جو کام ادھورا چھوڑ کر جاتے ہیں آنے والے اسے احسن طور پر پورا کرتے ہیں نئے کارنامے انجام دیتے ہیں اعلیٰ اقدار کی پاسداری کرتے ہیں اچھی روایات کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ایسی قومیں متواتر کارہائے نمایاں انجام دیتی رہتی ہیں ان کا جوہر قابل برقرار رہتا ہے اسے نیست و نابود نہیں کیا جاتا۔ یہ قومیں اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتی رہتی ہیں اس لئے وہ پسپا اور نامراد نہیں ہوا کرتیں۔ اس شکر کا ایک معروف طریقہ یہ ہے کہ وہ بڑی بڑی نعمتوں اور برکتوں کو نظر انداز کر کے چھوٹی چھوٹی مایوسیوں محرومیوں کا رونا نہیں روتی رہتیں۔ وہ اعلیٰ مقامات کی متلاشی ہوتی ہیں اور اگر توفیق ہو تو اللہ پر بھروسہ کر کے اور توفیق نہ ہو تب بھی خود اعتمادی کے ساتھ ان تک پہنچنے کی سعی کرتی ہیں۔ اس لئے ان کا یہ مقدر نہیں ہوتا کہ ان کے ادنیٰ مفادات بھی ان کے لئے عذاب بن جائیں۔ وہ اپنے ادنیٰ مفادات کی خاطر اقوال و افعال کی تمام معقول احتیاطوں کو بالائے طاق نہیں رکھ دیتیں۔

1980ء کے اوائل سے 1988ء تک کے عرصہ میں پاکستانی اپنی تاریخ کے ایک عجیب وغریب دور سے گزرا ہے۔ اس دور میں بہت سی باتیں، بہت سے واقعات، بہت سی شخصیات بوجوہ بے حد متنازعہ رہی ہیں۔ ان متنازعہ جزئیات اور شخصیات کے بارے میں تاریخی فیصلہ کا تو ابھی کافی عرصہ انتظار کرنا پڑے گا لیکن جیسا کہ ہم سب نے دیکھا اس عشرہ میں پاکستانی آرمی کو جو قیادت حاصل رہی وہ اپنی سمجھ بوجھ، پیشہ ورانہ لیاقت اور ہنر مندی، وسعت نظر اور تدبر کے اعتبار سے بہت ممتاز اور حیرت انگیز طور پر باصلاحیت افسران پر مشتمل تھی۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ یہ اعلیٰ افسران اپنے پیشرو افسران کے مقابلہ میں بالکل دیسی تہذیب اور خالص پاکستانی ذہنیت رکھنے والے افسران تھے۔ نہ ان پر سنڈھرسٹ کی چھاپ تھی اور نہ یہ برطانوی راج کے اثرات کی تصویر تھے۔ ان کی ذہنی تربیت اور کردار کی تعمیر پاکستان میں ہوئی تھی اور اسی سرزمین اور یہیں کے ماحول میں انہوں نے جو بھی تجربات حاصل کیے تھے، انہی تجربوں اور مشاہدات کی روشنی میں انہوں نے اپنے فکرو فلسفہ، اپنے مزاج اور عادات کو سنوارا اور پختہ کیا تھا۔ ان کی نظریاتی اساس، ان کا دین اور ان کا تشخص اسلام اور پاکستان تھا۔

ان اعلیٰ افسروں میں جنرل ضیاء الحق، جنرل اختر عبدالرحمن، جنرل رحیم الدین خان، جنرل خالد محمود عارف کا تعلق 1980ء کے عشرہ میں براہ راست پاکستان کے نظم ونسق اور اس کی قومی زندگی کے بارے میں حکمت عملی تیار کرنے اور فیصلے کرنے سے تھا۔ یہ آپس میں ایک دوسرے کی فکرو نظر سے مکمل طور پر واقف تھے اور ایک دوسرے کے خیال اور موقف کو نہ صرف پوری طرح سمجھنے کے اہل تھے بلکہ آزادانہ اور بے تکلفانہ ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کر کے معاملات اور مسائل کے بارے میں لائحہ عمل کی تفصیلات مرتب کرنے پر بھی قادر تھے۔ جنرل محمد ضیاء الحق جو صدر مملکت ہونے کے علاوہ فوج کے چیف آف سٹاف بھی تھے، کسی بھی نتیجہ پر

پہنچنے سے قبل اپنے ان تین ساتھیوں سے الگ الگ یا مشترکہ طور پر مشورہ ضرور کرتے تھے، چنانچہ نظم ونسق، عسکری تنظیم، خارجہ پالیسی، دفاعی حکمت عملی میں محمد ضیاء الحق مرحوم کو بھی کامیابی ہوئی، اس میں یہ حقیقت ان کے لئے بہت سازگار رہی کہ انہیں کم ازکم ایسے ساتھی میسر تھے جن کے سامنے وہ اپنا دل کھول سکتے تھے اور جن کے دلوں میں وہ جھانک کر دیکھ سکتے تھے۔ اس کی بڑی وجہ ان کی تہذیبی، فکری اور نظریاتی یک رنگی تھی۔

اس کتاب کا تعلق کیوں کہ جنرل اختر عبدالرحمن مرحوم سے ہے اس لئے یہ چار یار مشترکہ طور پر فرداً فرداً میرا موضوع نہیں ہیں۔ میں صرف اختر عبدالرحمن کے اس تعلق کا ہی ذکر کروں گا جو قومی معاملات میں ان کا محمد ضیاء الحق کے شریک کار کی حیثیت سے رہا ہے۔ اس کا تفصیلی تجزیہ تو مصنف نے اس کتاب میں کر دیا ہے۔ میں صرف یہ بتانا چاہوں گا کہ اختر عبدالرحمن کے اشتراک سے جنرل محمد ضیاء الحق نے وہ کارنامہ انجام دیا تھا جس کی تکمیل میں اب جتنا بھی وقت لگ رہا ہے، اس سے ساری دنیا پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی جا رہی ہے کہ یہ دونوں شہداء کتنے با صلاحیت تھے اور ان کے بعد آنے والے برابر خود کو کس قدر نا کارہ ثابت کر رہے ہیں۔ یہی افغانستان کا مسئلہ تھا کہ جہاں روس جیسی عظیم اور خوفناک طاقت اپنا عسکری قبضہ اور اقتدار منوانے کا عزم لئے موجود تھی۔ یہی بھارت تھا جہاں اندرا گاندھی جیسی آگ اور خون سے کھیلنے والی حکمران ساری دنیا سے اپنا لوہا منوا چکی تھی اور مشرق وسطیٰ سے جنوبی ایشیا تک یعنی میدا غاسکر سے آبنائے ملاکا تک کیس ارے علاقہ پر تسلط کی خواہاں تھی۔ یہی ایران اور عراق تھا جو برسر پیکار تھے اور دونوں ہی برادر اسلامی ممالک سے ربط وخلوص قائم رکھنے کا مسئلہ تھا۔ یہی دنیائے اسلام تھی جس میں حرم کی پاسبانی کے لئے مسلمانوں کو یکجا رکھنے کے خواب کو حقیقت بنانے کی کوششیں درکار تھیں۔ یہی جنوبی ایشیا کے ممالک تھے بھارت کی طاقت اور نخوت

کا بیں سامنا تھا۔ یہی امریکہ تھا جہاں سرد و گرم چشیدہ صدر ریگن وقت کے سب سے با اختیار فرماں روا کی حیثیت سے وہائٹ ہاؤس میں رہائش پذیر تھا۔ جو لوگ 1980ء کے عشرہ کو اپنی کمزور یادداشت یا سفاک عصبیت کی وجہ سے فراموش نہیں کر چکے ہیں بلکہ انہیں یہ یاد ہے کہ افغانستان میں روسی فوجیوں کس طرح داخل ہوئیں اور برزنیف سے گورباچوف تک روسی سربراہوں اور ان کے وزراء، سفراء اور جرنیلوں نے پاکستان کو ڈرانے، دھمکانے، تنگ کرنے، پاکستانی قوم کی نفسیات کو مجروح اور ذہن کو تذبذب، تشویش اور پراگندگی کا شکار کرنے اور پاکستان میں خود پاکستانی سیاسی عناصر کے ساتھ مل کر تخریب کاری، وحشت گردی اور انتشار کیسے وسیع پیمانہ پر بپا کیا۔ وہ 1988ء میں روسی فوجوں کے افغانستان سے انخلاء کے واقعہ کی تاریخی عسکری اور بین الاقوامی اہمیت کا کسی حد تک اندازہ لگا سکتے ہیں۔

عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے
اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

کہا تو یہ گیا تھا کہ ”آپ ایک سپر پاور کو سزا نہیں دے سکتے“ اور جس وقت اخباری اور سیاسی حلقوں میں یہ فقرہ سنا گیا تو اسے ایک نہایت مدبرانہ اور بامعنی مقولہ کے طور پر دانایان عالم نے اٹھتے بیٹھتے دہرایا۔ کیا پاکستان اور کیا پاکستان کی فوجی قوت اور قومی وسائل لیکن وہ جو شاعر مشرق نے کہا تھا، وہ اس چلتے ہوئے فقرہ سے زیادہ بامعنی اور بلیغ تھا۔

خودی بلند تھی اس خوں گرفتہ چینی کی
کہا غریب نے جلاد سے دم تعزیر
ٹھہر ٹھہر بہت دلکشا ہے یہ منظر
ذرا میں دیکھ تو لوں تابناکی شمشیر

اور یہی ہوا جبھی محمد ضیاء الحق اور اختر عبدالرحمن نے اپنی شہادت سے آٹھ برس قبل

تابنا کی شمشیر دیکھی اور اس کے خوشنما منظر کے ان مضمرات کو سمجھ لیا تھا جو قوت ربانی، تحمل، استقامت اور بلند حوصلہ کے حامل لوگ ہی دیکھ اور سمجھ سکتے تھے۔ جو اپنے اسلاف کے عزم اور تقویٰ سے ناواقف نہ تھے اور جو رہنمائی اور تقلید کے لئے برصغیر کی دیو مالائی تہذیب اور فکریا مغرب کے بے روح اور مادی فلسفہ حیات کے محتاج نہ تھے بلکہ جنہیں ہدایت کے لئے قرآن، تقلید کے لئے رسول خدا اور صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کی سیرت مبارکہ اور غور و فکر کے لئے اپنے فلسفہ حیات، اپنی تاریخ، اپنی تہذیب پر مکمل بھروسہ تھا۔ دوسری اقوام کی تاریخ اور ان کے عطا کردہ علوم سے وہ پوری طرح استفادہ کے اہل تھے اور انہوں نے ان سے ما حقہ فائدہ اٹھایا بھی لیکن یہ علوم ان کے لئے جزو ایمان کی حیثیت نہیں رکھتے تھے یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنی حکمت عملی سے ایک بہت ہی خطرناک دور میں وہ کچھ حاصل کیا جسے حاصل کرنے کا ان سے قبل تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور جسے حاصل کرنا اب ان کے بعد غیر ضروری قرار دے دیا گیا ہے۔

لیکن اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی چنانچہ محمد ضیاء الحق اور اختر عبدالرحمن نے پاکستان سے وابستہ کسی ایسے معاملے پر کبھی باطل یا منافقانہ تصورات یا حکمت عملی سے کوئی واسطہ نہ رکھا جو نظریاتی اعتبار سے یا دینی اعتقادات کی روشنی میں نا قابل قبول تھے۔ پاکستان اور اسلام کے مفادات کے منافی ہر قوت، ہر تحریک اور ہر یورش کا انہوں نے ایک دوسرے کے اشتراک سے مقابلہ کیا اور اس میں ذرہ برابر شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ وہ کامیاب ہوئے۔ پاکستان کامیاب ہوا اور اسلامی قوتوں کو اس کامیابی سے ایسی تقویت حاصل ہوئی ہے کہ دنیائے اسلام میں آنے والے زمانہ میں جو کچھ ہونے والا ہے، جو تبدیلیاں رونما ہونے والی ہیں ان سب کے محرکات اور توجیہات انہی کامیابیوں میں تلاش کئے جائیں گے۔ کاش کہ 1987-88ء میں پاکستان کے وزیر اعظم اور نائب وزیر خارجہ کو بھی اللہ نے

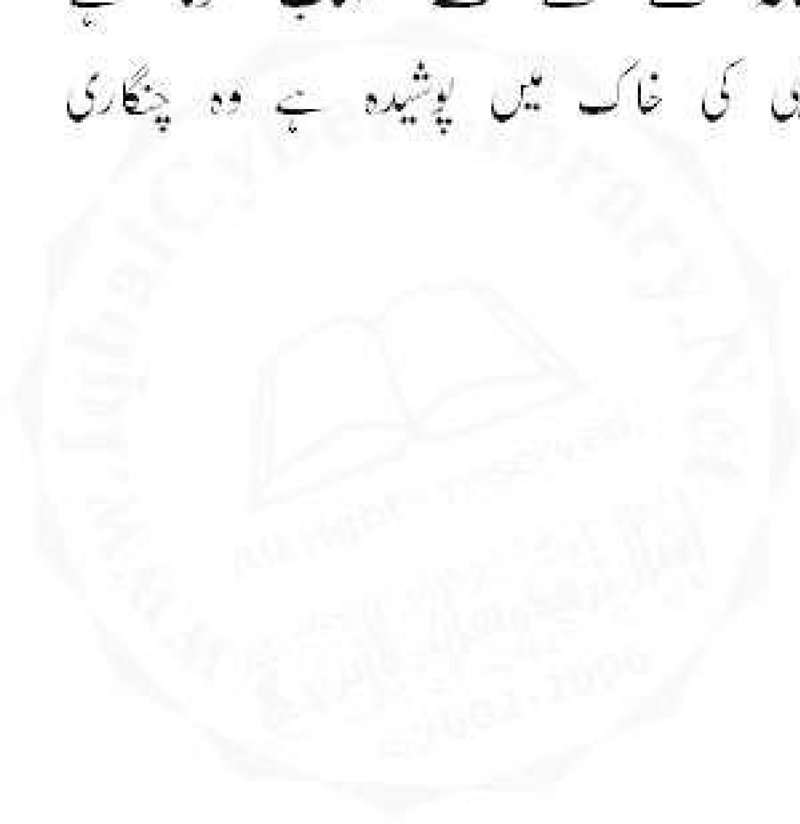
وہی ذہنی صلاحیتیں وہی قلب ونظر عطا کیا ہوتا جس سے صدر محمد ضیاء الحق اور ان کے دفاعی مشیر چیئرمین آف دی جائنٹ چیفس آف سٹاف جنرل اختر عبدالرحمن کو نوازا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر ہمارے جیسے ہیچمدان اور نا اہل وکج فہم عرائض نویسوں کی کیا مجال کہ حرف شکایت ادا کریں یا نکتہ چینی کے مرتکب ہوں البتہ آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے۔

جو لوگ دو برس گزر جانے کے بعد بھی جمہوریت کی کسی ایک برکت سے بھی پاکستان کو ہمکنار نہیں کر سکتے ہیں ان کا تو یہ مقام ہی نہیں ہے کہ وہ کردار اور ایمان کی اعلیٰ ترین صلاحیتوں اور پیشہ ورانہ مہارت اور کارکردگی سے مزین اور پوری وردی میں فوجی کمان کی ذمہ داریاں انجام دیتے ہوئے شہید ہونے والوں کا محاسبہ کریں اور ان کے مدارج کا تعین کریں، البتہ سنجیدہ حلقوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ پاکستان کے دفاعی اور جغرافیائی حالات کے بیالیس سالہ پس منظر میں 1980ء سے 1988ء تک کی دفاعی حکمت عملی، عسکری تنظیم اور تعمیر نو کا جائزہ منصفانہ انداز میں لیں اور خود ہی اندازہ لگالیں کہ دسمبر 1971ء میں ہم ایک ہزیمت یافتہ قوم کے طور پر کس جگہ کھڑے تھے اور آج ہماری دفاعی تنظیم کے بارے میں عالمی مبصرین کے کیا اندازے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ جوش انتقام اور جھنجھلاہٹ سے مغلوب ہو کر یا اپنے نیم پختہ اور برخود غلط تصورات کے زیر اثر موجودہ برسر اقتدار خواتین وحضرات نے وزارت دفاع کے کن کن شعبوں کی شکست وریخت کر ڈالی ہے یا دفاع اور خارجہ حکمت عملی کے باہمی ربط کو کس حد تک منتشر کر دیا ہے لیکن جو کچھ دور سے نظر آ رہا ہے وہ بے حد تشویشناک ہے۔ اختر عبدالرحمن مرحوم نے دفاع کے بہت ہی حساس شعبوں کو اتنا موثر اور فعال کر دیا تھا کہ ہماری خارجہ اور دفاعی حکمت عملی نہایت سائنٹفک اور مربوط انداز میں اپنے جغرافیائی ماحول کی پوری نگران تھی۔ اس کے پاس مسائل اور مراحل سے عہدہ برآ ہونے کے تمام ضروری

وسائل تھے ہماری دفاع اور خارجہ امور کی مشینری حسب ضرورت منصوبے بنانے میں مصروف رہتی تھی اور وہ ہر ناگہانی اور غیر متوقع صورت حال کا سامنا کرنے کی بھی اہل تھی۔ اس نے بہت ہی موثر اور متنوع منصوبے بنانے کی صلاحیت حاصل کر لی تھی اور ان پر نہایت خاموشی سے عمل پیرا ہونے کے فن پر بھی اس کو دسترس ہو گئی تھی۔ ہماری فوج، فضائیہ اور بحریہ کو جو قوت، تیاری تربیت اور اعتماد آج حاصل ہے وہ سب اسی 1980ء سے 1988ء تک کے دور میں حاصل ہوا لیکن اس کے سامنے آج جو مسائل ہیں اور جن میں برابر اضافہ ہی ہو رہا ہے وہ گزشتہ ڈیڑھ برس کی حکومتی مہربانیوں اور کرم فرمائیوں نے پیدا کیے ہیں۔ یہ صاف نظر آ رہا ہے کہ فوج اس وقت اپنے جن منصوبوں اور جس حکمت عملی، جن تصورات اور جن مقاصد کا بڑی وفاداری اور جاں نثاری کے ساتھ تحفظ کرنے میں مصروف ہے اور جن کی بقا اور تحفظ موجودہ سیاسی ماحول میں ہر آنے والے دن زیادہ سے زیادہ دشوار ہوتا جا رہا ہے، وہ سب وہی ہیں جو دو شہید جرنلوں نے شب و روز کی محنت اور غور و فکر سے ترتیب دیئے تھے اور جن کو آٹھ سال تک برابر سنوارا اور بہتر سے بہتر بنایا جاتا رہا۔ بہت سے ایسے راز رہے ہوں گے جن سے صرف ان دونوں جرنیلوں کے کان اور آنکھیں آشنا ہوں گی اور جو ان کے سینہ میں مدفون انہی کے ساتھ رخصت ہو گئے ہوں گے۔ لیکن وہ منصوبے اور کامیابیاں جو یہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں مجھے یقین ہے کہ تا حال فوج ان سے فائدہ اٹھانے پر قادر ہے۔ کیوں کہ یہ سب منصوبے قابل عمل ہیں۔ یہ پاکستان کے دفاعی وسائل اور امکانات کو پوری طرح سمجھ کر حقیقت پسندانہ انداز میں مرتب کیے گئے ہیں۔ یہی ان دو شہیدوں یعنی جنرل محمد ضیاء الحق اور جنرل اختر عبدالرحمن کا پاکستان اور عساکر پاکستان کے لئے اپنے پیچھے چھوڑا ہوا عطیہ ہے۔ وہ اول اور آخر مجاہد تھے اور اول و آخر مسلمان اور پاکستانی تھے۔ اللہ ان کے درجے بلند کرے اور ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم حقیقت آشنا اور جوہر شناس ہو

سکیں اور اس واضح اشارے کو سمجھ سکیں کہ

زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے
انہی کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری



ابن الحسن

باب اول

مغل فوج کا آخری سالار

یہ دور زوال کے ایک فاتح کی کہانی ہے۔ ایک ناکام معاشرے کے کامیاب آدمی کی کہانی، یہ ایک آدم زاد اور نصف صدی پر پھیلی ہوئی اس کی بے تکان جدوجہد کی داستان ہے، لیکن یہ ایک خاندان اور قبیلے کی حکایت بھی ہے۔ یہ ایک خواب کی داستان ہے، جو سینکڑوں سال پہلے خراسان کی ایک وادی میں دیکھا گیا اور اب بھی پہاڑی کے چراغ کی طرح روشن ہے۔

اس کہانی کے پس منظر میں دور بہت دور تک غزنویوں، غوریوں، لودھیوں اور سوریوں کے گرد اڑاتے، شمشیر بکف لشکر دکھائی دیتے ہیں ریگستانوں، وادیوں اور پہاڑوں میں اپنے سموں سے چنگاریاں اڑاتے گھوڑے۔ جن کے شہ سوار دم نہیں لیتے اور جن کی آنکھوں میں چمک کبھی ماند نہیں پڑتی۔ یہ مغل لشکر کے آخری سالار کی کہانی ہے، جو اپنے قافلے سے بچھڑ گیا تھا۔ وہ بیسویں صدی کے وسط میں طلوع ہوا۔ اپنی شمشیر آب دار سے، اس نے اپنی گردوپیش کو چمک سے بھر دیا، لیکن وہ زمین کے سینے پر کبھی اکڑ کر نہ چلا۔

یہ ایک بچے کی کہانی ہے، جس نے یتیمی میں پرورش پائی، لیکن محرومی اور تنہائی اس میں بے چارگی اور کم ہمتی پیدا نہ کرسکی۔ یہ پانچ عشروں پر پھیلے ہوئے ایک مشکل، متنوع اور دشوار گزار سفر کی داستان ہے، جو عزم و ہمت سے طے کیا گیا۔ یہ ایک مسافر کی داستان ہے، جس نے کبھی اپنوں سے گلہ کیا اور نہ بیگانوں سے، زمانے کی شکایت کی اور نہ مخلوق خدا کی، جس نے کبھی ہاتھ نہیں پھیلایا اور کبھی مدد نہیں مانگی۔ یہ کم آمیز اور سرفراز آدمی کی داستان ہے، جس نے کبھی اپنے غم کی حکایت بیان نہیں کی اور جسے آخر کار اس کی کامرانیوں نے آسودہ کردیا۔

یہ ایک صاحب استقلال کی داستان ہے، جو عمر بھر اپنے مقاصد سے جڑا رہا اس کی

ہر منزل سفر کا ایک پڑاؤ بنتی گئی۔ وہ آدمی، جس نے جنگل کے سفر میں کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔ جس نے اپنا دھیان کبھی بٹنے نہ دیا اور جس نے اپنی راہ کبھی کھوٹی ہونے نہیں دی۔

وہ آدمی جس نے دباؤ، دھونس، دھاندلی اور خوشامد کے معاشرے میں اپنی ترجیحات پر سمجھوتہ کرنے کی ضرورت کبھی محسوس نہ کی۔ وہ آدمی جسے اس کی ماں نے آزاد جنا تھا، جس نے ایک آزاد آدمی کی زندگی گزاری اور شہید کی موت پائی۔

نعروں، تقریروں اور دعوؤں کے شور شرابے کی اس دنیا میں جو اب ریلوے کے پلیٹ فارموں اور بسوں کے اڈوں کی طرح ہوتی جا رہی ہے، وہ ایک ایسا آدمی تھا، جس کے پاس بہت تھوڑے سے لفظ تھے۔ ایک طویل پر مشقت اور گاناگوں زندگی، اس نے ان تھوڑے سے لفظوں کے ساتھ گزار ڈالی۔

وہ زندگی بھر دعویٰ کرنے اور نعرہ لگانے سے گریزاں رہا۔ وہ آدمی، جس نے کبھی اپنے منہ پر ہاتھ پھیر کر کسی کو دھمکی دی اور نہ سینے پر ہاتھ مار کر کوئی اعلان کیا۔ منافقت کے شکار، ایک زوال پذیر معاشرے کا سچا اور کھرا آدمی، سچ کی طرح سادہ اور عناصر فطرت کی طرح کھوٹ سے پاک۔

یہ ایک بے ساختہ آدمی کی حکایت ہے، جس کے پاس اپنی ذات کے بارے میں چھپانے کے لئے کچھ نہ تھا۔ کوہساروں، درختوں اور آب رواں کی طرح ایک جانا پہچانا اور واضح آدمی اس کی زندگی میں دیانت اور سچائی اس طرح تھی جس طرح شاخ شجر میں نمی اور روئیدگی۔ فلسفی کے بقول وہ عمر بھر کیوڑے کے درخت کی طرح خوشبو لٹاتا اور اپنے ماحول میں اجالا کرتا رہا اور اسے اس کی خبر تک نہ تھی۔ یہ ایک چپ چاپ آدمی کی داستان ہے جو ہزاروں، لاکھوں الفاظ میں بھی آسانی سے بیان نہیں کی جا سکتی۔ وہ آدمی، جس نے اپنی زندگی میں طے کردہ تقریباً ہر ہدف کو حاصل کیا اور اس پر بھی کسی زعم کا شکار نہ ہوا۔

یہ ایک باوفا خاندان کی صدیوں پر پھیلی ہوئی حکایت کا آخری باب ہے، جس نے نئی سرزمین پر ایک عہد کیا اور نسل در نسل اسے نبھاتے رہے۔ وہ خاندان جس نے مغلوں کا ساتھ دینے کی قسم کھائی اور اسے پورا کیا۔ یہ نسل در نسل عزم و ہمت کی ایک لازوال داستان ہے، زمند قبیلے سے تعلق رکھنے والے اس خاندان کی تاریخ میں حیرتوں کے کئی باب ہیں اور ہر باب میں سوچنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

جنرل اختر عبدالرحمن کے جد امجد جاول خان کے خاندان کی کہانی مسلم برصغیر ہی کی کہانی ہے۔ خیرہ کن عروج، المناک زوال، ذہنی شکست اور پھر سے ایک خواب کی بازیافت کی کہانی، ان بہادروں کے کارنامے تاریخ کا حصہ ہیں جو مرہٹوں اور راجپوتوں سے لڑتے رہے اور جنہیں پنجاب اور سکھ شورش کا مقابلہ کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ تاریخ کے نشیب و فراز میں وہ آخری ساعت تک چغتائیوں کے ساتھ رہے تا آنکہ آفتاب غروب ہو گیا۔

اس خاندان کا سب سے بڑا کارنامہ اس آدمی نے سرانجام دیا جس سے اس کی توقع ہی نہیں رکھی گئی تھی۔ راکھ میں ایک چنگاری باقی رہ گئی تھی، اس سے الاؤ بھڑکا اور آسماں گیر ہو گیا۔

روسی فوج کے بہترین جرنیل، جن کی پشت پر دنیا کی سب سے بڑی جنگی مشین، جدید ترین اسلحہ کے انبار اور احتساب سے ماورا حکمرانوں کی مکمل توثیق موجود تھی، افغانستان میں غیر منظم لشکروں کی بغاوت کیوں نہ کچل سکے اور آخر کار خائب و خاسر ہو کر آمو کے پار کیوں چلے گئے؟ جب تاریخ اپنا کھوٹا کھرا الگ کرے گی تو آخر کار وہ اس سوال کا ایک سادہ اور دو ٹوک جواب فراہم کرے گی۔ یہ سخت کوش، غنتم مزاج، انفرادیت پسند اور صاحب ایمان افغانیوں اور دو پاکستانی جرنیلوں کی وجہ سے ممکن ہو سکا۔ ان میں سے ایک میدان میں تھا۔ رزم گاہ کے گھوڑے کی طرح سرپٹ بھاگتا، اعتماد سے سرشار اور خوف سے پاک اور دوسرا وہ جو اس کی پشت پر

پہاڑ کی طرح کھڑا رہا کہ دست قدرت نے اسے نا قابل شکست ایمان کی دولت بخشی تھی۔ جنرل محمد ضیاءالحق اور جنرل اختر عبدالرحمن۔

نپولین کا سپاہی اس کے لئے دشمن کا علم اتار کر لایا تھا تو تلواروں کے گھاؤ سے اس کے گھوڑے کی کمر خون آلود تھی۔ عظیم فاتح اپنے سپاہی کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے عمر بھر موزوں الفاظ تلاش نہ کر سکا۔ ضیاءالحق اور اس کے جرنیل نے ایک ساتھ بلندیوں پر جان دی۔ ضیاءالحق کو بھی اپنے سپاہی کی تحسین کے لئے موزوں الفاظ نہ مل سکے اور جب ایک بار اس نے ایسا کرنا چاہا تو آنسو اس کی آنکھوں سے پھوٹ پڑے۔ اب وہ دونوں آدمی افغانستان کی لوگ کہانیوں اور گیتوں میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ اب ان کی تحسین کا فریضہ تاریخ ادا کرے گی، افغان مائیں ان کے نام پر اپنے بچوں کے نام رکھا کریں گی۔ امان اللہ خان کے باب الظفر کی تقلید میں ان کے لئے ایک روز کابل میں فتح کی یادگار تعمیر کی جائے گی۔

یہ کارنامہ کس طرح انجام دیا گیا؟ ہمیشہ کی طرح اس کے پیچھے ایک خواب تھا۔ ہجرت کے سفر اور دشمن کی شقاوت قلبی کا تجربہ رکھنے والے دو سپاہیوں کا خواب جو اپنی قوم کی توہین پر آزردہ تھے۔ اسے تباہی کی دلدل سے نکالنا اور دشمن کا قرض چکانا چاہتے تھے کہ یکا یک ایک نیا چیلنج ان کے سامنے آ کھڑا ہوا اگر وہ صاحب ایمان نہ ہوتے، اگر ان کے دلوں میں یقین کی مشعل روشن نہ ہوتی تو وہ اپنے ہم وطن سیاسی رہنماؤں اور دانشوروں کی طرح ایک بے پناہ سپاہ سے مرعوب ہو کر سمجھوتہ کر لیتے، تب شاید تاریخ کا وہ باب مدتوں کے لئے موخر ہو جاتا جسے صرف افغانستان اور پاکستان ہی نہیں، کشمیر، برلن، بلغاریہ اور ماوراالنہر میں اجالا کرنا تھا لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا، جب قدرت کسی کا انتخاب کر لیتی ہے تو وہ دوسروں جیسا نہیں رہتا، وہ عام لوگوں کی طرح دو اور دو چار کے پیمانے سے نہیں سوچتا۔

ایک اجلا اور برتر خواب آدمی کو کیا بنا دیتا ہے؟ اگر غزنی کی سلطنت میں محمود نے

ایک جنم نہ لیا ہوتا تو شاید لاہور کی ہندو شاہی کا اقتدار کابل سے آگے دریائے آمو اور شاید اس سے بھی آگے وسطی ایشیا تک پھیل جاتا، جہاں مزاحمت کرنے والی کوئی دوسری قوت موجود نہ تھی۔

اگر 1979ء میں پاکستان کی فوج کو جنرل اختر ایسا جرنیل نصیب نہ ہوتا تو شاید وہ ایک بار پھر 14971ء ایسے المیے سے دو چار ہو جاتی، لڑے بغیر اپنی جنگ ہار دیتی۔غزنوی ترک تھا اور اس نے تاجکوں، ازبکوں اور نومسلم پشتون قبیلوں کی مدد سے آمو کی طرف بڑھتے ہندو لشکروں کو روک کر انہیں سومنات تک پسپا کر دیا۔بار بار کے حملوں سے اس نے عالمی طاقت کا خواب دیکھنے والوں کی کمر توڑ ڈالی

اختر عبدالرحمن ایک پشتون تھا غزنوی کی طرح اس کے لشکر میں بھی ازبک، تاجک ترکمان ہزارے اور پشتون جنگجو شامل تھے۔جو زندگی کو آرزو اور آزادی سے بڑھ کر عزیز نہیں رکھتے۔اس نے آمو پار کر کے دنیا کو تاراج کرنے والوں کا سامنا کیا اور ان کے لئے ایک ایسی ہزیمت کی بنیاد رکھی، جس سے وہ اب کبھی سنبھل نہ پائیں گے۔

وہ غزنوی کی طرح اپنے فیصلے کرنے کے لئے آزاد نہیں تھا کہ وہ ایک پیشہ ور فوج کا تنخواہ دار سالار تھا، ورنہ وہ افغانستان سے بہت پہلے ایک اور میدان جنگ کا انتخاب کرتا۔30 سال وہ کشمیر میں جنگ لڑنے کا خواب دیکھتا رہا لیکن اس کی تقدیر میں ایک اور میدان لکھا تھا۔اس جنگ کے آخری مرحلے میں اس نے اپنے سردار جنرل محمد ضیاء الحق کی مدد سے افغانستان میں روشن کی جانے والی آگ کی ایک چنگاری کشمیر کی وادیوں میں پھینک دی تھی۔اسی چنگاری سے اب کشمیر کے چنار روشن ہیں اور اسی کی بدولت وہ وادی جنت نظیر کے اہل جہاد کی دعاؤں میں زندہ ہیں۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی اپنا حقیقی کردار زندگی کے آخری مرحلے میں ادا

کرتا ہے۔ اس وقت جب کوئی کارنامہ انجام دینے کی ایک موہوم سی آرزو ہی باقی ہو، ایک چیلنج اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے اور پھر یوں اس کے جوہر کھلتے ہیں جیسے پتھر کا جگر چیر کے جھرنا پھوٹ بہے۔

لیڈروں کے لیڈر محمد علی جناح اس وقت 64 سال کے تھے جب انہیں اپنی سیاسی زندگی کا سب سے بڑا معرکہ درپیش ہوا۔ اختر عبدالرحمن 1979ء میں 55 سال کے تھے جب روس کی افواج قاہرہ افغانستان میں داخل ہوئیں۔ اگرچہ وہ پاکستانی فوج میں جنگوں کا سب سے زیادہ تجربہ رکھنے والے جنرل تھے، لیکن یہ ان کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ یکایک انہیں ایک ایسی جنگ سے واسطہ پڑے گا، جس کے بارے میں کبھی سوچا تک نہیں گیا تھا۔

بدترین حالات میں اپنے اعصاب پر قابو اور اپنے خدا پر یقین رکھنے والے جنرل محمد ضیاء الحق رومان پسند تره کئی کے بعد سفاک حفیظ اللہ امین کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ انہیں اپنی قوم سے جنگ نہیں کرنی چاہئے۔ انہیں اندازہ تھا کہ یہ جنگ کیسی تباہی لائے گی؟ چنانچہ انہوں نے کابل میں ایک کے بعد دوسرے کٹھ پتلی حکمران سے کہا کہ اگر وہ اصلاح پر آمادہ ہوں تو پاکستان ان کی مدد کرنے کے لئے تیار ہے۔ یکایک روسی افواج پاکستان کی شمالی سرحدوں پر پہنچ گئیں۔ جنرل ضیاء الحق نے فوراً ہی اپنے نائب کو طلب کر کے جو روس نواز کمیونسٹوں سے برسر اقتدار افغان مجاہدین کے لئے محدود سے امدادی پروگرام پر عمل کر رہا تھا، ایک ایسا منصوبہ بنانے کا حکم دیا، جس کے تحت کم از کم دو سال تک روسیوں کو الجھائے رکھا جائے۔

جنرل اختر عبدالرحمن نے یہ منصوبہ نہیں بنایا، جس کا کمانڈر انچیف نے انہیں حکم دیا تھا۔ اس کے برعکس جب وہ چند روز کے بعد اپنے سردار کے پاس واپس گئے تو ان کے پاس ایک اور منصوبہ تھا روسیوں کو افغانستان سے نکال پھینکنے کا منصوبہ۔

جنرل اختر عبدالرحمن نے جو صرف سات ماہ پہلے تھری سٹار جنرل بنائے گئے تھے،

اس شخص کے سامنے اپنے منصوبے کی وضاحت کی جو دوسروں کی بات ہمیشہ توجہ سے سنتا تھا اور جسے سپاہ گری سے عشق تھا۔ انہوں نے کہا روسی خطرے کے بارے میں ان کی رائے وہی ہے جو پاکستان کو درپیش بھارتی چیلنج کے بارے میں ہے اور جس سے مانند رانچیف بخوبی واقف ہیں۔ انہوں نے کہا کوئی فوج اول روز سے دفاعی پوزیشن اختیار کر کے کامیابی حاصل نہیں کر سکتی اور یہ کہ دشمن کو خوفزدہ کر کے ہی اپنا مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔

بھارت کی بات دوسری تھی، لیکن کیا سوویت یونین ایسی سپر پاور کے ساتھ ویسا ہی جارحانہ رویہ اختیار کیا جا سکتا تھا؟ کیا روسیوں کو زچ کر کے افغانستان سے بھگایا جا سکتا ہے جو ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں کے ساتھ دیہاتوں پر یلغار کرتے ہیں اور ان کے سروں پر ایم آئی 24 ہیلی کاپٹر اور مگ طیارے پرواز کر رہے ہوتے ہیں۔ جنرل اختر عبدالرحمن کا جواب اثبات میں تھا۔ ان کی رائے میں روسی افغانستان میں فوجی مداخلت کر کے ویسی ہی غلطی کر چکے تھے، جیسی کہ دوسری عالمگیر جنگ میں روس پر حملہ کر کے ہٹلر نے کی تھی۔

پھر سپاہی نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا اور اس بند کتاب کے اوراق اپنے سردار پر کھول دیئے جو گذشتہ سات ماہ میں افغانستان کی صورتحال پر غور کرتے ہوئے اس کے ذہن میں تشکیل پائی تھی، یہ ایک تحیر خیز منصوبہ تھا لیکن ایک زنجیر کی طرح اس کی ہر کڑی دوسری کڑی سے پیوستہ تھی، منصوبہ ساز نے اس پر بہت سوچ بچار کیا تھا اور اس کے پاس ہر سوال کا جواب موجود تھا۔ مکمل اور بے داغ یقین کے ساتھ اس نے کہا کہ روسی ایک حماقت کر بیٹھے ہیں اور انہیں اس کی سزا دی جا سکتی ہے جس طرح ماسکو کا رخ کرنے والے نپولین اور ویت نام میں افواج اتارنے والے امریکہ کو دی گئی تھی۔

اب صرف ایک سوال باقی تھا کیا افغان مجاہدین کے لئے مسلمان ممالک، مغربی

یورپ اور سب سے بڑھ کر امریکہ سے مالی اور فوجی مدد حاصل کی جا سکے گی؟ آئی ایس آئی سے وابستگی کے ساتھ مہینوں میں افغان حریت پسندوں کی امداد کے حوالے سے سی آئی اے کے افسروں اور ممتاز امریکی شخصیتوں سے تبادلہ خیال کے حوالہ سے جنرل اختر عبدالرحمن کا جواب اثبات میں تھا۔ پاکستان کی دفاعی قوت کو مستحکم بنانے اور بھارت کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ ہمیشہ امریکہ سے قریبی دفاعی تعاون کے حامی رہے تھے اور اب اس پر پہلے سے زیادہ زور دینے لگے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ ایران اور ویت نام کا زخم خوردہ امریکہ روس کو ہزیمت سے دوچار کرنا اور ایک یاد رہ جانے والا سبق سکھانا چاہتا ہے۔

ویت نام کی جنگ کے بعد سے امریکہ مسلسل پسپائی کا شکار تھا اور سوویت یونین مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ ایرانی انقلاب کے بعد سے امریکی صدر کارٹر ناکامی اور نااہلی کی ایک علامت بن گئے تھے اور رائے عامہ مرتب کرنے والے ادارے دنیا کو بتا رہے تھے کہ امریکی شہریوں کی اکثریت آئندہ سالوں میں سوویت یونین اور کمیونزم کی پیش قدمی پر یقین رکھتی ہے۔

پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی وجہ سے، جسے ضیاءالحق ترک کرنے پر آمادہ نہ تھے، امریکہ کی اقتصادی امداد جس پر پاکستان دو عشروں سے انحصار کرتا آیا تھا، کم ہوتے ہوئے ملک کی اقتصادی امداد کا صرف تین فیصد رہ گئی تھی۔ قوم کی نفسیات پر 1971ء کی شکست کے سائے تھے۔ 1977ء کی عوامی تحریک کے بعد جس نے قوم کو دو گروہوں میں بانٹ دیا تھا فوج اقتدار میں تھی، ذوالفقار علی بھٹو قتل کے ایک مقدمے میں پھانسی دی جا چکی تھی نومبر 1979ء میں دوسری بار عام انتخابات ملتوی ہونے کے بعد سیاستدانوں کی اکثریت ضیاءالحق پر برہم تھی۔ اخبارات پر سنسر نافذ تھا اور سرکاری ذرائع ابلاغ اپنا اعتبار کھو چکے تھے۔ بھارتیوں اور یہودیوں سمیت دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے خلاف ایک تکلیف دہ اور

توہین آمیز شور شرابا برپا کئے ہوئے تھے۔ کیا روسی فوجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ ایک موزوں صورتحال تھی؟

ضیاء الحق اب تک تصادم کو ٹالتے آئے تھے۔ 1974ء میں تر ہ کئی پاکستان اور ایران سے مفاہمت پر آمادہ، داؤد خان کو فوج کی مدد سے قتل کرکے اقتدار میں آئے تو پاکستان قومی اتحاد کے رہنماؤں، نواب زادہ نصر اللہ خان، میاں طفیل محمد اور پیر پگاڑا نے لاہور میں ان سے ملاقات کرکے تر ہ کئی حکومت کو تسلیم نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن ضیاء الحق نے کمیونسٹ حکومت کو تسلیم کر لیا اور پھر تر ہ کئی کو قتل کرکے اقتدار سنبھالنے والے جنونی حفیظ اللہ امین کو بھی لیکن اب کابل کے تخت اقتدار پر کارمل براجمان تھا۔ ظاہر شاہ کے ایک جرنیل کا بیٹا جو اپنے ہم وطنوں کے اعتقادات کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا اور جو پہلی بار پنجشنبہ کے روسی ریڈیو سٹیشن سے اپنے اہل وطن سے مخاطب ہوا تھا۔

پونے دو سال ایک جرنیل اور حکمران کی حیثیت سے افغانستان کی صورتحال پر غور کرنے والے ضیاء الحق نے اختر عبدالرحمن سے اتفاق کیا اور انہیں افغانستان میں برسر پیکار حریت پسندوں کی مدد کے لئے ہر ممکن مدد فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے جنرل اختر عبدالرحمن سے کہا کہ پاکستان دو محاذوں پر پیش قدمی کرے گا۔ افغانستان کے عسکری محاذ پر، جس کے نگران وہ ہوں گے اور جسے مکمل طور پر خفیہ رکھا جائے گا جبکہ سفارتی محاذ کی ذمہ داری ضیاء الحق خود سنبھالیں گے۔

شطرنج کی بساط بچھ گئی تھی۔ رڈیارڈ کپلنگ کے عظیم کھیل کا دوسرا حصہ شروع ہونے والا تھا۔ امریکہ کے صدر جمی کارٹر نے جنہیں ان کی قوم امیدوں اور امنگوں کے ساتھ اقتدار میں لائی تھی اور جو آخری تجزیے میں ایک حکمران سے زیادہ ایک رومان پسند سیاسی دانشور ثابت ہوئے، صدر ضیاء الحق کو چند سو ملین ڈالر امداد کی پیشکش کی جن کا ملک روس کی فرنٹ لائن سٹیٹ بن چکا تھا اور جسے اب براہ راست کمیونزم

سے خطرہ درپیش تھا۔ صدر نے اس امداد کو مونگ پھلی قرار دے کر مسترد کر دیا۔ وہ ایک جنگ لڑنے جا رہے تھے اور انہیں بیساکھیوں کی نہیں کمک کی ضرورت تھی۔ انہوں نے بنگلہ دیش کے صدر ضیاءالرحمن کی مدد سے اسلام آباد میں اسلامی کانفرنس کے وزرائے خارجہ کا اجلاس بلانے کا فیصلہ کیا۔ ایک جرنیل کی طرح جو جنگ لڑنے کا فیصلہ کر چکا ہو، انہوں نے شکست خوردہ امریکی انتظامیہ کی طرف دیکھنے کی بجائے جن سے خود ان کے اہل وطن مایوس ہو رہے تھے۔ اپنے طور پر صف بندی کا فیصلہ کیا۔ اگر صدر ضیاء الحق کے اندازے درست تھے تو امریکیوں کے لئے جہاں قومی سلامتی کے نئے تصورات جنم لے رہے تھے اور کمیونسٹ روس کے مقابلے میں سخت گیر رویئے کے حامی دانشوروں اور سیاستدانوں کی تائید و حمایت میں اضافہ ہو رہا تھا، آگے بڑھ کر پاکستان کی امداد کرنے کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ وہ برسوں سے پاکستان کو اسلحی امداد مہیا کرنے سے انکار کر رہے تھے لیکن اب انہیں اس کے ایٹمی پروگرام کو حلق سے اتارنا تھا اور اس پر شرائط مسلط کرنے سے گریز کرنا تھا۔

ضیاء الحق سے نفرت کرنے والے بائیں بازو کے دانشور اور سیاسی کارکن اپنی مسرت چھپا نہیں سکتے تھے۔ جن کا فکری سرپرست پاکستان کی سرحدوں تک آ پہنچا تھا۔ ترقی پسند اخبار نویس افغان انقلاب کا خیر مقدم کر رہے تھے جو افغان دیہاتوں کے لئے آگ، بارود اور لوہے کا تحفہ لایا تھا۔ پشاور سے کراچی تک سارا ملک خوف اور اندیشوں کی حکمرانی میں تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے افغانستان کی وسعتوں میں ایک قومی بغاوت پھوٹ پڑی۔ افغان عورتیں، بچے اور بوڑھے پاکستان کے مہاجر کیمپوں اور ان کے جوان سال میدان جنگ کا رخ کر رہے تھے۔ افغان فوج سے فرار کے واقعات ہونے لگے اور جس کسی میں ایمان اور حب وطن کی ایک چنگاری بھی باقی تھی، وہ ملحدوں کے خلاف جنگ میں اپنے ہم وطنوں سے جا ملا۔ قبائل نے بغاوت کر دی اور دیہات میں

حکومت کا وجود ختم ہوگیا۔

افغانستان میں یہ بغاوت کتنے دن جاری رہے گی؟ اس بارے میں اندازے مختلف تھے۔ حریت پسندوں کے لئے یہ زندگی اور موت کا سوال تھا، فتح اور شکست کا نہیں۔ بیشتر مغربیوں کا اندازہ یہ تھا کہ مزاحمت چھ ماہ سے زیادہ عرصہ جاری نہیں رہے گی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ان کی حیرت اور امید بڑھتی چلی گئی اور وہ امداد دینے پر آمادہ ہوتے گئے۔ قومی سلامتی کے امریکی مشیر زبگینو برزنسکی کچھ دنوں میں اسلام آباد پہنچے۔ انہوں نے صدر ضیاء الحق کو بتایا کہ ان کا ملک پاکستان کی اقتصادی اور عسکری امداد کے لئے آمادہ ہے۔ انہوں نے سوال کیا کہ کیا افغانستان میں روسی ریچھ کو زخمی کیا جاسکتا ہے اور پھر امریکی حقیقت پسندی کے ساتھ سوال کیا کہ ان کی رائے میں افغان باغیوں کی مزاحمت کب تک جاری رہ سکتی ہے؟

ضیاء الحق نے گفتگو شروع کی اور جیسا کہ بعد میں برزنسکی نے امریکیوں کو واپس جا کر بتایا صدر کے اعتماد نے اسے ششدر کر کے رکھ دیا۔ ضیاء الحق نے امریکی دانشور کو بتایا کہ وہ روسیوں کو افغانستان میں مجروح کر کے الجھائے رکھنا نہیں بلکہ دریائے آمو کے پار دھکیل دینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا پاکستان کو صرف اپنے دفاع کے لئے نہیں بلکہ مجاہدین کے لئے بھی بڑے پیمانے پر اسلحہ چاہئے۔ برزنسکی نے ضیاء الحق کے حیران کر دینے والے بے پناہ عزم کا اعتراف ان کی موت کے فوراً بعد کیا۔ جب انہوں نے لندن ٹائمز کے لئے اپنے مضمون میں لکھا کہ وہ افغانستان میں روس کی عسکری اور سیاسی شکست کے واحد معمار تھے۔

برزنسکی کو مغالطہ ہوا تھا، ضیاء الحق تنہا نہیں تھے۔ بے خوف شخصیت اور ذہن رسا رکھنے والے اختر عبدالرحمن ضیاء الحق کے ساتھ تھے، جنہیں وہ زیادہ نہیں جانتے تھے۔ ایک برزنسکی ہی کیا، اختر عبدالرحمن سے تو ایک دنیا ناآشنا تھی۔

باب دوم

یتیم شہزادہ

یہ 1928ء کی بات ہے۔

جستروال کے میلے اور ملگجے ماحول میں ساڑھے چار سالہ اختر اب اکیلا تھا۔ احساس تنہائی کا شکار، رنجیدہ اور اداس، اس کے ابا اب اس دنیا میں نہیں تھے۔ اس کی آپا فاطمہ اور پشاور کے ڈھکی محلے کا کشادہ گھر، اب ان میں سے کوئی چیز یہاں نہیں تھی۔

ابھی کچھ ہی دن پہلے تک یہ سب کچھ، کچھ اور طرح سے تھا۔ وہ کالے رنگ کی گاڑی میں بیٹھ کر کنڈر گارٹن جایا کرتا تھا اور اس کے ابا جن کے سر پر کلف لگی پگڑی کا طرہ لہراتا تھا، پیار سے اسے اپنے پاس بلاتے اور اس سے باتیں کیا کرتے تھے۔ اس کا ننھا سا ذہن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ سب کچھ اس سے کیوں چھین لیا گیا ہے۔

''مجھے میرے گھر لے چلو'' وہ اپنی اماں اور آپا سے کہتا۔ وہ اس بات پر حیران تھا کہ وہ اس کی بات کیوں نہیں مانتیں۔ جب وہ زیادہ اصرار کرتا یا رونے لگتا تو اس کی اماں اسے خود سے چمٹا لیتیں اور خود بھی رونے لگتیں۔

یہ ایک اور طرح کا گھر تھا، بہت اونچا اور بہت کشادہ، جس میں کچھ اور لوگ بھی تھے۔ اس کے تایا سرور خان، اللہ داد خان اور محمد خان۔ اس گھر میں بہت سے باورچی خانے اور اینٹوں والے صحن میں بہت سے بچے کھیلتے دکھائی دیتے تھے۔ اس کی اماں نے بتایا کہ یہ سب اس کی بہن بھائی ہیں لیکن اس نے انہیں پہلے تو نہیں دیکھا تھا اس نئے گھر میں شام پڑے بجلی کے قمقمے نہیں، گیس کے ہنڈے جلائے جاتے تھے۔

اختر کی اماں اور اس کی بڑی بہن آپا سلطان جو اس کے لئے کھانا پکاتی اور اس کے

ساتھ کھیلاتی تھیں، اسے سمجھاتی تھیں کہ اب اسے اسی گھر میں رہنا ہے۔ انہوں نے اسے بتایا کہ اس کے ابا اللہ میاں کے پاس چلے گئے ہیں اور یہ ان کا دوسرا گھر ہے۔ آہستہ آہستہ، رفتہ رفتہ اختر گردوپیش میں، پرندوں، درختوں، بچوں اور بڑوں میں دلچسپی لینے لگا۔ وہ اب کچھ بدلا بدلا سا لگتا تھا، کھویا کھویا، اداس، اداس لیکن اب کبھی کبھار وہ ہمجولیوں سے کھیلنے لگتا، کبھی کبھار ہنس پڑتا لیکن لاڈلے بچے میں زندگی بھر وہ شوخی لوٹ کر نہ آسکی۔

ضلع امرتسر کی اجنالہ تحصیل میں دریائے راوی کے کنارے جستروال کی یہ جاگیر سترہویں صدی میں شاہجہاں نے ہرات سے آنے والے عادل خان کو عطا کی تھی۔ عادل خان اپنے اہل خاندان کیساتھ لاہور سے کچھ دور قصور میں آباد ہوا تھا جہاں پہلے سے پٹھانوں کے کچھ بارسوخ اور طاقتور خاندان موجود تھے۔ انہی خاندانوں سے اگلی صدیوں میں کچھ اور اولوالعزم بھی پیدا ہوئے، جنہوں نے لوح زماں پر اپنے نقوش ثبت کئے۔

عادل خان مزاجاً ایک بلند عزم سپاہی تھا۔ اس نے اپنے قبیلے کے بڑے بوڑھوں سے اس زمانے کی کہانیاں سنی تھیں جب ہندو راجوں کا اقتدار کابل تک پھیل گیا تھا اور خراسان کے نومسلم پشتون قبیلوں پر خدا کی زمین تنگ کردی گئی تھی، پھر غزنی کے ترکوں کی قیادت میں ایک طوفان نے برصغیر کو روند ڈالا۔ جہاں سے آنے والے لشکر ارگن، ہلمند اور کابل کے وادیوں میں دندناتے، پشتونوں کی فصلیں جلاتے، ان کے باغات اجاڑتے، درخت کاٹتے اور ان سے خراج وصول کیا کرتے تھے۔ ان لشکروں نے خراسان کی وادیوں اور پہاڑوں میں روشن کی گئی اسلام کی شمع گل کرنے کے لئے پشتونوں کا خون بہایا تو شمال کے اہل ایمان، ترک تاجک، ازبک اور ہزارے ان کی مدد کو اٹھے، دریائے آمو تک اور اس سے پرے ماورالنہر میں جہاں سینکڑوں ہزاروں میل کی وسعتوں میں نئے عقائد کی شمعیں پھڑپھڑا رہی تھیں

ہندوؤں پر پشتونوں کا قرض تھا جو انہیں اپنا غلام بنائے رکھنا چاہتے تھے۔ اپنا حساب چکانے کے لئے وہ غزنویوں، غوریوں اور مغلوں کے لشکروں کے ساتھ ہند کا رخ کرتے رہے۔ جہاں بت پوجے جاتے تھے اور انسان مختلف درجوں میں تقسیم کر دیئے گئے تھے۔

پندرہویں صدی کے وسط تک ہندوستان پر مغل اقتدار مستحکم ہو چکا تو خراسان اور ہمسایہ ایران سے اہل عزم کی آمد کا سلسلہ تیز تر ہو گیا جو سلطنت میں پیدا ہونے والے مواقع سے فیض یاب ہوتا اور نئی سرزمین میں اپنے ہنر کی آزمائش کرنا چاہتے تھے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں خاندان میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ عادل خان نے شاہجہان کے لشکر اور دربار تک کیسے رسوخ حاصل کیا۔ تاہم خاندان کی بڑی بوڑھیاں اب بھی اپنے پوتوں اور نواسوں کو بتاتی تھیں کہ خان دادا (عادل خان) اس چھتی ہوئی ڈیوڑھی کے نیچے سے چغتائی (مغل) دلہن کا ڈولا لے کر آئے تھے۔

چھوٹی اینٹوں کی یہ اونچی حویلی اختر اور صحن میں کھیلنے والے دوسرے بچوں کے پر دادا بدر الدین خان نے تعمیر کی تھی۔ انیسویں صدی میں سکھوں نے جو مغلوں کے زوال کے ساتھ ایک نئی قوت بن کر اٹھے اور پنجاب پر قابض ہو گئے تھے اور جن کا مرکز چند میل دور امرتسر میں تھا، جسترwal کی جاگیر کا بڑا حصہ ہتھیا لیا تھا لیکن اب بھی اس خاندان کے پاس سینکڑوں ایکڑ زرعی زمین موجود تھی جس پر گندم، گنے اور کپاس کی فصلیں اگتی تھیں گاؤں سے چند میل دور وہ پرانی بارہ دریاں اب بھی شکستہ حالت میں موجود تھیں جو عادل خان یا شاید اس کے بیٹے سلطان خان کے دور میں تعمیر کی گئی تھیں۔ بارہ دریوں کے گرد بنائی گئی سیر گاہیں زمانہ ہوا اجڑ چکی تھیں اور عمارتوں کی عشروں سے مرمت نہیں کرائی گئی تھی لیکن اب بھی گاؤں میں یہی سب سے معتبر خاندان تھا جس کی حویلیوں میں اعلیٰ نسل کے چند گھوڑے ہمیشہ موجود رہتے تھے۔

عادل خان کے بعد نسل در نسل اس کے وارث، مغل دربار سے وابستہ رہے۔ تا آنکہ مکمل شوال نے چغتائیوں کا گھر دیکھ لیا۔ مسلم برصغیر کے اخلاقی، عسکری اور سیاسی زوال نے آخر کار مغلوں کے قلعے میں دراڑ ڈال دی۔ جو ان کے اجداد کی فلک آسا بلند ہمتی نے تعمیر کیا اور جسے اب ان کی کم نظری اور سہل کوشی نے ریت کا گھروندہ بنا دیا تھا۔ عالمگیر کے بعد بہادر شاہ ظفر کی علامتی حکمرانی کے خاتمے تک 150 سال کے عرصے میں، ان گنت قبیلوں اور خاندانوں نے مسلسل کمزور ہوتی ہوئی مرکزی حکومت کا ساتھ چھوڑ دیا، ان میں پشتون قبائل بھی شامل تھے لیکن عادل خان کی اولاد آخری وقت تک ان کے ساتھ رہی، جن کی رگوں میں اب مغل ننھیال کا خون بھی تھا۔ بارہا ایسے مشکل مرحلے آئے جب مغلوں کا ساتھ نبھانے میں خسارے کے سوا کچھ نہ تھا۔ پنجاب پر ان کا کنٹرول باقی نہ رہا تھا لیکن ان کا استدلال یہ تھا مغل دربار برصغیر میں مسلم اقتدار کی علامت ہے، لہذا اس سے وفاداری اسلام سے وفاداری کی طرح ہے۔

1857ء کی جنگ آزادی چھڑی تو بوڑھے بہادر شاہ ظفر سے جستروال کا کوئی رابطہ نہ تھا لیکن ایک صبح بدرالدین اپنی حویلی سے نکلے اور میدان جنگ کی طرف روانہ ہو گئے۔ انہیں اپنے پسندیدہ گھوڑے کلیا پر سوار ہو کر جاگیر سے نکلتے دیکھا گیا۔ گاؤں سے باہر کٹی گندم کے ڈھیروں کے درمیان، بوڑھے بدرالدین اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور ان کی آواز گونجی ''چل اوئے کلیا پار'' معلوم نہیں ان کے ساتھ راوی پار کا رخ کرنے والے شہسواروں کی تعداد کیا تھی اور وہ کہاں، کس معرکے میں کام آئے لیکن پھر ''کلیا'' اور اس کا سوار لوٹ کر گھر نہیں آئے۔ جسترwal کی باقی ماندہ جاگیر کا سردار اب بدرالدین خان کا بیٹا بلند خان تھا۔ جسے اب اس خاندان کو طوفانوں سے بچانا تھا جو وہ اڑھائی سو سال سے زمانے کے بدلتے تیوروں کا سامنا کرتا آیا تھا۔ صرف تین سال پہلے پنجاب بھر میں سکھ اقتدار کا خاتمہ ہوا تھا اس کڑے

زمانے میں بھی جاول خان کے خاندان نے اپنے آپ کو بچائے رکھا تھا، اگرچہ اس کی قوت کمزور پڑ گئی تھی، زمینیں محدود ہو گئی تھیں اور حالات کا رخ بدل گیا تھا۔

1857ء کے بعد پنجاب میں انگریزی اقتدار مستحکم ہوا تو رفتہ رفتہ مسلمانوں کے لئے محدود مواقع میں کسی قدر وسعت پیدا ہونے لگی۔ شہروں میں انگریزی طرز کے سکول کھلنے لگے اور اگرچہ سکھوں اور ہندوؤں کے برعکس جن میں سے اول الذکر اقتدار چھن جانے پر آزردہ تھے اور ثانی الذکر بتدریج معاشی زندگی پر اجارہ داری حاصل کر چکے تھے، یہ مواقع اب بھی کمتر تھے۔

بلند خان کے ہاں چار بیٹے پیدا ہوئے۔ 1865ء میں اس کے سب سے چھوٹے بیٹے عبدالرحمٰن نے جنم لیا۔ سلیقہ مند بلند خان نے ان سب کو دینی تعلیم کے علاوہ جس کا خاندان میں ہمیشہ اہتمام کیا جاتا تھا، انگریزی سکولوں میں بھی تعلیم دلائی۔ اس کا خاندان صدیوں سے سپہ گری سے وابستہ تھا لیکن اب باوقار زندگی کے لئے اعلیٰ تعلیم ہی واحد راستہ تھا۔ بلند خان کے بیٹوں میں سے کوئی دوسرا تو تعلیم سے غیر معمولی شغف پیدا نہ کر سکا لیکن عبدالرحمٰن نے جس کی روح میں اپنے جدامجد کی بلند ہمتی کے ساتھ ساتھ مستقل مزاجی اور احتیاط کے جوہر کارفرما تھے، یہ قلعہ سر کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس نے 1888ء میں امرتسر سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور لاہور چلا آیا جہاں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج قائم ہوئے ابھی چند ہی برس گزرے تھے انٹرمیڈیٹ کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کرنے کے بعد اس نے 1890ء میں اس کالج میں داخلہ لے لیا۔ خاندان کے بڑے بوڑھوں کی طرف سے اس کی مخالفت کی گئی "عبدالرحمٰن! تم طبیب بنو گے؟" وہ کہتے تمہارے خاندان میں کبھی ایسا نہیں ہوا لیکن عبدالرحمٰن اپنے ارادے کا پکا اور دور اندیش تھا۔ وہ ان زمینوں میں اپنی زندگی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا جو کنوؤں سے سینچی جاتی تھیں اور جن میں پانی کا انحصار موسم کی

مہربانی پر تھا۔

اس نے اپنے اہل خاندان کو بتایا کہ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں دوسروں سے زیادہ نمبر حاصل کرنے کی وجہ سے اسے کنگ ایڈورڈ کالج میں ایم بی بی ایس کی تعلیم کے 5 سالوں کے دوران سات روپے ماہوار وظیفہ ملے گا۔ کفایت شعار اور سخت جان عبدالرحمن ان سات روپوں میں سے بھی تین روپے اپنے گھر بھیج دیتا اور چار روپے ماہوار میں گزر بسر کرتا مستقبل کے سہانے خوابوں کے سہارے زندگی بسر کرنے کے باوجود اس کا گھر بہن بھائیوں اور ماں باپ سے ملاقات کے لئے بے قرار ہو جاتا تو وہ اتوار کو صبح سویرے جستروال کی طرف روانہ ہو جاتا۔ کئی گھنٹے پیدل چل کر وہ اس گھر میں پہنچتا جہاں کبھی اس کے اجداد حکمرانوں کی زندگی گزارتے تھے اور ان کے اصطبلوں میں سینکڑوں گھوڑے پالے جاتے تھے۔

1895ء کا سال عبدالرحمن کے لئے کامرانی کا سال تھا اس نے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کر لی تھی اور اب وہ ایک شہسوار کی طرح آمادہ سفر تھا۔ پشاور میں جہاں ڈبلری کے ہسپتال میں ہیلتھ افسر کے طور پر اس کی پہلی تقرری عمل میں آئی، اگلے 92 سال اس کے لئے ایک کے بعد دوسری کامیابی لے کر آتے رہے۔ محنتی اور منصوبہ ساز آدمی نے فارغ اوقات کیلئے ایک کلینک کھول لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی شہرت دور دور تک پھیلنے لگی۔ اونچی کلف لگی پگڑی، لمبے شلوار کرتے، گورے چٹے رنگ اور متین چہرے کے ساتھ وہ ایک باوقار آدمی دکھائی دیتا تھا۔ وہ تول تول کر بولنے اور سوچ سمجھ کر حرکت کرنے والا آدمی تھا۔ اپنے مریضوں کے ساتھ وہ شفقت سے پیش آتا اور گردو پیش کے دیہات سے علاج کے لئے آنے والے گھبرائے ہوئے لوگوں کو تسلی و تشفی دیتا۔

اس شہر میں اس نے بڑی نیک نامی اور بہت روپیہ کمایا۔ خاندان کی چھنی ہوئی امارت اور دبدبے کی خلش ہمیشہ اس کے دل میں رہی۔ اسے ہمیشہ یہ احساس رہا کہ

وہ ایک معزز خاندان کا فرد ہے۔ اب اس کی شہرت شہر سے نکل کر دور دراز کے قصبات اور پھر وہاں سے افغانستان کے دارالحکومت کابل تک جا پہنچی تھی، جہاں امان اللہ خان 1919ء کی دوسری افغان جنگ جیت کر ایک ہیرو کی طرح سریر آرائے سلطنت تھا۔

ایک روز ڈاکٹر عبدالرحمن کو امان اللہ خان کا پیغام ملا کہ وہ اس مشہور معالج سے ملاقات کے خواہش مند ہیں۔ جدید تعلیم کا دلدادہ اور نئے رجحانات کا افغان بادشاہ کابل کے بوڑھے طبیبوں کی بجائے پشاور کے ڈاکٹر سے علاج کرانے کا آرزومند تھا۔ اپنی سیاہ گاڑی میں طورخم کے راستے دن بھر کا طویل سفر طے کر کے ڈاکٹر عبدالرحمن کابل پہنچے اور انہیں بادشاہ کے محل میں لے جایا گیا۔

جب وہ چند دن کے بعد لوٹ کر آئے تو ان کی گاڑی خشک میوؤں سے بھری تھی اور انہوں نے اپنے اہل خاندان کو بتایا کہ اب وہ گاہے بہ گاہے بادشاہ سے ملنے کابل جایا کریں گے۔ امان اللہ خان کو شائستہ اور خوش اطوار آدمی پسند آیا تھا جو غیر ضروری گفتگو سے گریز کرتا تھا اور جس کا ہر مشورہ قابل عمل محسوس ہوتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے محتاط آدمی نے ڈبگری میں ایک باغ خریدا اس کا بچپن آزاد فضا میں گزرا تھا۔ اس کے اندر کا دہقان ابھی زندہ تھا۔ وہ پرندوں اور درختوں کے ساتھ ایک خاص مسرت محسوس کرتا تھا اپنی عمر بھر کی کمائی سے اس نے 40 دکانوں پر مشتمل ایک مارکیٹ تعمیر کی۔ اپنی کمائی سے وہ آسودہ اور مطمئن تھا۔ حالات نے جو کچھ اس کے خاندان سے چھین لیا تھا وہ سب کچھ اس نے اپنی محنت سے دوبارہ حاصل کر لیا تھا۔ عزت و توقیر، جائیداد، شہرت اثر و رسوخ ڈاکٹر عبدالرحمن کے گھر میں اب کیا نہیں تھا۔

لیکن آدمی ہمیشہ کے لئے اس دنیا میں کیسے آسودہ رہ سکتا ہے جسے خدا نے تنوع، کشمکش اور آزمائش میں پیدا کیا ہے۔ ایک روز ڈاکٹر عبدالرحمن کی بیوی اسے داغ

مفارقت دے گئی اور اسے اپنا گھر اجڑا ہوا محسوس ہونے لگا۔ جستروال سے سینکڑوں میل دور پشاور میں یہ اس کا خاندان ہی تو تھا جس سے وہ اپنی شناخت کی تکمیل کرتا تھا۔

خاموش طبع آدمی کو چپ سی لگ گئی تھی اور وہ کھویا کھویا دکھائی دیتا تھا۔ دوستوں، رشتہ داروں اور جاننے والوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ دوسری شادی کر لے وہ ایک صحت مند آدمی تھا اور ابھی 50 سال کا بھی نہیں ہوا تھا لیکن وہ دوسری شادی کیسے کر لے اس کی اولاد لاڈ پیار اور شفقت کی فضا میں پلی تھی اس کا بڑا بیٹا فضل خان جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکا تھا کون جانتا ہے کہ ڈگری کی حویلی میں آنے والی نئی دلہن اپنی سوتیلی اولاد کے ساتھ کیا سلوک کرے گی؟

کئی سال گذر گئے اور ڈاکٹر عبدالرحمن کی تنہائی گہری ہوتی چلی گئی ان کا بیٹا اب قانون کی تعلیم کے لیے علی گڑھ جانے والا تھا اور بڑی بیٹیاں شادی کی عمر کو پہنچ گئی تھیں۔ کسی نے ڈاکٹر کو ایک معزز لیکن کم آسودہ گکھڑ زئی خاندان کی ہاجرہ بیگم سے شادی کر لینے کا مشورہ دیا اور اسے سمجھایا کہ سوتیلا پن کوئی لازمی بیماری نہیں ہے۔ تنہا آدمی نے سارے معاملے پر احتیاط سے غور کیا اور آخر کار اس مشورے پر عمل کرنے کو تیار ہو گیا۔

آخر کار ہاجرہ ڈگری کی حویلی میں دلہن بن کر آ گئی۔ تھوڑے ہی دنوں میں عبدالرحمن نے جو برصغیر میں ایم بی بی ایس کی ڈگری پانے والے اولین ڈاکٹروں میں سے ایک تھا یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ محض قرآن مجید پڑھی ہوئی یہ خاتون کیسی خوش سلیقہ اور سگھڑ واقع ہوئی ہے۔ ہاجرہ بیگم نے تیزی کے ساتھ اپنے آپ کو نئے حالات کے سانچے میں ڈھال لیا۔ اس نے بس اتنی تعلیم پائی تھی کہ وہ اخبار اور کتاب پڑھ سکتی تھی لیکن اسے خط لکھنے کے لیے اپنے سوتیلے بیٹے کی مدد درکار ہوتی تھی۔ جہاندیدہ آدمی کو اس بات سے بڑی مسرت ہوئی کہ ہاجرہ نے جس کی ہاں

اب ایک بیٹی پیدا ہو چکی تھی اس کی پہلی اولاد سے اجنبیت کا برتاؤ نہیں کیا۔

کچھ دنوں کے بعد اس نے اپنی نئی دلہن کے ساتھ جستروال کا رخ کیا جہاں اس کے والد بلند خان کا انتقال ہو چکا تھا لیکن اس کے بہن بھائی وہاں موجود تھے اور اس نے ان سے ہمیشہ رابطہ استوار رکھا تھا ڈاکٹر عبدالرحمن کو اس بات سے بڑی تسکین ہوئی کہ اس کے اہل خاندان نے ہاجرہ بیگم کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا، وہ ایک گھل مل جانے والی خاتون تھی، وہ نرمی اور احتیاط کے ساتھ بات کرتی تھی اور لوگ جلد ہی اس کی عزت کرنے لگتے تھے۔

گیارہ جون 1924ء کو ڈنگری ہسپتال کے آفیسر وارڈ میں ہاجرہ بیگم کے ہاں ایک بیٹے نے جنم لیا۔ خاندان میں ایک عرصے کے بعد جنم لینے والے بچے کی پیدائش کا جشن منایا گیا۔ بڑی بیٹی سلطان کے بعد ہاجرہ بیگم کے ہاں پیدا ہونے والے اوپر تلے کئی بچے کم سنی میں انتقال کر گئے تھے، تاہم انگریز لیڈی ڈاکٹر مس ہیٹی نے جب ڈاکٹر عبدالرحمن کو دن کے دو بجے بیٹے کی پیدائش کی اطلاع دی تو انہیں یہ بھی بتایا کہ نومولود کی صحت بہت اچھی ہے۔

بچے کا نام اختر رکھا گیا خاندان کی روایت کے مطابق اس کے لئے ایک آیا کا انتخاب کیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالرحمن اب 59 سال کے ہو چکے تھے اس عمر میں بیٹے کی پیدائش پر وہ بے حد خوش تھے۔ وہ بچے کی صحت کے لئے متفکر رہتے اور ذرا سی گڑبڑ پر اپنے ساتھیوں سے صلاح مشورہ کرتے۔ ان میں ڈنگری ہسپتال میں کام کرنے والی انگریز لیڈی ڈاکٹرز شامل تھیں۔

اختر شروع ہی سے ایک مختلف بچہ تھا۔ شاید اس کی انفرادیت کا ایک سبب وہ غیر معمولی توجہ بھی تھی جو اسے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے حاصل رہی وہ اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا اور بہنوں کا تنہا بھائی تھا چونکہ ہاجرہ بیگم کے دو بیٹے حمید اللہ اور محمد افضل کم سنی میں انتقال کر چکے تھے، لہٰذا اس کے لئے صفائی کا بڑا اہتمام کیا جاتا اور اس کی

صحت کا خاص طور سے خیال رکھا جاتا اگر اسے چھینک بھی آ جاتی یا ذرا سی حرارت ہو جاتی تو گھر میں سراسیمگی پھیل جاتی، فاطمہ، اختر کی افغان آیا کو سختی سے ہدایات پر عمل کرنے کو کہا گیا تھا اسے یہ احساس دلانے کی کوشش کی گئی کہ وہ ایک بہت اہم ذمہ داری نبھا رہی ہے۔ اس نیک دل عورت نے جو بچے کے کمرے میں پشتو کی لوریاں گاتی سنائی دیتی تھی، اپنے اس کردار کو خوشدلی سے قبول کر لیا۔ وہ ان نادر و نایاب عورتوں میں سے ایک تھی جو ہر بچے کے لئے ممتا کا جذبہ محسوس کرتی ہیں اور جو فرائض کی بہتر انجام دہی پر مسرت کے انعام سے بہرہ ور کی جاتی ہیں۔ اس خاتون نے لمبی عمر پائی جب قیام پاکستان کے بعد اس نے اختر کو پشاور میں دیکھا جہاں وہ اپنے بچپن کی یادیں تازہ کرنے کے لئے گیا تھا تو اس نے نوجوان لڑکے کو چوما اور وفور جذبات سے اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

لاڈلے بچے پر سختی نہیں کی جا سکتی تھی لیکن بچوں کی تربیت کو اہمیت دینے والے والدین اسے بگاڑنے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتے تھے، لہذا رفتہ رفتہ ان کے درمیان ایک عجیب تعلق ابھر آیا وہ اسے ہر بات تفصیل سے سمجھاتے اور ہمیشہ کہتے کہ ایک اچھے بچے کو کوئی بری حرکت نہیں کرنی چاہئے۔ بہت سی آنکھیں اس بچے پر نگراں تھیں۔ رفتہ رفتہ اس کے اندر یہ احساس پروان چڑھنے لگا کہ اسے ہر نازیبا چیز سے گریز کرنا چاہئے۔

ساڑھے تین سال کی عمر میں اسے ایک انگریزی سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ بچے کو صبح سویرے اہتمام کے ساتھ سکول جانے کے لئے تیار کیا جاتا۔ اس کے لباس کا خیال رکھا جاتا۔ ایک ڈبے میں کھانے پینے کی کچھ چیزیں ساتھ رکھی جاتیں اور ایک ملازم اسے گاڑی میں بٹھا کر کلاس روم تک چھوڑنے جاتا۔

اختر کی عمر اس وقت چار سال تھی جب اس کے جواں سال سوتیلے بھائی فضل خان کی موت کا سانحہ پیش آیا اور ڈاکٹر عبدالرحمن کی کمر ٹوٹ گئی۔ فضل خان نے علی گڑھ

یونیورسٹی سے قانون کی تعلیم حاصل کی تھی اور ابھی چند ہی ماہ پہلے اسے شہر میں پریکٹس کا آغاز کیا تھا، جہاں بہت سے لوگ اس کے باپ کو جانتے اور اس کے خاندان کی عزت کرتے تھے۔ یہ سرما کے دن تھے جب اسے ایک مقدمے کے سلسلے میں چند میل دور نوشہرہ جانا پڑا۔ فضل خان ایڈووکیٹ اپنے گھر سے نکلا تو مطلع صاف تھا لیکن جب وہ نوشہرہ پہنچا تو اسے بارش نے آلیا۔ سرد ہوا چلنے لگی اور ٹھنڈ میں اضافہ ہو گیا لیکن نوجوان وکیل نے اس کی زیادہ پرواہ نہیں کی۔ وہ گھر پہنچا تو بخار میں مبتلا تھا۔ اس کا علاج کیا گیا لیکن بخار بگڑ گیا تب اسے ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔ وہ دوہرے نمونیہ میں مبتلا تھا۔ ڈگری کے ہسپتال میں ڈاکٹروں نے اپنے بزرگ ساتھی کے فرزند کو بچانے کی سرتوڑ کوششیں کیں لیکن سناؤنی آ گئی تھی۔

بیٹے کی سانس ٹوٹی تو باپ کا دل بھی مرجھا گیا اس کے کئی کم سن بچے موت کی گود میں چلے گئے تھے۔ لیکن تناور بیٹے کی موت نے اس کا دل توڑ ڈالا، جسے اب اس کے بڑھاپے میں رفتہ رفتہ گھر کا نظام سنبھالنا تھا۔ ڈاکٹر عبدالرحمن کے چہرے پر اب پہلی سی تازگی کی جگہ افسردگی نے لے لی۔ وہ ضرورت ہی کے وقت بات کرتے، بیٹھے بیٹھے کھو سے جاتے اور خلا میں گھورنے لگتے۔ کمرے کی تنہائی میں ان کی آنکھیں بھر آتیں اور وہ حیرت و حسرت کے ساتھ سوچتے کہ کیا یہی وہ زندگی ہے جس کے لئے وہ عمر بھر بھاگ دوڑ کرتے رہے تھے۔ ان کی جواں سالہ اہلیہ انہیں تسلی دینے کی کوشش کرتیں لیکن کوئی چیز ان کی بے قراری کم نہ کر سکی تا آنکہ جدائی کا دن آ پہنچا۔ بیٹے کی موت کو چھ ماہ گزرے تھے کہ ڈاکٹر عبدالرحمن کو دل کا دورہ پڑا اور وہ آناً فاناً دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ایک بھرپور زندگی چپ چاپ موت کی آغوش میں چلی گئی۔ جو ازل سے آدمی کے تعاقب میں ہے، جو بے بسی کا احساس جگانے، دہشت زدہ اور تنہا کرنے کے لئے آتی ہے اور جو یاد دلاتی ہے کہ اس دنیا میں کسی کو دائمی طور پر نہیں رہنا، سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے اور اسی کی طرف لوٹ جانا ہے۔

ڈاکٹر کے جنازے پر سارا شہر امڈ پڑا، ہزار ہا آنکھوں سے اشک بہے اور ان گنت پرسا دینے والے آئے لیکن پھر صحن میں ایسا سناٹا طاری ہوا کہ ہاجرہ بیگم ڈر گئیں کہ اب اس اجاڑ گھر میں وہ کیسے رہیں وہ پلٹ کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھتیں اور جیسے کوئی ان کا دل مٹھی میں جکڑ لیتا۔ ساڑھے چار سال کا ننھا اختر باپ کی موت پر تڑپ تڑپ کر رویا اور رو رو کر چیختا تھا۔ جنازہ اٹھایا جانے لگا تو وہ ابا کے قدموں سے لپٹ گیا۔ میرے ابا کو مت لے جاؤ اس نے روتے ہوئے اصرار کیا۔

ڈبگری کا باغ گھر اور 40 دکانوں کی مارکیٹ کل تک جو وجہ افتخار تھا، اب بوجھ دکھائی دینے لگا، بیٹا مر گیا، حلیم الطبع اور سرفراز شوہر خدا کے پاس چلا گیا اس کی (پہلی بیوی سے) جوان بیٹیاں گھروں کو سدھاریں، اب ہاجرہ گھر میں اکیلی تھیں، دو کمسن بیٹیاں ایک بیٹا اور پہاڑ سی جوانی۔

رائج الوقت قانون کے مطابق حکومت نے جائیداد کو اپنی تحویل میں لے لیا کہ نگہبانی کے لئے کوئی مرد موجود نہ تھا۔ ہاجرہ بیگم کے رشتہ کے ایک بھائی کو گارڈین مقرر کر دیا گیا اور خاندان کے لئے گزارہ الاؤنس کا تعین ہو گیا۔ ہاجرہ کے لئے اب پشاور میں کیا رکھا تھا۔ انہوں نے بچوں کو سینے سے لگایا، سامان سمیٹا اور شوہر کی یاد دل میں بسائے جستروال چلی گئیں۔ ضلع امرتسر کی تحصیل اجنالہ میں، دریائے راوی سے پانچ میل ادھر، اس حویلی میں جو ڈاکٹر عبدالرحمن کے دادا بلند خان نے تعمیر کی تھی اور جس میں آج بھی ان کی اولاد گئے دنوں کی حسرت مگر حکمران تیوروں کے ساتھ آباد تھی۔

چھوٹی اینٹوں کی بلند و بالا حویلی چار گھروں میں منقسم تھی ان گھروں میں سرور خان، کریم داد خان، عنایت اللہ خان، سعد اللہ خان اور بلند خان کی دوسری اولاد مقیم تھی۔ درمیان میں ایک بڑا صحن اور ایک قطار میں چار باورچی خانے، ہر خاندان کے پاس دو بڑے کمرے تھے۔ اناج ذخیرہ کرنے کے لئے چھتوں پر مٹی کے

چھوٹے کمرے الگ سے بنائے گئے تھے۔ رہائشی کمروں میں کپڑے کی جھالروں والے سنقش پردے لگے تھے۔ گھروں میں کم عمر ملازم لڑکیاں مختلف خدمات انجام دیتیں، نگرانی کے لئے بڑی عمر کی خواتین بھی رکھی جاتیں لیکن کوئی مرد ملازم نہ تھا کہ اس زمانے کے شریف مسلمان گھرانوں میں اس کا تصور تک نہ تھا۔

حویلی میں نرم گفتار اور سلیقہ مند بہو کا خیر مقدم ہمدردی اور محبت سے کیا گیا اور اس کے لئے دو کمرے خالی کر دیئے گئے۔ تھوڑے ہی دنوں میں ہاجرہ بیگم کو اندازہ ہونے لگا شوہر کے بغیر رشتہ داروں میں زندگی بسر کرنے کے لئے کس صبر اور احتیاط کی ضرورت ہے۔ وہ مضبوط اعصاب کی ایک سلیقہ مند اور محتاط خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنے کان اور آنکھیں کھلی رکھیں اور زبان کو دل کی طرح سنبھال لیا۔ بے تکے مشوروں اور غیر ضروری تبصروں کے درمیان انہوں نے اپنی ساری توجہ اولاد پر مرکوز کر دی۔ جیسے کوئی پرندہ آفت کے اندیشے سے اپنے بچوں کو پروں تلے سمیٹ لیتا ہے۔

پشاور کے برعکس جہاں دربان ان کے دروازے پر کھڑے تھے، جستروال کے ابتدائی دن بہت تکلیف دہ تھے۔ اونچے چھتوں والی حویلی میں شام اترتی تو ہاجرہ بی بی کا دل ڈوبنے لگتا۔ وہ اپنے بچوں کو سمیٹ کر بیٹھ جاتیں اور گزری ہوئی آسودہ، آسان اور مہربان زندگی کی یادچاروں اور محیط ہو جاتی۔ کبھی کبھی تو حسرت اور محرومی کے احساس کی شدت اور اندیشوں کے خوف سے آنسو ضبط کرنے کی کوشش ناکام ہو جاتی اور وہ بے اختیار رو پڑتیں۔ بے بس ماں کو اشکبار پا کر بچے بھی رونے لگتے اور گھر کے در و دیوار سسکیوں سے گونج اٹھتے بے بسی کی انہی راتوں میں پاک باز اور پرعزم ہاجرہ نے ایک خواب دیکھا۔

جیسا کہ وہ بعد میں بتایا کرتی تھیں انہوں نے خود سے سوال کیا کہ نجات کا راستہ کہاں ہے؟ اس سوال پر دنوں اور ہفتوں کے غور و فکر کے بعد انہوں نے دو نہایت

اہم فیصلے کیے جس نے ان کی آئندہ زندگی اور ان کی اولاد کو ثمر بار کر دیا۔ وہ ہمیشہ سے مذہبی واقع ہوئی تھیں لیکن اب انہوں نے اپنے خدا سے گہرا تعلق استوار کر لیا کہ اس کے سوا ان کا کوئی حقیقی سہارا نہ تھا اس احساس نے کہ ان پر کتنی گہری ذمہ داری آپڑی ہے جواں سال خاتون کو قبلہ رو کر دیا۔ وہ تہجد کے وقت اٹھ بیٹھتیں اور خدا سے مدد کی طالب ہوتیں جو نماز اور صبر سے مدد مانگنے والوں کو استقامت اور عظمت عطا کرتا ہے۔ دنوں اور ہفتوں میں گرد و پیش نے ایک گھریلو خاتون کو یکسر بدلتے اور ایک نئی شخصیت میں ڈھلتے دیکھا۔ ثانیاً انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کریں گی۔ اپنے کامران شوہر کی محبت میں ان پر یہ راز آشکار ہو چکا تھا کہ تعلیم ہی عظمت، کامیابی اور عزت کی شاہ کلید ہے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو اعلی تعلیم دلانے اور اس کے لئے ہر مشکل کا سامنا کرنے کا فیصلہ کیا۔

معلوم نہیں ایک سخت تربیت کا تصور انہیں صرف اپنے ماں باپ سے ملا تھا یا اس میں ان کے شوہر کا دخل بھی تھا۔ دیکھا گیا کہ وہ اپنے بیٹے کی اس سختی اور اہتمام سے تربیت کر رہی ہیں جیسے اس یتیم شہزادے کی، جسے وقت آنے پر ایک سلطنت سنبھالنی ہو۔

پشاور میں اختر ایک انگریزی سکول میں پڑھتا تھا اور اس کی رسم بسم اللہ اس اہتمام سے ہوئی تھی کہ خاکسار تحریک کے بانی علامہ عنایت اللہ خان المشرقی خاص طور پر اپنے دوست کے گھر آئے تھے۔

جستروال کے گاؤں میں تعلیم کا کوئی خصوصی انتظام کیونکر ممکن ہوتا۔ ہاجرہ بی بی نے اپنے رشتے کے بھائی ماسٹر عبدالرحیم سے جو قصبے کے سرکاری پرائمری سکول میں مدرس تھے اس بارے میں مشورہ کیا۔ لاولد عبدالرحیم خان کو ننھے اختر سے بہت دلچسپی تھی اور وہ اکثر اسے دیکھنے آیا کرتے تھے بھلا اس میں کیا مشکل ہے؟ عبدالرحیم نے کہا "اختر کو دوسرے بچوں کے ساتھ سرکاری سکول میں پڑھنا چاہئے" اور وہ اگلے

روز اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ اختر نے ٹاٹ پر بیٹھے آموختہ دہراتے بچوں کو حیرت سے دیکھا اور کلاس روم میں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا وہ کرسی پر بیٹھ کر پڑھے گا اور اس کے سامنے ایک ڈیسک ہونی چاہئے جیسا کہ پشاور والے سکول میں تھا۔

اختر کی ماں اور عبدالرحیم خان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی ضد پر اڑا رہا کہ وہ پڑھے گا تو کرسی پر بیٹھ کر ورنہ سکول ہی نہیں جائے گا۔ وہ پانچ سال کا ہونے کو آیا تھا اور اب وقت ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا پھر اس مسئلے کا کیا حل تلاش کیا جائے۔ اسے ٹاٹ پر بیٹھ کر پڑھنے کو کہا جاتا تو وہ رونے لگتا۔ "میری نیکر گندی ہو جائے گی" وہ کہتا "میرے کپڑوں کو مٹی لگ جائے گی" عبدالرحیم خان ہیڈ ماسٹر کے پاس گئے اور ان سے اپنے یتیم بھانجے کا مسئلہ بیان کیا۔ انہوں نے درخواست کی کہ ضدی بچے کے لئے کمرے میں میز کرسی رکھنے کی اجازت دی جائے۔

عبدالرحیم ایک سکول ماسٹر تھے لیکن آخر وہ جستروال کے معزز پٹھان خاندان کے فرزند بھی تھے، وہ آئے روز درخواست کرنے والے آدمی نہیں تھے اور پھر یہ ایک یتیم بچے کا مسئلہ تھا۔ ہیڈ ماسٹر نے ان کی بات مان لی۔ اگلے روز کمرے میں ایک ننھی سی کرسی اور میز سجا دی گئی۔ یتیم شہزادے کی تعلیم کا آغاز ہو گیا۔ یہ 1929ء کا موسم خزاں تھا جستروال میں شیشم کے درختوں پر پتے پیلے ہونے لگے تھے۔ اختر سکول سے لوٹتا تو ماں کو منتظر پاتا۔ گھر میں اس کی پسند کا کھانا پکایا جاتا۔ اس سے کرید کرید کر پوچھا جاتا کہ مدرسے میں اس کا دن کیسے گزرا۔ اسے یاد دلایا جاتا کہ اسے گالیاں بکنے اور سبق یاد نہ کرنے والے بچوں سے دور رہنا چاہئے۔ اختر اپنی ماں کے سوالوں کا جواب دیتا لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ طویل گفتگو سے گریز کرتا۔ وہ کہانیاں نہیں سناتا تھا اور اتنی ہی بات کہتا، جس قدر ضروری ہوتی۔ اس میں یہ احتیاط کہاں سے آ گئی تھی؟ ہاجرہ بی بی کی تسلی نہ ہوتی۔ ماسٹر عبدالرحیم خان ملنے آتے تو وہ ان سے

پوچھتیں۔ وہ اپنی بیوہ بہن کو اطمینان دلانے کی کوشش کرتے، جس نے مستقبل کی ساری امیدیں کمسن بیٹے سے وابستہ کر لی تھیں۔ لیکن ایسا لگتا کہ وہ مطمئن نہیں ہو پا رہیں۔ ایک بار جب وہ بار بار یہ سوال دہرا رہی تھیں کہ کیا واقعی اختر کا دل سکول میں لگ گیا ہے؟ انہوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا میرے کہنے سے تو آپ کی تسلی ہو گی نہیں، کچھ دن اور ٹھہر جائیں، امتحان کا نتیجہ نکلے گا تو آپ کو اپنے سوال کا جواب مل جائے گا۔

ماں کے دل کو قرار کہاں تھا۔ بچے کو گھر میں آموختہ یاد کرانے والا کوئی نہ تھا اور بھائی سے اس کی درخواست کرنا معیوب لگتا تھا آخر وہ اپنی بہن سے معاوضہ کیسے وصول کر سکتے تھے اور معاوضہ ادا کیے بغیر ایک ذمہ داری سونپنا روا نہ تھا۔ آخر کار ایک اور استاد کا انتخاب کیا گیا، جو ہر روز گھر آ کر پڑھایا کرتا۔ ننھے اختر کو اپنا یہ استاد عمر بھر یاد رہا۔ یہ درست ہے کہ اسے معاوضہ ادا کیا جاتا تھا لیکن وہ جس انہماک اور محبت سے تعلیم دیتا اور جس شفقت سے پیش آتا تھا، اس کا معاوضہ کون ادا کر سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ اختر پڑھائی میں چمکنے لگا۔ چند ماہ بعد سکول میں امتحانات منعقد ہوئے اور پہلی جماعت کا نتیجہ نکلا تو معلوم ہوا کہ اختر اپنی کلاس میں اول رہا ہے، ہاجرہ بی بی فرط مسرت سے بہنے والے آنسو پونچھتی اور مٹھائی بانٹتی رہیں، پودے پر پہلی کونپل پھوٹ آئی تھی۔ باہر گندم کے کھلیانوں میں سونے کے ڈھیر پڑے تھے، راوی کے کنارے مہربان ہوائیں بہہ رہی تھیں، جس روال میں یہ بہار کا موسم تھا۔

اب اختر کی پڑھائی میں اور بھی اہتمام کیا جانے لگا۔ ماسٹر جی سے کہا گیا کہ وہ کچھ زیادہ وقت دیا کریں، چنانچہ وہ سہ پہر کے وقت آتے اور شام تک پڑھایا کرتے۔ پڑھائی کا یہ سلسلہ چھٹی کے دنوں میں بھی جاری رہتا اور کبھی کبھی تو شام چھا جانے کے بعد بھی جب حویلی گیس کی روشنی سے منور ہوتی۔ گرما کی شاموں اور چاندنی راتوں میں جب اختر کے ہم عمر "لکن میٹی" کھیلنے کی تیاریاں کر رہے ہوتے،

وہ کتاب سے جڑا ہوتا۔ پنجاب کے سب دیہات کی طرح جب شام پڑے بچے ایک سرخوشی اور بے تابی کے ساتھ ہم جولیوں کو جمع کرنے لگتے تو کبھی کبھار ان کی ایک ٹولی اختر کے گھر کے سامنے روایتی انداز میں گائے جانے والے بول دہراتی۔

ٹھیکری وے ٹھیکری، ٹھیکری ساڈے کول
سارے بچے کھیڈ دے، اختر ماں دے کول

یہ گویا ایک طعنہ تھا کہ ارے میاں یہ کھیل کود کا وقت ہے اور تو ماں کے پاس گھسا بیٹھا ہے۔ ماں کی خوشنودی کا طالب کمسن بچہ ضبط کیے بیٹھا رہتا لیکن ہمیشہ نہیں، کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ اس کا جی گھر سے بھاگ نکلنے اور آنکھ مچولی کھیلنے کے لئے بے قرار ہو جاتا، لیکن اماں کھیل کے مقررہ وقت کے سوا کبھی اس کی اجازت نہیں دیتی تھیں اور باہر ہمجولی شور مچا رہے ہوتے۔ ''اختر ماں دے کول'' اختر بے قرار ہو کر رہ پڑتا۔ کوئی دوسری ماں ہوتی تو اس کا دل پگھل جاتا لیکن ہاجرہ بی بی نے جیسے دل پر پتھر رکھ لیا تھا۔ معلوم نہیں کس نے ان کے کان میں راز کی بات کہہ دی تھی کہ دور کی منزل کے مسافر کو کبھی پلٹ کر نہیں دیکھنا چاہئے اور کامیابی ان کے لئے ہے، جو ہدف پر نگاہ رکھتے ہیں۔ وہ بچے کے ہاتھوں سے کتاب لے لیتیں اور اسے کوئی اچھا سا شعر سناتیں یا کوئی حکایت۔ اکثر ایک شعر پڑھتیں اور اپنی سادہ زبان میں اختر کو اس کا مطلب سمجھانے کی کوشش کرتیں۔

تندیٔ باد مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے

اختر کے لئے اس کا زمانہ طالب علمی دوسروں سے مختلف تھا۔ اسے یہ باور کرایا جاتا تھا کہ وہ دوسرے بچوں کی طرح نہیں۔ اسے گالی دینے، شرارت کرنے اور وقت ضائع کرنے سے گریز کرنا چاہئے۔ اپنی ماں کی آنکھوں کے سائے تلے جو اس کے پل پل کی خبر رکھنے کی کوشش کرتی تھیں، وہ بتدریج ایک سانچے میں ڈھل گیا۔ رفتہ

رفتہ اس کی شخصیت کا ایک اسلوب بن گیا اور وہ عمر بھر اس اسلوب کے ساتھ زندہ رہا۔ محنت، احتیاط، توازن، شائستگی، ذاتی کامیابیوں کے لئے مسلسل جدوجہد اور چیلنج قبول کرنے کی صلاحیت اس شخصیت کے بنیادی عوامل تھے۔ بلوغت کی عمر میں اپنی قوم اور وطن سے محبت کا جذبہ بھی اس شخصیت کا ایک اٹوٹ حصہ بن گیا۔ جنرل اختر کو عمر بھر اس بات کا احساس رہا کہ وہ جو کچھ بھی ہیں، اپنی ماں کی بدولت ہیں۔ اولاد کو اپنی ماں سے محبت ہوتی ہے لیکن جہاں تک اس آدمی کا تعلق ہے، اس کے لئے ان کی والدہ اس کی شخصیت کا ایک حصہ تھی، جسے وہ اور ان کے بہن بھائی پڑوس میں آباد ولی کے ایک گھرانے کے زیر اثر بواجی کہنے لگے تھے اور رفتہ رفتہ یہ ان کا جگت نام ہو گیا۔

بواجی تہجد کے وقت اٹھ بیٹھتیں اور جیسا کہ سحر دم بیدار ہونے والوں کا مزاج ہوتا ہے کچھ ہی دیر بعد وہ اپنے تینوں بچوں کو بھی جگا دیتیں۔ اختر کی بڑی بہن آپا سلطان جو اب بھی بقید حیات ہیں، ناشتہ تیار کرنے لگتیں اور اختر کو آموختہ یاد کرنے کے لئے کہا جاتا۔ عجیب بات یہ ہے کہ وہ رات کو بھی عام بچوں کے برعکس دیر سے سویا کرتا تھا جب وہ سبق یاد کر رہا ہوتا اور بواجی اس کے قریب کرسی، چارپائی یا مصلے پر بیٹھی رہتیں۔

جستروال کے پرائمری سکول سے چوتھی جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد اختر کو چھ سات میل دور اجنالہ کے ہائی سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ خاندان کی بڑی بوڑھیوں کو اب تک یاد ہے کہ اجلے لباس کا ذوق رکھنے والے لڑکے کو اینٹوں کی سڑکوں پر دوڑتے تانگوں سے بڑی وحشت ہوتی تھی۔ پہلی بار اجنالہ لے جانے کے لئے اسے تانگے پر بٹھایا گیا تو وہ خوف کے مارے چلانے لگا۔ ماں کا خیال تھا کہ وہ بتدریج اس کا عادی ہو جائے گا لیکن وہ نہ ہو سکا۔ اب اس مسئلے کا کیا حل تلاش کیا جائے؟ ٹھنڈے دل سے سوچ بچار کرنے والی بواجی نے آخر کار ایک حل ڈھونڈ

نکالا۔ اختر کے لئے ایک سائیکل خریدی گئی لیکن نو سالہ بچے کو روزانہ چھ میل کی مسافت کے لئے تنہا بھیجنا مشکل تھا، چنانچہ اس کے لئے ایک ملازم رکھا گیا اگرچہ اب خاندان کے پاس پہلے سے وسائل نہیں تھے لیکن مرحوم ڈاکٹر عبدالرحمن اتنا روپیہ ضرور چھوڑ گئے تھے کہ بنیادی ضرورتیں سہولت سے پوری کی جا سکتیں، سالانہ گزارہ الاؤنس اس کے علاوہ تھا۔

اختر بہت باقاعدگی سے سکول جاتا اور اگرچہ اب بواجی براہ راست اس کی نگرانی نہیں کر سکتی تھیں لیکن وہ ملازم کے ذریعے خبر رکھنے کی کوشش کرتیں گھر پہ ٹیوشن کا سلسلہ جاری تھا۔ رفتہ رفتہ وہ نظم کا خاصا پابند ہو گیا اور عام دیہاتی بچوں کے برعکس اپنی پسند پر کم ہی اصرار کرتا صحت مند لڑکا کسی اور کھیل میں توجہ نہ لگا سکا لیکن جلد ہی اسے کشتی کے شوق نے آ لیا، جو اس زمانے کے برصغیر کا سب سے نمایاں کھیل تھا۔ وہ پیدائشی طور پر ایک صحت مند بچہ تھا اور اس کی خوراک کا خیال رکھا جاتا تھا وہ اس کھیل میں جلد ہی پہلے تو اپنے محلے اور پھر گاؤں بھر میں ممتاز ہو گیا۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے سے پہلے وہ گاؤں میں اپنی عمر کے بیشتر "پہلوانوں" کو پچھاڑ چکا تھا۔

جیسا کہ دیہاتی ماحول میں عام طور پر ہوتا ہے اس نے اپنے بہت سے حسد کرنے والے پیدا کر لئے تھے۔ وہ کم آمیز، خوش لباس اور رعب دار لڑکے کو ناپسند کرتے تھے جو کھیتوں سے تربوز اور باغوں سے پھل چرانے میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا اور جو ہر کام کرنے سے پہلے اس سوال پر غور کرتا تھا کہ اس کی پیاری بواجی یہ پسند کریں گی یا نہیں۔

اس کے ایسے ہی ناراض ہمجولیوں نے ایک بار لڑکے کو تھوڑا سا سبق سکھانے کا اور اس کے پندار کو شکست دینے کا منصوبہ بنایا۔ انہوں نے ایک پیشہ ور پہلوان سے سازباز کی کہ وہ اختر کی ایک آدھ ہڈی توڑ ڈالے۔ انہوں نے اپنے ساتھی کے سامنے اس پہلوان کو اپنے جیسے کشتی کے ایک عام سے شوقین کے طور پر پیش کیا اور

امید دلائی کہ وہ اسے آسانی سے شکست سے دوچار کر دے گا۔ وہ دونوں اکھاڑے میں اترے تو اختر کو اندازہ ہوا کہ معاملہ کڈھب ہے۔ اس نے بچنے کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن مدمقابل نے اس کا گھٹنا اپنی جگہ سے ہلا دیا کہ پہلوانوں کو اس کی بڑی مہارت ہوتی ہے۔ ہم عمروں کے چہروں پر تمسخر آمیز ہنسی کے درمیان وہ ملے ہوئے تختے کے ساتھ گھر پہنچا اور کچھ کھائے پئے بغیر بستر پر دراز ہو گیا۔ اس کمال ضبط کے ساتھ جواب اس کی شخصیت کا خاصا ہو چکا تھا اس نے درد کی شکایت نہیں کی۔ اسے اپنی ماں کا خیال تھا جو اس کی چھوٹی چھوٹی تکلیف پر تڑپ اٹھتی تھیں اور کرید کرید کر تفصیلات پوچھتی تھیں۔

آدھی رات کو ماں کی آنکھ کھلی، جو اب بھی بیٹے کو ساتھ سلایا کرتی تھیں۔ انہوں نے لڑکے کے جسم کو بخار سے جلتے پایا جیسا کہ بعد میں وہ اپنے پوتوں کو بتایا کرتی تھیں وہ بے قرار ہو کر رونے لگیں پوچھ گچھ کے جواب میں بیٹے نے تفصیل بیان کی۔ معائنے سے معلوم ہوا کہ گھٹنے پر خاصی سخت چوٹ آئی ہے اور یہی بخار کا سبب ہے۔

بواجی نے بڑھاپے میں زیادہ تر وقت اپنی بڑی بیٹی آپا سلطان کے ساتھ گزارا جس سے وہ سارا دن بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرتیں یا عبادت میں محو ہوتیں۔ انہوں نے 89 سال کی عمر پائی اور 1982ء میں دل کے دورے سے انتقال کیا۔ جب کبھی وہ چند دن یا چند ہفتے قیام کے لئے اپنے بیٹے کے ہاں آتیں تو وہ اپنے پوتوں کو کچھ اور کہانیاں بھی سنایا کرتی تھیں۔

اختر اس وقت چھٹی یا ساتویں جماعت کا طالبعلم تھا، سالانہ امتحان کا نتیجہ نکلنے والا تھا۔ بواجی دن چڑھے دہلیز کے قریب چارپائی بچھا کر بیٹھ رہیں اور بیٹے کا انتظار کرنے لگیں۔ کچھ دیر گزری تھی کہ حویلی کا ایک دوسرا بچہ نمودار ہوا جو اختر کے اسی سکول کا طالبعلم تھا۔ جھجھکتے ہوئے اس نے بتایا کہ وہ تو امتحان میں پاس ہو گیا ہے

لیکن اختر نہیں۔ ماں کے لئے یہ خبر بڑی ہی غیر متوقع تھی۔ انہیں اس سے بڑا صدمہ پہنچا اور وہ غصے سے بھر گئیں۔ کیا گھر پر ٹیوشن پڑھانے، راتوں کو جاگنے، دن بھر تلقین کرنے اور سحر دم بیدار ہونے کا یہی نتیجہ نکلنا چاہئے تھا؟ انہیں اپنے خوابوں کا محل زمیں بوس ہوتا دکھائی دیا۔ تو یہ ہے وہ لڑکا جس سے انہوں نے چھپ چھپ کر باتیں بنانے والے رشتہ داروں کے درمیان مستقبل کی ساری امیدیں باندھ رکھی ہیں۔ یہ ہے سارے لاڈ پیار اور اہتمام کا نتیجہ؟

ماں کی برہمی سے بے خبر اختر گھر میں داخل ہوا تو بوا نے اس پر ڈنڈوں کی بارش کر دی۔ اسے سنبھلنے اور بات کرنے کا موقع نہیں ملا اور وہ خاصی دیر پٹتا رہا تا نکہ وہ نڈھال ہو کر بیٹھ گئیں اور اپنی قسمت کو کوستے ہوئے رونے لگیں۔ اختر حیران اور آزردہ تھا۔ یہ درست ہے کہ بوا جی پہلے بھی کبھی کبھار سختی سے کام لیا کرتی تھیں لیکن اس سے پہلے تو انہوں نے کبھی اسے ایسی بے دردی سے نہیں پیٹا تھا۔ آج انہیں کیا ہو گیا تھا۔ وہ ہمت سے کام لے کر آگے بڑھا اور ساری جرأت جمع کر کے آخر کار اس نے پوچھ ہی لیا کہ ایسا کیوں ہوا ہے اور اب وہ رو کیوں رہی ہیں۔ وہ کچھ دیر تو ناراض اور گم سم بیٹھی رہیں اور پھر انہوں نے چیخ کر کہا تمہیں یہ سوال کرتے ہوئے شرم نہیں آتی، امتحان میں فیل ہو کر گھر پہنچے ہو اور پوچھتے ہو کہ تمہاری پٹائی کیوں کی گئی ہے۔ پوچھتے ہو کہ میں رو کیوں رہی ہوں؟ حیرت اور لڑکپن کی اس معصومیت کے ساتھ جو عمر بھر اختر کے ساتھی رہی، اس نے اپنی ماں کو بتایا کہ وہ تو بہت اچھے نمبر لے کر پاس ہو گیا ہے اور فیل تو دراصل غلط اطلاع دینے والا ہم جولی ہوا ہے۔ بوا جی جب بھی یہ کہانی سناتیں تو ان کا درد تازہ ہو جاتا اور وہ رونے لگتیں۔ وہ رات انہیں ہمیشہ یاد رہی جب وہ روئی کے پھاہے گرم کر کے بیٹے کے زخموں کو ٹکور کرتی رہی تھیں۔ عمر بھر وہ اس زیادتی کے لئے اپنے آپ کو معاف نہ کر سکیں۔

پیچھے رہ جانے والے رشتہ داروں، حویلی کے مکینوں اور دوسرے دیہاتی ہمسایوں

کی جہل اور حسد سے پھوٹنے والی چھوٹی چھوٹی سازشوں سے اختر کا دل بہت کڑھتا تھا کہ ان واقعات سے ان کی ماں آزردہ ہوتیں اور اس کی چھوٹی سی دنیا میں اضطراب پھیل جاتا۔ بواجی کی حکمت عملی یہ تھی کہ رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے ساتھ بگاڑ پیدا کرنے سے گریز کیا جائے۔ شوہر کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا اور وہ مردوں کی حاکمیت کے وہی ماحول میں اپنے یتیم بچوں کے لئے مسائل پیدا کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ ان کی سوجھ بوجھ یہ کہتی تھی کہ اگر وہ دوسری عورتوں کی طرح بچوں کے لئے دوسروں سے لڑنے بیٹھ جائیں تو وہ ایک بے نتیجہ اور بھدی کشمکش میں الجھ جائیں گی۔ اس سے ان کے گھر کا سکون تو برباد ہوگا ہی، وہ اپنی اولاد کی تعلیم اور تربیت پر توجہ نہ دے سکیں گی، لہٰذا ہر ناگوار واقعہ پر ان کا عمومی ردعمل یہ ہوتا کہ وہ صبر اور ضبط سے کام لینے کی کوشش کرتیں۔ وہ ایک باحوصلہ خاتون تھیں اور آسانی سے مرعوب اور پریشان نہیں ہوتیں تھیں لیکن حالات کا تقاضا یہی تھا اس ماحول میں پرورش پانے والے اختر میں دو رویے پروان چڑھے ایک تو یہ کہ وہ غیر ضروری مراسم سے گریز برتنے والے آدمی بن گئے۔ ان کے اندر یہ احساس پیدا ہوگیا کہ لوگ غیر ضروری طور پر مسائل پیدا کرتے اور خواہ مخواہ الجھتے رہتے ہیں، لہٰذا دوسروں کو اپنے معاملات میں مداخلت کا کم از کم موقع فراہم کیا جانا چاہئے اور اسی طرح دوسروں کے ذاتی معاملات سے دور رہنا چاہئے۔ کبھی بعد میں بھی وہ اپنے قریبی رشتہ داروں سے بھی بہت گھل مل کر نہ رہ سکے۔ وہ لوگوں کی بات توجہ سے سنتے تھے اور بعض اوقات مشکلات میں عزیزوں کی مدد کرنے کے لئے بہت دور تک چلے جاتے تھے لیکن تعلقات اور رشتوں کی خاص بے تکلفی ان میں کبھی پیدا نہ ہوسکی۔ ثانیاً وہ عمر بھر کے لئے اپنے خاندان کے ہو کر رہ گئے۔ شادی سے پہلے اور اس کے بعد ان کا سارا فارغ وقت ہمیشہ گھر پر گزرتا رہا۔ وہ اپنے اہل خاندان کے ہمیشہ بہت قریب رہے، اتنے قریب کہ بڑے آدمیوں کی زندگیوں میں ایسی کوئی دوسری مثال شاید ہی تلاش

کی جا سکے اور یہ اس زمانے میں ہوا جب گھر میں مردوں کی دلچسپی کم ہوتے ہوئے برائے نام رہ گئی ہے۔ برصغیر کی عسکری تاریخ کے اس نادر جرنیل کی شخصیت اور مزاج کی تشکیل میں اس رویے کا دخل بہت گہرا ہے۔

بوا جی جو کہانیاں سنایا کرتیں وہ سب کی سب غم ناک نہیں تھیں وہ اپنے بیٹے کے بچپن اور لڑکپن کی جس کا نام وہ بہت لاڈ سے لیا کرتی تھیں، کامیابیوں کا تذکرہ بڑے فخر اور مسرت کے ساتھ کرتیں وہ ایسی کہانیاں بھی سناتیں کہ ماحول گلزار ہو جاتا۔ بوا جی کے پاس کچھ روپیہ اور زیور تھا اور ہر چند کہ حویلی کی اونچی دیواروں کے اندر کسی لٹیرے کے داخل ہونے کا کوئی حقیقی اندیشہ موجود نہ تھا۔ کبھی کبھی ان کے دل میں خیال آتا کہ اگر ان کے گھر میں چور آ گھسے تو کیا ہو گا۔ وہ ہر رات اونچے دروازوں اور کشادہ کھڑکیوں کی چٹخنیاں بڑے اہتمام سے بند کرتیں۔ اختر نے جو تب پرائمری کا طالب علم تھا اور خاندان کی توجہ کا مرکز ہونے کی وجہ سے خود کو بڑا اہم اور مضبوط سمجھنے لگا تھا ایک بار ان سے کہا کہ وہ پریشان کیوں ہوتی ہیں۔ وہ اسے ایک پستول خرید دیں اور بے فکر ہو جائیں۔ اس نے کہا اگر کسی چور نے ان کے گھر میں گھسنے کی کوشش کی تو وہ اسے گولی مار دے گا۔

ایک صبح جب بوا جی نماز فجر کے وقت بھر دیر تک نیند کے مارے لڑکے کو بیدار کرنے کی کوشش کرتی رہیں لیکن وہ بستر سے جدا ہونے پر آمادہ نہ تھا انہیں مذاق سوجھا اور انہوں نے اختر کے کان میں سرگوشی کی ''چور اختر! گھر میں گھس آئے ہیں'' پھرتی سے وہ اٹھا اور اس نے تکیے کے نیچے سے کھلونا پستول نکال کر پٹاخے داغنا شروع کر دیئے۔ اسے یقین تھا کہ اس کے پاس اصلی پستول ہے جس سے وہ چور کو ہلاک کر دے گا۔ لڑکے کی بدحواسی پر سب لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ شام تک یہ لطیفہ حویلی سے نکل کر محلے کے دوسرے گھروں تک پہنچ چکا تھا اور بیچارے اختر کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔

بواجی کی یادوں میں جگمگاتے دنوں میں سے ایک وہ تھا جب میٹرک کے امتحان کا نتیجہ نکلا اور معلوم ہوا کہ اختر نہ صرف امتیازی نمبروں سے پاس ہو گیا ہے بلکہ وہ وظیفہ حاصل کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ ایک لائق طالبعلم کے طور پر اب اس کی شہرت پورے قصبے میں پھیلتی جا رہی تھی۔ اب وہ کشتی کے علاوہ کبڈی اور فٹ بال کھیلنے لگا تھا جو اس عہد میں نوجوانوں کے محبوب مشغلے تھے کہ ابھی کرکٹ کا کھیل قصباتی زندگی میں داخل نہ ہوا تھا اور محض امراء کا چونچلا سمجھا جاتا تھا۔ اب جسترwal کے گھروں میں اس لڑکے کا ذکر ایک افسانوی کردار کے طور پر ہونے لگا جو بے داغ لباس پہنتا تھا، کمرہ جماعت سے کبھی غیر حاضر نہ ہوا تھا، اعلیٰ درجے کا کھلاڑی تھا جس نے کبھی بری بات منہ سے نہ نکالی تھی اور جس کی بیوہ ماں اس پر فخر کرتی تھی۔

آخر کیوں نہ ہو، وہ ڈاکٹر عبدالرحمن کا بیٹا تھا جو اونچے طرے کی پگڑی باندھے پشاور سے جسترwal آیا کرتے تھے اور کسی سے بلاضرورت بات نہیں کرتے تھے۔ کیوں نہ ہو وہ اس خاندان کا فرزند تھا جس کے بڑوں نے مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں سے لڑائیاں لڑی تھیں۔ بدرالدین خان کا پڑپوتا جو 1857ء میں گھوڑے پر سوار انگریزوں سے لڑنے گئے اور لوٹ کر نہیں آئے۔ "دیکھ لینا ایک دن وہ اپنے خاندان کا نام روشن کرے گا" دیئے کی ٹمٹماتی روشنی میں کوئی بڑھیا اپنے بچوں کو اس کی مثال دیتے ہوئے سمجھاتی۔ جسترwal کے کسی بازار میں سائیکل دوڑاتے لڑکے پر کسی مسلمان بوڑھے کی نظر پڑتی تو اس کی آنکھوں میں چمک آ جاتی "اچھا تو یہ ہے بلند خان کا وہ پوتا"

برصغیر میں آزادی کے نعرے کی گونج تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ جسترwal کے بڑے بوڑھوں اور اخبار پڑھنے والے نوجوانوں کو معلوم تھا کہ ڈاکٹر اقبالؒ کے کہنے پر قائد اعظم لندن سے لوٹ آئے ہیں اور مسلم لیگ کے صدر بن گئے ہیں۔ اخباروں میں گاندھی، نہرو، عطاء اللہ شاہ بخاری اور ظفر علی خان کا تذکرہ ہوتا۔ آئے روز اجتالہ اور

امرتسر میں بڑے بڑے جلسے ہوتے جہاں بیس سال پہلے جنرل ڈائر نے سینکڑوں سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھون ڈالا تھا۔ مجلسوں اور گفتگوؤں میں اب اس سوال پر بھی بحث ہوتی کہ جب انگریز چلے جائیں تو بادشاہی کسے ملے گی؟ کیا ہندو، سکھ اور مسلمان اکٹھے رہ سکیں گے۔ کوئی بوڑھا داڑھی کھجاتے ہوئے احراریوں اور کانگرسیوں کو کوستا اور دوسروں کو بتاتا کہ اندر سے انگریز ہندو اور سکھ سب ایک ہیں اور مسلمانوں کی تباہی کے درپے ہیں۔ کوئی تاجر سودا سلف کی خریداری کے لئے لاہور کی طرف جا نکلتا اور ہمت کر کے گڑھی شاہو والے مکان میں اقبال کو سلام کرنے چلا جاتا تو واپسی پر خبر لاتا کہ شاعر کی نظر بہت کمزور ہو گئی ہے، وہ بیمار رہتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ اب محمد علی جناح ہی اس قوم کو مشکلات سے بچا سکتا ہے۔ آئے دن کے جلسوں، جلوسوں کے باوجود شہروں اور قصبوں میں امن تھا۔ دوسری عالمگیر جنگ ابھی شروع نہیں ہوئی تھی اور سارا ماحول جیسے آنے والے کل کے انتظار میں تھا۔

چودہ سالہ اختر اس سب کچھ سے بے نیاز اپنی ذاتی زندگی میں مگن تھا اسے تو بس ایک ہی فکر کھائے جاتی تھی وہ جلد از جلد اپنی تعلیم مکمل کرے اور اپنی بوا جی کو ساری فکروں سے بے نیاز کر دے وہ انہیں بڑا افسر بن کر دکھا دے اور ان سے شاباش حاصل کرے۔ اسے انگریزوں سے کوئی دلچسپی تھی نہ ان سے لڑنے والے لیڈروں سے یہ درست تھا کہ سکھوں نے اس کے اجداد کی جاگیر چھین لی تھی اور وہ بازاروں میں اکڑ کر چلتے تھے یہ بھی درست تھا کہ ہندو مسلمانوں سے نفرت کرتے تھے اور صوبوں میں کانگرس کی حکومتیں قائم ہونے کے بعد وہ مسلمانوں کے ساتھ اور زیادہ حقارت سے پیش آنے لگے تھے لیکن وہ کیا کرے اس کا مسئلہ تو آنے والا کل تھا اور اس کی بوا جی۔

اختر نے ابھی میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ جب اس نے ماں سے پوچھنا شروع کیا

کہ اس کی آئندہ تعلیم کا کیا ہو گا کہ اجنالہ میں تو کوئی کالج موجود نہ تھا۔ بو اجی نے اسے مضبوط لہجے میں بتایا کہ وہ اس کی پرواہ نہ کرے اور اپنا دھیان پڑھائی کی طرف مبذول رکھے۔ نوجوان طالب علم نے اس سے یہ مراد لی کہ میٹرک کے بعد اسے امرتسر کے کسی کالج میں داخل کرا دیا جائے گا، جہاں وہ ہوسٹل میں قیام پذیر ہو گا۔

جب وہ میٹرک کا امتحان دے کر جستر وال میں انتظار کے دن گزار رہا تھا تو اس سوال پر زور شور سے بحث ہونے لگی کہ اسے کس کالج میں داخلہ لینا چاہئے۔ لڑکے کو اس بات سے بڑی پریشانی لاحق تھی کہ اسے اپنی بہن اور ماں سے دور رہنا پڑے گا اور وہ صرف ہفتہ وار تعطیل کے دن ان سے ملنے آیا کرے گا لیکن خود ماں کی پریشانی بیٹے سے کم نہیں تھی جو اس کی نظروں سے ایک دن بھی اوجھل نہ رہا تھا آخر کار ایک روز انہوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ وہ اس کے ساتھ جائیں گی جب تک وہ بی اے کا امتحان پاس نہیں کر لیتا اس کا پورا خاندان امرتسر میں مقیم رہے گا۔

اختر کے رشتہ کے ایک ماموں کے توسط سے جو محکمہ ڈاک میں ملازمت کرتے تھے امرتسر میں کرائے کے ایک مکان کی تلاش شروع کر دی گئی لیکن پھر کرائے کے گھر میں رہنے کا خیال بو اجی کو پسند نہیں آیا۔ انہوں نے اپنے بھائی سے کہا کہ وہ ان کے لئے چھوٹا سا گھر خرید لیں۔ ہر معاملے کے سب پہلوؤں پر سوچ بچار کرنے والی بو اجی نے سوچا کہ جب کبھی وہ امرتسر سے واپس آنا چاہیں گی تو یہ مکان بیچ دیا جائے گا۔ اس سے نہ صرف کرائے کی بچت رہے گی بلکہ وہ اپنے ذاتی مکان میں رہ سکیں گی۔ آخر کار محلہ اسلام آباد میں ایک مکان خرید لیا گیا۔ یہ اس حویلی کی طرح تو نہیں تھا لیکن اس میں تین کمرے تھے اور خاندان کی ضرورت کے مطابق اس میں ہر سہولت موجود تھی۔ اس مکان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہ اختر کے ڈاک خانے والے ماموں کے گھر سے قریب تھا۔ تو اب سامان باندھ کر رہٹھوں اور تانگوں پر لاد دیا گیا۔ حویلی والوں نے خوش سلیقہ بہو کو گلے لگا کر رخصت کیا۔ جستر وال میں

قیام کے دوران اپنی اس سوتیلی بیٹی کے علاوہ جو اس کے مرحوم شوہر کی یادگار تھی، اس نے مڈل تک تعلیم دلانے کے بعد ایک جانے بوجھے بھلے خاندان میں اپنی بڑی بیٹی سلطان کی شادی کر دی تھی۔ بواجی اب 45 سال سے زیادہ کی ہو گئی تھیں۔ عبادت کی کثرت سے اب ان کے چہرے پر ایک گہری علامت آ گئی تھی اب وہ عینک لگاتی تھیں اور پہلے سے بھی زیادہ دھیمے لہجے میں بات کرنے لگی تھیں۔ اس حویلی کی تاریخ میں اس سے پہلے یہ کبھی نہیں ہوا تھا کہ کوئی بہو اپنی اولاد کو ساتھ لے کر اس طرح شہر میں جا بسے لیکن اب زمانہ بدل رہا تھا اور پھر یہ کہ بواجی جب کوئی فیصلہ کر چکتیں تو وہ کسی کی سنتی کب تھیں۔ حویلی کے پچھلے دس سالوں کی سب یادیں خوشگوار نہیں تھیں لیکن پھر بھی رخصت کا وقت آیا تو سب اہل خاندان الوداع کہنے کے لئے جمع ہوئے۔ بڑے بوڑھوں نے نصیحت کرتے ہوئے بہو کے سر پہ ہاتھ رکھا کہ شہر میں پاس پڑوس والوں سے محتاط رہنا، اختر کو مشورہ دیا گیا کہ وہ اپنی ماں کا خیال رکھے۔ بڑی بوڑھیوں نے دعائیں دیں۔ گلے ملنے کا وقت آیا تو بار بار کہا سنا معاف کرنے کو کہا گیا اور آنکھیں بھر آئیں۔ اکے چل پڑے اور الوداع کہنے والوں کی نظریں دور تک دیکھتی رہیں۔

اختر کے لئے امرتسر اسلامیہ کالج کا انتخاب کس بنیاد پر عمل میں آیا یہ بتانے والا کوئی نہیں کہ اس میں کس کا مشورہ شامل تھا بظاہر اس کالج کا سب سے بڑا امتیاز یہ تھا کہ یہ مسلمانوں کے ان تعلیمی اداروں میں سے ایک تھا جو مسلمانوں نے سرسید کی علی گڑھ یونیورسٹی کے اتباع میں برصغیر کے مختلف شہروں میں قائم کئے۔ کالج کے پرانے طالبعلموں میں سے بعض کا کہنا ہے کہ یہ امرتسر کے خالصہ کالج کے جواب میں قائم کیا گیا تھا اوّلاً یہ ایک ہائی سکول تھا جہاں رائج نصاب کے علاوہ مسلمان بچوں کی تعلیمی ضروریات ملحوظ رکھا جاتا تھا اور بعد میں انٹر اور ڈگری تک وسیع کر دیا گیا۔ کچھ بھی ہو پڑھائی اور نظم کے اعتبار سے یہ بہترین اداروں میں سے ایک مانا جاتا تھا

جس کے پرنسپل ڈاکٹر سر علامہ محمد اقبالؒ کے چہیتے ایم ڈی تاثیر تھے۔ فیض احمد فیض کالج میں اردو شاعری پڑھایا کرتے۔ کبھی کبھار وہ عربی کی کلاس بھی لیتے اور کوئی دوسرا استاد رخصت پر ہوتا تو اس کی جگہ انگریزی بھی پڑھاتے۔ وہ کالج کے برآمدوں میں کوئی فارسی مصرعہ گنگناتے دکھائی دیتے۔ کالج کے دوسرے استادوں میں بھی، بہت سے لائق لوگ موجود تھے۔ خطرے سے دوچار مسلمان قوم کے کئی بہترین دماغ اس کی درس گاہوں میں دکھائی دیتے تھے۔

اختر ابھی چودہ سال کا تھا اپنے سارے ہم جماعتوں سے کم عمر، ابھی اس کی داڑھی مونچھ بھی نہیں پھوٹی تھی لیکن وہ زیادہ کم عمر دکھائی نہ دیتا تھا۔ نکلتے ہوئے قد اور کسرتی جسم کے ساتھ اب وہ ایک خوش باش اور پراعتماد آدمی تھا۔ وہ ہمیشہ سلیقے کا لباس پہنے ہوتا اور غیر ضروری گفتگو سے گریز کرتا۔ اس نے سوال کرنے والوں کے سوا کسی کو نہیں بتایا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کس خاندان سے اس کا تعلق ہے اور اس بات کا تو اس نے کسی سے تذکرہ تک نہیں کیا کہ اس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔

ایک اور اہم بات یہ تھی کہ وہ لڑائی جھگڑے سے ہمیشہ گریز کرتا تھا۔ امرتسر والوں کو جو لڑنے جھگڑنے کے بہت شوقین تھے یہ بات بہت عجیب محسوس ہوتی تھی کہ ایک بظاہر مرعوب نہ ہونے والا صحت مند نوجوان پنجہ کشی اس قدر گریزاں ہو لیکن اس میں کچھ اور عجیب باتیں بھی تھیں۔ وہ شام کو کمپنی باغ کے اکھاڑے میں جاتا۔ کبڈی اور فٹ بال اور سائیکلنگ کے میچوں میں حصہ لیتا لیکن گھر سے باہر کوئی چیز کھانے پر آمادہ نہ ہوتا۔ امرتسر متنوع کھانوں کا ایک بازار تھا جہاں پنجاب، دہلی اور کشمیر کے بعض بہترین باورچی موجود تھے۔ اس تجارتی مرکز میں دور دراز سے لوگ خریداری کرنے آتے۔ ہوٹل سیاسی کارکنوں، شاعروں اور دوسری مجلس آرائی کرنے والوں سے آباد رہتے لیکن اختر کسی ہوٹل میں بیٹھتا اور نہ کچھ کھاتا پیتا، چائے کی ایک پیالی بھی نہیں۔

دوسرے لڑکیوں کے برعکس اس کی جیب میں ہمیشہ کچھ روپے ہوتے لیکن عام طور پر یہ ویسے کے ویسے ہی رکھے رہتے۔ اسے خریداری سے دلچسپی نہ تھی نہ اظہار ذات سے۔ کھیلوں کے سوا کسی دوسری اجتماعی سرگرمی سے بھی نہیں۔ وہ سیاست پر جو اس شہر میں گفتگو کا سب سے بڑا موضوع تھا خال ہی کبھی بات کرتا۔ اس کی کبھی کسی ہندو یا سکھ لڑکے سے دوستی نہ ہوسکی۔ وہ انہماک سے اپنی کتابیں پڑھتا یا ورزش میں مگن رہتا۔ کمپنی باغ میں ڈنر پیلتے یا بیٹھکیں لگاتے جواں سال آدمی کے چہرے پر پسینے کے قطرے چمکتے تو کبھی کوئی راہگیر اسے دیکھنے کے لئے رک جاتا۔ اس کے کاندھے کشادہ تھے اور سینہ فراخ۔ بال سلیقے سے ترشے ہوئے اور رنگ سرخ و سفید، نوجوان کی آنکھوں میں چمک تھی اور چہرے پر ایک بھولپن اور اعتماد۔

وہ ان نوجوانوں میں سے ایک تھا جن کی دلکشی کی تعریف کی جاتی ہے اور جنہیں چلمنوں کے پیچھے سے تحسین آمیز نظروں سے دیکھا جاتا ہے لیکن وہ تو جیسے ہمیشہ اپنے اندر دیکھتا رہتا تھا اور اسے باہر کی دنیا کی کوئی خبر تک نہ تھی۔ برصغیر میں سینما کو رواج پائے کئی سال گزر چکے تھے۔ لڑکے بالے فلمی گیت گنگناتے اور بازاروں میں سیٹیاں بجاتے گزرتے تھے۔ شہر میں شراب خانے تھے، چمک دمک والے ہوٹل اور ان میں شامیں گزارنے والے حسیناؤں کے تذکرے کرتے تھے۔ جو چراغ جلے بن سنور کر بیٹھتیں اور موسیقی کی تانوں کے درمیان بولتی آنکھوں سے تماش بینوں کے لہو کی گردش تیز کرتی تھیں۔ شوقین مزاجوں کے لئے موسیقی سکہ رائج الوقت تھی اور باوسیلہ نوجوانوں کے لئے معاشرے سے بغاوت اور فرار کا پہلا راستہ ادھر ہی کو جاتا تھا اختر کے لئے یہ سب کیا تھا؟ غیر ضروری، خرافات اور بکواس۔ وہ اپنی ماں کا بیٹا تھا جو مصلے پر بیٹھی رہتی تھیں اور گزرے وقت کے قصے دہراتی تھیں۔ جب اس کے والد زندہ تھے اور ایک زمانہ ان کا احترام کرتا تھا، جب انگریز نہیں آئے تھے سکھوں نے پنجاب پر قبضہ نہیں جمایا تھا اور اختر کے باپ دادا جنگوں میں داد

شجاعت دیتے اور فرماں رواؤں سے انعام پاتے تھے۔ بقول اس اختر کہتا، آدمی کو ان سب چیزوں سے دور رہنا چاہئے پھر وہ کتاب پڑھنے لگتا یا ڈنٹر پیلنے میں مصروف ہو جاتا۔ آخر ایک بھلے آدمی کے لئے اس کے سوا ڈھنگ کی مصروف کیا ہو سکتی ہے؟

عام طور پر وہ سفید اجلی قمیض پہنتا یا کوئی دوسرا باوقار رنگ۔ اسے شوخ رنگوں سے دلچسپی نہیں تھی اسے کبھی اپنی ذات کو نمایاں کرنے کی فکر لاحق نہیں ہوئی۔ اس نے کالج کے مباحثوں میں کبھی حصہ نہ لیا۔ حد تو یہ ہے کہ وہ نجی گفتگوؤں میں بھی اپنے بارے میں بات نہیں کرتا تھا۔ وہ اظہار و ابلاغ کا آدمی ہی نہ تھا وہ اپنے اندر جھانکتا اور خود سے سوال کرتا اسے اپنے آپ پر اعتماد تھا اور وہ خود آراستگی میں لگا رہتا۔ مطالعہ اور ورزش احتیاط، احتیاط اور احتیاط، صبر، ضبط اور تہذیب۔ ایک کوہ پیما کی طرح، ہدف پر نظریں جمائے لیکن ہنستا مسکراتا اس سے محبت کی گئی تھی اور اس کی تحسین کی جاتی تھی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ اس کا خاندان دوسروں سے بہتر ہے اسے دوسروں سے افضل ہونا چاہئے اور اسے اس کا یقین تھا۔ وہ ایک لڑکا ہی تو تھا لیکن اس کا رویہ اپنے ہم عمروں جیسا نہ تھا۔ ''میرے خدایا پورے دو سال ہم نے اکٹھے گزارے اور میں نے اسے کسی سے الجھتے نہیں دیکھا'' اس کے ایک دوست نے کہا۔ ان چند دوستوں میں سے ایک جن کے ہاں کبھی کبھار اس کا آنا جانا ہوتا ایک ضیاء غازی تھے، جھگڑالو، شوقین اور ممتاز رہنے کے خوگر، ضیاء غازی نے کالج میں یونین کے سیکرٹری کا الیکشن لڑا تو اس نے اختر سے بھی مشورہ کیا کہ اس کے ذاتی کردار پر شدومد سے اعتراض کیا جا رہا تھا۔ ہنستے ہوئے اختر نے اس سے کہا کہ تم یہ کہنا کہ میں واعظ نہیں ہوں، میں کالج کی یونین کا انتخاب لڑ رہا ہوں اور اپنی ذمہ داری خوبی سے نبھا سکتا ہوں۔ غازی کو یاد ہے کہ جب اس نے یہ جملہ کہا تو کالج کا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ بعد میں اس نے الیکشن جیت لیا اور اپنے دوست کا شکریہ ادا کیا لیکن وہ کبھی بہت گہرے دوست نہ بن سکے۔ غازی نے جواب بوڑھا ہو چکا

ہے اور زمانے کی بے مروتی کی شکایت کرتے ہوئے لاہور میں فراغت کے دن بسر کر رہا ہے اس کی ایک وجہ بتائی میں تھا ذرا شوقین مزاج اور ایک خاتون پر فدا ہو گیا تھا جو سامنے کے کالج میں تعلیم پاتی تھی ایک روز میں نے اختر سے کہا میں فکر مند ہوں لڑکی ڈھب پہ نہیں آ رہی۔ بے زاری اور ناگواری سے اختر نے مجھے اس طرح کی گفتگو کرنے سے ٹوکا اور کہا کہ بھلے لوگوں کے مشغلے اس طرح کے نہیں ہوتے۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی تو وہ مرکیڈ ہال سے اٹھ کر چلا گیا جہاں ہم بات چیت کر رہے تھے وہ ایک اور طرح کا آدمی تھا کچھ ہی دن بعد لاہور میں کبڈی کا ایک بڑا میچ ہوا جسے گورنر سر ہنری کریک اور وزیر اعلیٰ خضر حیات دیکھنے آئے۔ مقابلے میں لدھیانہ، امرتسر، جالندھر، پٹیالہ، ہوشیار پور، گجرات سرگودھا اور لاہور کی ٹیمیں شریک تھیں۔ اختر انعام حاصل کرنے والا نمایاں کھلاڑیوں میں شامل تھا۔ بعد میں اس نے کالج کے بہترین اتھلیٹ کا اعزاز بھی حاصل کیا۔

ایم ڈی تاثیر اور فیض ایسے ناموروں کی موجودگی میں اختر کے پسندیدہ استاد فارسی کے مقبل حسین تھے۔ درویش منش اور علم کی سرمستی سے سرشار مقبل ہر صبح لاہور سے آیا کرتے اور زندگی کے مادی پہلو سے بہت کم دلچسپی رکھتے تھے۔

1941ء میں جب دنیا عالمگیر جنگ کی تباہیوں سے لرز رہی تھی۔ اختر نے اکنامکس میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لینے کا فیصلہ کیا یہ اسی سال قدیم ادارہ، جس کی تعمیر پنجاب کی تسخیر کے بعد انگریزی حکومت کی اولین ترجیحات میں سے ایک تھی اپنے معیار اور روایات کی وجہ سے اس پورے علاقے کا شاید سب سے پرکشش ادارہ تھا۔ ان کے لئے جو تعلیم حاصل کرنے میں واقعی سنجیدہ ہوتے تھے اور ان کے لئے جو آگے بڑھنے کا خواب دیکھتے تھے پورے پنجاب کا (جس میں بھارت کا مشرقی پنجاب بھی شامل ہے) جو ہر قابل اس ادارے میں کھنچتا چلا آتا تھا اور منتخب لوگ ہی اس پرشکوہ عمارت کے

مرکزی دروازے سے داخل ہونے کا اعزاز حاصل کر پاتے تھے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے طالبعلموں سے متانت اور محنت کی توقع رکھی جاتی تھی۔ دوسرے تعلیمی اداروں کے برعکس جہاں اب کانگرس اور مسلم لیگ کی حامی طلبہ تنظیمیں منظم ہو رہی تھیں، گورنمنٹ کالج کے طالبعلم سیاست سے دور رہتے تھے۔ وہ کرکٹ کھیلتے تھے، مباحثوں میں شریک ہوتے تھے، لائبریری میں وقت گزارتے تھے اور اپنے لائق اساتذہ کے لیکچر سنتے تھے۔ انہیں بتایا جاتا تھا کہ اس کالج کے در و دیوار نے کیسے کیسے نامور اساتذہ اور طلبہ کو دیکھا ہے۔

شور شرابے والے امرتسر کے ایم اے او کالج کے برعکس جس سے اختر کبھی قلبی تعلق محسوس نہ کر سکے، لاہور کا گورنمنٹ کالج ہمیشہ ان کے دل کے قریب رہا شاید اس کی تدریسی فضا، نظم، رسمنا اور مرتب ماحول ان کے مزاج سے گہری مطابقت رکھتا تھا۔ ان کی والدہ محترمہ امرتسر والا گھر بیچ کر اپنی بیٹی کے ساتھ جستروال چلی گئی تھیں اور وہ کالج کے نیو ہوسٹل میں مقیم تھے۔ شام کو وہ اپنے دوستوں کے مختصر سے گروپ کے ساتھ گول باغ کے عقب میں مال سے گھوم کر سیکرٹریٹ یا انارکلی کی طرف جانے والے خاموش راستے پر چہل قدمی کرتے نظر آتے۔ وہ کالج میں تعلیم کے اعتبار سے تو کوئی خاص امتیاز نہ رکھتے تھے۔ جہاں بعد از اں نوبل انعام پانے والے ڈاکٹر عبدالسلام سمیت کئی سرکردہ اور سرفراز نوجوان موجود تھے لیکن وہ کھیلوں میں ضرور نمایاں تھے۔ اب سائیکلنگ، کبڈی اور کشتی کے ساتھ ساتھ وہ باکسنگ بھی کرنے لگے تھے بعد میں وہ کبھی کبھار ایک ہندو باکسر سے مقابلے کا واقعہ سنایا کرتے تھے جسے انہوں نے ناک آؤٹ کر دیا تھا اور مقابلہ دیکھتے ہوئے اس کی ماں رنج سے رو پڑی تھی۔

گورنمنٹ کالج کے ماحول ایسا دھیما مرتب انداز اور ایک باکسر کی جبلت عمر بھر جنرل کے ساتھ رہی جیسی اکہ ان کے ایک پرانے ہم جماعت کہتے ہیں جو نیو ہوسٹل

میں کچھ دن ان کے ساتھ ایک کمرے میں مقیم رہے دھیما اور منصوبہ ساز، توجہ مرکوز رکھنے والے، منظم اور پاکیزہ، لباس میں پاکیزہ، خیالات میں پاکیزہ، نمازی، خوش باش، جنرل کے پرانے ساتھی کو جو بعد میں کبھی ان سے نہیں ملے، اس پر کبھی حیرت نہیں ہوئی کہ اس آدمی نے زندگی میں ترقی کی منزل طے کیں۔ وہ شہرہ آفاق فلسفی لارڈ برٹرنڈ رسل کا حوالہ دیتے ہیں جس نے کہا تھا کہ ان کے بعض ہم جماعت ان سے زیادہ ذہین تھے لیکن وہ اس لئے شہاب ثاقب کی طرح فضاؤں میں بکھر کر بجھ گئے کہ وہ توجہ مرتکز رنے والے نہ تھے۔ وہ کہتے ہیں اختر کو اپنے مزاج پر بڑا قابو حاصل ہو گیا تھا احساس کمتری نہ برتری میں نے کبھی اسے غرور میں مبتلا دیکھا اور نہ غصے میں یہ ایک جہاندیدہ آدمی کا نہیں 19 سالہ لڑکے کا ذکر ہے جو اب ایم اے کے دوسرے سال میں تھا۔

کیا اختر کو عالمگیر جنگ کے نشیب و فراز سے جو تاریخ عالم کا شاید سب سے ہولناک واقعہ تھی، برصغیر میں پرہیبت سیاسی واقعات سے، منظر پر ابھرنے والے نئے سیاسی رہنماؤں اور ان عوامل سے کوئی دلچسپی نہ تھی جو مستقبل کی صورت گری کرنے والے تھے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے یقینا انہوں نے کچھ نتائج اخذ کیے ہوں گے ان کی کچھ رائے رہی ہو گی لیکن مضبوط ارادوں کے اس آدمی کو اپنی رائے ظاہر کرنے کی بے تابی نہیں تھی۔

کیا قدرت کو ان سے کوئی بڑا کام لینا تھا جو انسانی کردار اور مزاج کی تشکیل کرنے والا سب سے بڑا عنصر ہے؟ کیا کبھی اس جواں سال نے اس پر غور کیا تھا؟

1945ء میں انہوں نے ایم اے کا امتحان پاس کر لیا لیکن اب کی بار وہ صرف سیکنڈ ڈویژن حاصل کر پائے اگرچہ اس زمانے میں جب ممتحن رعایت دیتے تھے اور نہ نقل کرنے کا کوئی امکان تھا، یہ بھی ایک اعزاز سمجھا جاتا تھا۔

تو لیجیے، اب ہمارے سامنے ایک جوان رعنا ہے پولیس کی وردی میں ملبوس قد

پونے چھ فٹ، امتیازی نشان بائیں رخسار کے نیچے ایک نمایاں مسا۔



باب سوم



باب سوم

حیرت انگیز لیفٹیننٹ

2 فیلڈ رجمنٹ برطانوی ہندوستان کی وہ واحد رجمنٹ تھی جس کے سارے سپاہی مسلمان تھے۔ 1944ء میں برما کے محاذ پر، اپنے کمانڈر کی اچانک موت پر حادثتاً ایک معرکے میں قیادت کے فرائض انجام دینے اور ملٹری کراس حاصل کرنے والے کیپٹن راجہ محمد اسلم اس یونٹ کے واحد مسلمان افسر تھے۔ کیپٹن اسلم بعد میں پاکستانی فوج کے میجر جنرل بنے۔ وہ ان دنوں اپنے منصب سے ریٹائر ڈ ہو کر ایوب نیشنل پارک راولپنڈی کے عقب میں یادوں کے دن بسر کر رہے ہیں گزرے ہوئے دنوں کی بے شمار یادیں ان کے توانا حافظے میں محفوظ ہیں اور جب وہ گفتگو پر آمادہ ہوں تو ٹھہرے ہوئے لہجے میں دیر تک ان یادوں کو ایک ونک اور افتخار کے ساتھ دہراتے ہیں۔

برصغیر کی تقسیم عمل میں آئی تو 2 فیلڈ رجمنٹ (جس کا پرانا نام 3 انڈین فیلڈ یونین تھا) پونا سے 80 میل دور ڈھونڈ کے مقام پر متعین تھی۔ ایک روز کیپٹن اسلم کو یکایک حکم ملا کہ وہ اس رجمنٹ کو لے کر راولپنڈی چلے جائیں کہ اب اسے پاکستانی فوج کا حصہ بننا ہے۔ رجمنٹ کے سکھ اور ہندو افسر دوسری یونٹوں سے وابستہ ہونے جا رہے تھے اور ان کا انگریز کمانڈنگ افسر (سی او) واپس برطانیہ جا رہا تھا۔ راجہ اسلم نے اپنے سات آٹھ سو جوانوں کو ایک خصوصی گاڑی میں سوار کرایا، کھلی بوگیوں پر توپیں نصب کیں اور راولپنڈی روانہ ہو گئے۔ 2 فیلڈ رجمنٹ کو جو بعد ازاں باؤنڈری کمیشن کی مدد کرنے والے دستوں کا حصہ بنی، یہ سفر پانچ دن میں طے کر لینا چاہئے تھا لیکن اس میں پانچ ہفتے صرف ہو گئے۔ راستے میں گاڑی پر تین بار حملہ ہوا۔ پاکستانی سرحد کے قریب اسے روک کر اور اس کے جوانوں کو غیر مسلح کر کے

امرتسر لے جانے کی ایک سازش بھی کی گئی کہ ایک سالم اور مسلح رجمنٹ کے پاکستان پہنچنے کا تصور بھی بھارتیوں کے لئے اذیت ناک تھا لیکن راجہ اسلم کسی طرح لڑتے بھڑتے راولپنڈی پہنچ گئے۔ جہاں چھاؤنی میں الو بول رہے تھے۔

ویسٹرج میں راولپنڈی کے شہریوں نے اپنی فوج کے پہلے دستے کا استقبال بھنگڑا ڈالتے اور ڈھول بجاتے ہوئے کیا۔ وہ جوانوں میں گھل مل گئے ان سے گلے ملے اور ان میں سے بہت سوں نے بے تابی سے سوال کیا کہ وہ اپنے مہمانوں کی کیا مدد کر سکتے ہیں۔ جوان خالی پڑے کوارٹروں میں پناہ گزین ہوئے اور راجہ اسلم نے پشاور روڈ پر خالی پڑے ایک آرمی میڈیکل کور کے میس پر قبضہ جما لیا۔ جلد ہی ایک انگریز کرنل مسٹر بلڈلف BULDLUPH نے رجمنٹ کی کمان سنبھالی اور وہ منصب پر کیے جانے لگے، جو ہندو اور سکھ افسروں کے چھوڑ جانے سے خالی ہو گئے تھے سیکنڈ لیفٹیننٹ چشتی نام کے ایک افسر نے انہی دنوں رجمنٹ میں حاضری دی جو بعد میں لیفٹیننٹ جنرل بنے 5 جولائی 1977ء کے فوجی انقلاب میں اہم کردار ادا کیا، صدر ضیاء الحق کے دست راست بنے، پھر نکالے گئے اور بعد میں وعدہ معاف گواہ بننے کی کوشش کرتے پائے گئے۔

ایک روز راجہ محمد اسلم کے کمرے کا دروازہ کھلا جو اب کیپٹن سے میجر بنا دیئے گئے۔ ایک گورے چٹے افسر نے زمین پر پاؤں جما کر انہیں زوردار سیلوٹ پیش کیا۔ پہلی نظر میں تو میجر اسلم کا دھوکہ ہوا کہ نووارد ایک غیر ملکی ہے لیکن پھر انہیں اس کے کندھے پر ایک ستارہ دکھائی دیا یہ تو پاکستانی فوج کا سیکنڈ لیفٹیننٹ تھا۔ نووارد آگے بڑھا اس نے شستہ لیکن مضبوط لہجے میں کہا "سر! میرا نام اختر عبدالرحمن ہے"

ریٹائرڈ میجر جنرل محمد اسلم کو، جو راولپنڈی کی سپاہ گر جننے والی دھرتی سے تعلق رکھتے ہیں، اختر عبدالرحمن کے ساتھ گزرے دن خوب اچھی طرح سے یاد ہیں جو کبھی ان کا ماتحت تھا، بڑھ ترقی کرتے کرتے ان کا ہم مرتبہ میجر جنرل، اس کے بعد

لیفٹیننٹ جنرل پھر چار ستاروں والا جرنیل، چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف میں بنا اور تاریخ کے صفحات پر نہ مٹنے والے نقوش چھوڑ گیا۔ جنرل اسلم فوج میں اختر عبدالرحمن کے اولین سالوں کا تذکرہ احساس فخر کے ساتھ کرتے ہیں۔ انہیں اس کا بہت مان ہے کہ جانے والا ان کا بہت احترام کرتا تھا، ریٹائرمنٹ کے بعد بھی انہوں نے کہا وہ میرا احترام کرتے تھے اور اگر کبھی میں ناراض ہو جاتا تو وہ مجھے منا لیا کرتے تھے بوڑھے جرنیل سے گفتگو کرتے ہوئے، جن کے اندر کا سپاہی گفتگو میں بروئے کار رہتا ہے، انتہائی سخت گیر افسر کی بجائے جو شہید جرنیل کے بعض ماتحتوں کی یادوں میں ثبت ہے، ایک وضع دار آدمی کا چہرہ اجاگر ہوتا ہے۔ وضع دار اور بڑوں کے سامنے مودب۔

''اس نے برے وقتوں میں اچھے کام کیے'' جرنیل نے کہا اور ان کے لہجے میں اداسی آ گئی اب کس سے اس اعلیٰ معیار کی توقع کی جائے گی؟

میجر اسلم کی رجمنٹ کو ایک چیلنج اور غیر یقینی حالات کا سامنا تھا۔ ان کے پاس افسروں کی کمی تھی، جو تعداد میں 5 ہونا چاہئیں تھے، لہٰذا ان کے نو وارد ماتحت پر کام کا بہت بوجھ آ پڑا تھا لیکن انہوں نے جو ماتحتوں کو شیر کی نظر سے دیکھنے والے فوجی افسروں میں سے ایک تھے، جلد ہی محسوس کرنا شروع کیا کہ وہ ایک محنتی آدمی ہے اور اس میں سیکھنے کا جذبہ اور صلاحیت دوسروں سے زیادہ ہے۔ اس کے اندر بڑا آدمی بننے کی صلاحیت جھلک رہی تھی۔

1948ء میں ایک روز بریگیڈ کمانڈر سے پیغام موصول ہوا کہ حسن ابدال کے گوردوارہ پنجہ صاحب میں ڈٹے ہوئے سینکڑوں سکھوں کو غیر مسلح کر کے انہیں بھارت روانہ کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ حسن ابدال کا یہ گوردوارہ سکھوں کے تاریخی مقامات میں سے ایک اور ان کا ایک اہم مرکز تھا۔ علاقے کے سکھوں نے جیسا کہ ان کی روایت ہے اپنی عبادت گاہ کو ایک قلعہ میں بدل ڈالا تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان

کے پاس کس قدر اسلحہ ہے میجر اسلم ،سیکنڈ لیفٹیننٹ اختر عبدالرحمن کو ساتھ لے کر حسن ابدال پہنچے۔ان کے پاس کچھ رائفلیں تھیں ہلکی مشین گنیں اور 40 سپاہی۔

افسروں نے سپاہیوں کو پیچھے چھوڑا گوردوارے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور سکھ لیڈروں سے کہا کہ وہ ایک خصوصی ٹرین میں سوار ہونے کے لئے عمارت کو خالی کر دیں۔ہم جان دے دیں گے اور گوردوارہ خالی نہیں کریں گے۔انہوں نے صاف اور دوٹوک جواب دیا۔سکھ اس علاقے میں مقیم رہنا چاہتے تھے اور اپنی عبادت گاہ کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے، جہاں کبھی ان کے اولین گرو اور سکھ مذہب کے بانی بابا گرونانک نے قیام کیا تھا۔اختر عبدالرحمن نے اپنے کمانڈر کو ٹھنڈے لہجے میں کہا سکھوں سے کہتے سنا آپ آج کی رات غور کر لیں کل صبح سات بجے ہم دوبارہ آپ کے پاس آئیں گے۔اگر آپ نے امن کے ساتھ عمارت خالی کرنے کا فیصلہ کر لیا تو ہم آپ کو وقار اور عزت کے ساتھ سرحد پار پہنچا دیں گے۔دوسری صورت میں عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی اور آپ کو پتہ چل جائے گا کہ پاکستانی فوج کے ساتھ لڑنے کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے۔

اگلی صبح میجر اسلم اور لیفٹیننٹ اختر عبدالرحمن نے سکھ سرداروں کے ساتھ چائے پی۔بڑے اطمینان سے انہوں نے رائفلیں، بھاری مشین گنیں اور مارٹر توپیں پاکستانی افسروں کے حوالے کر دیں جو بھارتی فوجی دستے پاکستان سے جاتے ہوئے ان کے حوالے کر گئے تھے۔اسلحے کے یہ انبار دیکھ کر پاکستانی دنگ رہ گئے اگر انہیں 40 سپاہیوں کے ساتھ سکھوں کا مقابلہ کرنا پڑتا تو؟ اس وقت کسے معلوم تھا کہ ایک دن نوجوان اختر عبدالرحمن ایشیا کی ایک عظیم سیکرٹ سروس تعمیر کرنے میں بنیادی کردار ادا کرے گا اور اپنے دشمن کے خلاف سکھ کارڈ استعمال کرنے کی منصوبہ بندی کرے گا۔کیا اس آدمی نے اس واقعے سے کوئی نتیجہ اخذ کیا جو چیزوں پر سوچنے والا تھا؟ کیا اسے اس سے یہ سمجھنے میں مدد ملی کہ اسلحہ کی کثرت بجائے خود جنگ کا

فیصلہ کن عنصر نہیں ہے اور دشمن کو دھوکے میں رکھ کر اور خوفزدہ کر کے اپنا ہدف حاصل کیا جا سکتا ہے؟ کیا فیصلہ کن مرحلے میں میجر اسلم کے ٹھنڈے اور پر اعتماد لہجے کا نقش اس کے ذہن پر ثبت ہوا؟ کون کہہ سکتا ہے کہ آدمی کا ذہن کب کتنا حاضر ہوتا ہے اور وہ کب کس چیز سے کتنا سیکھتا ہے۔ لیکن اختر عبدالرحمن کی عسکری زندگی پر غور کیا جائے تو آشکار ہوتا ہے کہ 2 فیلڈ رجمنٹ کی وابستگی کے سالوں نے ان کے عسکری انداز فکر پر گہرے اثرات ثبت کئے۔ ان سالوں میں وہ جس طرح کے مناظر اور واقعات سے گزرے اور اس میں ان کے ساتھیوں اور خود انہوں نے جس طرز عمل کا اظہار کیا بعد کے سالوں میں اس کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں جیسے کوئی خواب دہرایا جا رہا ہو۔ کیا اس آدمی کو بھی اس کا احساس ہوا کہ ایک عظیم الشان کردار ادا کرنے کے لئے جو سینکڑوں سال میں کسی فوجی افسر کو نصیب ہوتا ہے، قدرت انہیں حادثات اور معجزوں سے گزار رہی ہے؟

دو فیلڈ رجمنٹ سے ان کی وابستگی کے اولین دنوں میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی بازگشت برصغیر پاک و ہند کے عسکری اور سیاسی حلقوں میں سالہا سال تک سنائی دیتی رہی۔ باؤنڈری کمیشن کے امن قائم رکھنے اور انتقال آبادی میں مدد دینے والے ادارے کو جن پاکستانی دستوں کی اعانت حاصل تھی، ان میں 2 فیلڈ رجمنٹ شامل تھی۔ اس رجمنٹ کے جوان اور افسر پوٹھوہار کے علاقے سے ہندوؤں اور سکھوں کو سمیٹ کر پر امن طریقے سے بھارت پہنچاتے رہے۔ جیسا کہ شروع میں بتایا گیا ہے اس رجمنٹ کے سارے جوان مسلمان تھے۔ یہ سب کے سب تعلیم یافتہ بھی تھے کہ اس رجمنٹ میں بھرتی کے لئے میٹرک کی سند ضروری تھی۔ معلوم نہیں یہ محض ایک تجربہ تھا اور کہا جاتا ہے کہ برصغیر کی ہندوستانی فوج میں اس نوع کی دوسری کوئی رجمنٹ موجود نہ تھی۔ تعلیم کی اس لازمی شرط کی وجہ سے جس کے لئے شاید کچھ خصوصی مراعات بھی دی گئی ہوں، جوانوں میں اکثر کا تعلق فیروز پور،

لدھیانہ، امرتسر اور جالندھر وغیرہ کے علاقہ سے تھا کہ اس کے علاقہ لوئر مڈل کلاس کسان اور چھوٹے مالکان اراضی کے گھرانوں میں تعلیم کا تناسب نسبتاً بلند تھا۔

تماشا یہ تھا کہ ایک طرف تو اس رجمنٹ کے جوان دشمن ملک میں جا آباد ہونے والوں کو ڈھونڈ، ڈھونڈ کر بڑی حفاظت سے ان کے وطن پہنچا رہے تھے اور دوسری طرف ان کے آبائی علاقوں امرتسر اور جالندھر وغیرہ سے بہو بیٹیوں کو اغوا کیے جانے، گھروں کو نذر آتش کرنے اور اپنے نئے وطن کا رخ کرنے والے قافلوں پر آگ اور لوہے کی بارش کرنے کی خبریں رجمنٹ میں پہنچ رہی تھیں۔ مرنے اور کٹنے والوں میں ان کے عزیز و اقارب شامل تھے۔ کسی کو اس کے بھائی کے قتل ہونے کی اطلاع ملتی، کسی کو ماں کے زندہ جل جانے کی۔ کسی کی بہن کا سراغ نہیں مل رہا تھا اور کسی کے بچے کو کرپان میں پرو دیا گیا تھا۔ سخت فوجی نظم کے تحت زندگی گزارنے والے لوگوں نے ان زخموں کو سہنے، اپنی وردیوں اور بیرکوں میں خون کے گھونٹ پی کر تاب لانے کی کوشش کی لیکن وہ ایسا نہ کر سکے۔ وہ احتجاج جو بلند نہ ہو سکا اور وہ اشک جو بہائے نہ جا سکے، آخر کار طوفان کا پیش خیمہ بنے۔ اگلے دنوں میں اس اضطراب نے برصغیر کی فوجی تاریخ کے دو حیرت انگیز واقعات کو جنم دیا۔ ایک واقعہ میں جانوں کے ضیاع کا کوئی خطرہ نہ تھا اور ہزاروں آدمی بھون ڈالے گئے۔ دوسرے میں ایک تصادم یقینی دکھائی دیتا تھا لیکن کسی کو خراش تک نہ آئی۔ ان دونوں واقعات کا مرکزی کردار لیفٹیننٹ اختر عبدالرحمن تھے تو بہ تو بہ رجمنٹ کے ایک سابق افسر نے اپنے کانوں کی لوؤں کو انگوٹھوں اور شہادت کی انگلیوں سے چھوتے ہوئے کہا میں سوچتا ہوں تو لرز اٹھتا ہوں کہ ہماری زندگیوں میں ایسی چیزیں بھی رونما ہو چکی ہیں اور وہ شخص لیفٹیننٹ اختر کس مٹی کا بنا ہوا تھا، چپ چاپ آنکھوں میں ہنسنے والا، دفتر کی میز پر جھکا اور میدان میں بھاگ دوڑ کرتا ہوا، خطرات سے بھرے میدان میں وہ چیتے کی طرح تھا، آگ میں کود پڑنے والا لیکن حیرت انگیز

منصوبہ ساز، خوف تو جیسے کبھی اس کی کھال میں داخل تک نہ ہوا تھا۔

ریٹائرڈ حوالدار مرتضٰی کو وہ دن خوب یاد ہے جواب راولپنڈی کی ایک فیکٹری میں لیبر افسر کے فرائض انجام دیتا ہے۔ پنڈ دادن کے مالدار ہندوؤں سے بھری ہوئی گاڑی چوکی ریلوے سٹیشن پر روک دی گئی اور ہجوم نے اس پر حملہ کر کے ہزاروں آدمیوں کو ہلاک کر ڈالا، حفاظتی گارڈ کے انچارج اختر عبدالرحمن نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ پیچھے ہٹ جائیں اور بپھرے ہوئے ہجوم کا راستہ نہ روکیں اگر حفاظتی دستے کو ہجوم کا راستہ روکنے کا حکم دیا جاتا کیا وہ اس کی تعمیل کرتے؟ مرتضٰی کا جواب نفی میں ہے صاحب! ہم نے لاشوں سے بھری گاڑیاں دیکھی تھیں، آئے روز ہمارے عزیزوں کے مرنے لٹنے کی خبریں آتی تھیں۔ جب چوکی کے قریب مشتعل ہجوم نے گاڑی کو روکا اور فیصلے کا لمحہ آپہنچا تو لیفٹیننٹ اختر عبدالرحمن نے اپنا دل پتھر کا بنایا اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے، اپنی زندگی کے آخری سالوں تک وہ اس واقعہ کو یاد کرتے رہے اور انہیں اس کا کوئی ملال نہ تھا ان کی رائے یہ محسوس ہوتی تھی کہ یہ تو ایک جنگ کی طرح تھا، جب ایک قوم کے لوگوں کو بے دردی اور سفاکی سے قتل کیا جائے، ان کی عورتوں کی آبروریزی کی جائے، ان کے بچوں کو سنگینوں سے چھید ڈالا جائے اور ان کے بوڑھوں پر گھوڑے چڑھا دیئے جائیں تو اس سے دشمن کے معاملے میں رحم دلی کی امید نہیں کی جاسکتی، ہم نے ہجوم کو نہیں روکا، انہوں نے 1987ء میں اس تاریخی رجمنٹ کی ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہم انہیں روکنا نہیں چاہتے تھے۔

قتل و غارت کے بعد کی بھیانک خاموشی میں اختر عبدالرحمن چوکی ریلوے سٹیشن پر سٹیشن ماسٹر کے کمرے میں بیٹھے تھے اور اپنے افسروں سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب اچانک ایک ہندو فوجی افسر اپنے سپاہیوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ایک دوسری گاڑی کے ساتھ آیا تھا، خون آلود مناظر نے اس کے اندر

انتقام کا طوفان اٹھا دیا تھا اور وہ بدلہ لینے پر تلا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اختر عبدالرحمن کمرے سے لپک کر باہر نکل آئے میں چار دیواری کے اندر بے بسی کی موت نہیں مرنا چاہتا تھا بعد میں اپنے دوستوں کو یہ واقعہ سناتے ہوئے، وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا کرتے تھے۔ پلیٹ فارم پر دو ہندو فوجیوں کے نرغے میں تھا ہیجان میں مبتلا ہندو فوجیوں کے گھیرے میں آئے ہوئے کم گو اور ہیجان کا شکار نہ ہونے والے جواں سال افسر نے چیختے چلاتے دشمن کے جواب میں کوئی وضاحت پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بدلہ لینے کے خواہش مند لوگوں کے پاس بھی تکرار کا زیادہ وقت نہ تھا، چنانچہ ہندو افسر نے اپنے ایک ماتحت کو حکم دیا کہ وہ نشانہ لے کر گولی چلائے اور واقعہ کے ذمہ دار کو قتل کر ڈالے۔ اسی لمحے، ٹھیک اسی لمحے ریکروٹ مرتضیٰ عقب سے نمودار ہوا اس نے ہندو افسر پر رائفل تان کر کہا اگر تم میرے صاب کو قتل کرو گے تو میں تمہارے صاب کو مار ڈالوں گا چہروں پر تنا ہوا انتقام کا رنگ خوف کے پیلے رنگ میں بدل گیا، مرتضیٰ کے انتباہ پر گھیرا ڈالے ہوئے لوگ پیچھے ہٹتے ہوئے دور چلے گئے۔ لیفٹیننٹ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور مرتضیٰ کو یاد ہے کہ جب وہ بولا تو اس کے لہجے میں ہیجان، اضطراب یا خوف کا شائبہ تک نہ تھا۔ لیفٹیننٹ اس وقت کھلکھلا کر ہنس پڑا جب مرتضیٰ نے اسے بتایا کہ ہندو افسر پر تانی جانے والی اس رائفل میں ایک بھی گولی نہ تھی۔

میجر اسلم کے پاس ابھی رجمنٹ میں صرف دو افسر تھے، ان پر کام کا بوجھ لدا رہتا، بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے ہنگامی احکامات موصول ہوتے اور حالات ابھی تک غیر یقینی تھے۔ اس رجمنٹ کو اس وقت ایک اور حادثے نے آ لیا، جب اس کا ہیڈ کوارٹر چکوال میں تھا، ایک بیٹری چکوال، دوسری سوہاوہ اور تیسری منڈی بہاؤالدین، ایک شام ایک جونیئر کمیشنڈ افسر نے جو شام کو بیٹری کے جوانوں کی حاضری لگانے پر مامور تھا، میجر اسلم سے کہا کہ جب شام کو جوان ڈاک بنگلہ میں جمع ہوں تو از راہ کرم وہ خود ہی

حاضری لگانے کی زحمت کریں کہ جوان ان سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ سوال کرنے پر اس نے بتایا کہ یونٹ میں کچھ گڑبڑ ہے اور جوانوں کے تیور بگڑے ہوئے ہیں۔

جوانوں نے اپنے افسر کو بتایا کہ اس وقت جب وہ سکھوں اور ہندوؤں کو حفاظت سے بھارت پہنچا رہے ہیں، فیروزپور، لدھیانہ، امرتسر اور جالندھر سے ان کے عزیزوں کو ذبح کیے جانے کی خبریں موصول ہو رہی ہیں۔ آخر وہ ایسے وقت میں اس نوع کے فرائض کس طرح یکسوئی سے انجام دے سکتے تھے، جب ان میں سے بعض کے اہل خاندان قتل کیے جا چکے ہیں اور باقیوں کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔ جب باوردی جوان اپنا دکھ بیان کر رہے تھے تو ان میں سے بعض کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ جنرل اسلم کہتے ہیں، انہیں یوں لگا کہ اگر ان کے غم کا مداوا نہ کیا گیا تو شاید کچھ دن کے اندر وہ بغاوت کر دیں۔ ماتحتوں کی بغاوت، ایک فوجی افسر کی پیشانی پر بدنما داغ۔

ضابطے کے مطابق انہیں اس سلسلے میں بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو لکھنا چاہئے تھا جو مشترکہ کمیشن سے رابطہ کر کے خطرے میں گھرے ہوئے خاندانوں کو واپس لانے کے لئے ایک فوجی گروپ بھیجنے کی اجازت کا پرمٹ جاری کرتا۔ وہ پہلے اپنے کرنل کو لکھتے اور وہ بریگیڈیئر سے بات کرتا اس میں چھ، سات ہفتے تک صرف ہو سکتے تھے۔ اندیشہ تھا کہ اس عرصے میں منتظر لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے گا۔ میجر اسلم نے اپنے ماتحت اختر عبدالرحمٰن سے مشورہ کیا۔ ایک لیفٹیننٹ کے پاس اس ہیجان میں، اس قدر الجھے ہوئے مسئلے کا کیا حل ہو سکتا تھا؟ لیکن اس کے پاس ایک حل موجود تھا۔ صاف اور انتہائی واضح الفاظ میں اس نے ایک منصوبہ پیش کیا "مجھے کچھ گاڑیاں اور جوان دیجئے، میں عام راستے سے ہٹ کر مشرقی پنجاب میں داخل ہوں گا۔ فیروزپور، لدھیانہ، امرتسر اور جالندھر کے ان مہاجر کیمپوں میں جاؤں گا جہاں ہمارے جوانوں کے عزیز و اقارب پناہ گزین ہیں۔ میں انہیں ان گاڑیوں پر

لا دو کر ایک ہفتے میں پاکستان لوٹ آؤں گا' سوال یہ تھا کہ وہ ضابطے اور اجازت کے بغیر، پرمٹ کے بغیر، ایک دوسرے ملک میں کیسے داخل ہو سکتا ہے۔ اختر کے پاس اس سوال کا جواب موجود تھا۔ کئی فوجی گروپ دونوں ملکوں میں مہاجرین کو جمع کرنے اور سرحد پار بھجوانے میں مصروف تھے۔ تبادلہ آبادی کے اس عظیم ہنگامے میں کس کو شبہ ہوگا کہ ایک گروپ بغیر پرمٹ کے سرحد پار چلا آیا ہے۔ لے دے کے صرف سرحد ہی پر پرمٹ دیکھنے کا تکلف کیا جاتا ہے اور 2 فیلڈ رجمنٹ کا یہ گروپ معمول کا راستہ اختیار نہیں کرے گا لیکن کسی کو شبہ ہو سکتا ہے اور اس کا کوئی بھی نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے؟ تاہم خطرہ مول لینے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ فوجی جوان اشک بار آنکھوں کے سامنے کھڑے تھے اور رجمنٹ کی تباہی کا خطرہ درپیش تھا۔

اپنے ہموار اور پر یقین لہجے کے ساتھ ماتحت نے اپنے افسر کو قائل کر لیا اور کچھ ہی دیر میں وہ جوانوں کے سامنے کھڑے تھے۔ انہوں نے بٹالین کو جس میں مشترکہ چیلنج نے ایک خاندان کی فضا قائم کر دی تھی اپنا منصوبہ بیان کیا اور جوانوں سے کہا کہ جو لوگ لیفٹیننٹ اختر کی قیادت میں اس خطرناک مشن پر روانہ ہونے کے لئے تیار ہیں وہ ایک قدم آگے آ جائیں۔ وہ سب کے سب ایک قدم آگے بڑھ آئے، یونٹ کے خاکروب تک!

سولہ چھوٹے اور بڑے ٹرکوں میں سوار ساٹھ جوان چکوال سے لاہور کے راستے بھارت روانہ ہوئے۔ ان کے پاس چند رائفلیں اور چھ یا سات ہلکی مشین گنیں تھیں۔ ان لوگوں کا انتخاب لیفٹیننٹ اختر عبدالرحمن نے کیا تھا۔ میجر اسلم کو اندیشہ تھا کہ اس اقدام کے نتیجے میں ان کا اور ان کے ماتحت کا کورٹ مارشل ہو سکتا ہے او راس سے بڑھ کر یہ کہ اگر بھارت کی سرزمین پر یہ راز منکشف ہو گیا تو اس سے ملک اور فوج کی بدنامی ہوگی۔ وہ یہ خطرہ بھی محسوس کرتے تھے کہ ممکن ہے اس کے نتیجے میں وطن لوٹتے ہوئے مہاجروں کو قتل کر دیا جائے اور کیمپوں پر قیامت ٹوٹ پڑے

لیکن دوسری طرف ایک فوجی افسر، ایک پاکستانی اور ایک انسان کی حیثیت سے وہ سوچتے تھے کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتے۔ چیلنج اور خطرات کے سامنے وہ بے بسی کا رویہ اختیار نہیں کر سکتے۔ ان کا انداز فکر یہ تھا کہ بغاوت کے نتیجے میں ایک رجمنٹ کے برباد ہو جانے کے مقابلے میں ضابطوں کی خلاف ورزی کا جرم بہت ہلکا ہے۔

''جب اختر روانہ ہو رہا تھا میں نے اس سے کہا کہ اگر کوئی اس سے پوچھے تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ پرمٹ کمانڈنگ افسر کے پاس چکوال میں موجود ہے اور یہ کہ اسے لازمی طور پر اپنا مشن سات دن میں انجام دینا ہے۔ جب وداع کا وقت آیا تو وہ سنجیدہ اور پر اعتماد تھا اور اس نے صرف یہ کہا جناب! ہم جا رہے ہیں'' جواب میں میں نے کہا ''اللہ آپ کے ساتھ ہے۔''

''فوراً ہی میں چکوال میں انگریز کمانڈر رابڈلف کو اطلاع مل گئی اور اس نے مجھے طلب کر لیا۔ اس کے ایجوٹنٹ کو میں نے جواب بھجوایا کہ میں 104 درجے کے بخار میں مبتلا ہوں، تین دن اسی طرح گزرے کہ بلاوا آتا اور میں شدید بیماری کا بہانہ بنا کر تھوڑا سا مزید وقت حاصل کر لیتا سچی بات تو یہ ہے کہ ان سات دنوں میں میں جی رہا تھا نہ مر رہا تھا۔''

آٹھویں دن اختر لوٹ آیا۔ اس کے سولہ ٹرکوں پر سات سو سے زیادہ مہاجر سوار تھے۔ ان میں فوجیوں کے کنبوں کے علاوہ بہت سے دوسرے لوگ بھی تھے۔ ٹرکوں کے اندر جگہ نہ رہی تو اطراف میں بموں پر تختے جمائے گئے اور لوگ ان پر اکڑوں بیٹھ گئے۔ اس نے بتایا کہ وہ واہگہ کے قریب ایک ایسے راستے سے بھارت میں داخل ہوا جہاں کسی سے ان کی مڈھ بھیڑ نہ ہوئی۔ مشرقی پنجاب کے اضلاع میں بلوچ رجمنٹ کے سوا جو سرکاری انتظامات کے تحت مہاجروں کی حفاظت اور واپسی کے فرائض سر انجام دے رہی تھی، اس کا کسی سے آمنا سامنا نہ ہوا۔ حیرت انگیز طور

پر اس پورے سفر میں ایک ٹرک خراب نہیں ہوا۔

سرما کے موسم میں فوجی جوانوں کے کنبوں کے سوا باقی مہاجروں کے لئے راولپنڈی میں ایک کیمپ لگایا گیا۔ فوجی سٹوروں سے راشن چوری کیا گیا۔ جوانوں اور افسروں نے اپنی تنخواہوں میں سے عطیات دیئے۔ زیادہ تر نے اپنی نصف تنخواہ غیر سرکاری طور پر قائم کیے گئے فنڈ میں جمع کرا دی، شہریوں کے دروازے کھٹکھٹا کر کمبل اور رضائیاں جمع کی گئیں، میجر اسلم کی بٹالین سے آٹے کی دس بوریاں مہاجروں کو پہنچائی گئیں۔

کرنل بالڈلف خدا ترس آدمی تھا، وہ معذوروں اور بیماروں کی مدد کرتا دکھائی دیتا تھا لیکن وہ ضابطے کی ایسی سنگین خلاف ورزی کیسے برداشت کر لیتا۔ آخر کار میجر اسلم راولپنڈی پہنچے جہاں ان کے برادر نسبتی (بعد میں بریگیڈیئر) راجہ عنایت اس کے ایجوٹنٹ تھے۔ بریگیڈیئر بالڈلف نے سر اٹھا کس سہمے اور مضطرب میجر کو دیکھا اور کہا۔

IF I DONT TAKE ACTION AGAINST YOU I AM NOT DOING MY DUTY AND IF A COURT MARTIAL YOU THAN I WILL BE RUNNING THE CAREER OF A VERY GOOD OFFICER.

(اگر میں تمہارے خلاف کارروائی نہیں کرتا تو میں اپنے فرائض کی انجام دہی سے کوتاہی کروں گا اور اگر تمہارا کورٹ مارشل کروں تو میں ایک نہایت عمدہ افسر کا کیریئر تباہ کر دوں گا)

میجر اسلم نے انگریز کرنل سے کہا کہ وہ ان کی اجازت سے اپنے اقدام کی وضاحت کرنے کے خواہش مند ہیں۔ انہوں نے ایسا کیا اور پھر مودب ہو کر سوال

کیا سر! اگر آپ ایسی صورتحال سے دوچار ہوتے تو آپ کیا کرتے؟ قدرے تامل کے بعد انصاف پسند آدمی کی آواز میں نرمی آ گئی اور اس نے کہا ہاں! میں وہی کرتا، جو آپ لوگوں نے کیا لیکن پھر فوراً ہی اس نے کہا میں دوسری بار آپ کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ میجر اس وقت کمرے سے باہر نکل رہے تھے جب کرنل بلڈ لف نے انہیں کہا کہ اس حیرت انگیز لیفٹیننٹ کو اس کے کارنامے پر ان کی طرف سے مبارکباد کا پیغام پہنچا دیں۔

اس حیرت انگیز لیفٹیننٹ نے وہ کارنامہ جس طرح انجام دیا، جس کا بہت دن فوج میں چرچا ہوتا رہا۔ راولپنڈی پہنچ کر اس کارنامے کی تفصیلات بیان کرنے اور داد پانے سے زیادہ تھکن اتارنے کی فکر نے آ لیا تھا۔ وہ یوں بھی کم گو آدمی تھا اور جب اس سے پوچھا تو تو اس نے تفصیلات بیان کرنے کی بجائے کم سے کم لفظوں میں جواب دینے پر اکتفا کیا ''ہم سوئے بغیر چلتے رہے'' اس نے کہا کیونکہ ہمارے پاس وقت تھا ہی نہیں اس لئے ہم نے معمول کے کھانے سے بھی احتراز کیا۔ ہمارے پاس جو، چنے اور گڑ تھا، ہم نے اس پر گزارہ کیا یا ان پھلوں پر جو وقت صرف کئے بغیر راستے میں خریدے جا سکے۔ ہم نے صرف فوجیوں کے لواحقین کو ٹرکوں میں جگہ نہیں دی، بلکہ کسی دوسرے کو بھی انکار نہیں کیا۔ مختصر سی روداد بیان کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں سونے کے لئے چلا گیا، جہاں وہ تنہا رہتا تھا کہ ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اکڑ کر نہیں چلا نہ ہی اس نے کوئی بڑ ہانکی۔ اس کے برعکس ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ اپنی ماں کے سکھائے ہوئے سبق اور اپنے خواب کے بارے میں اس کے خاندان کے پاس کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، اس کا ملک ایک ہنگامے سے دوچار تھا اور جنگ سر پر کھڑی تھی۔ ایسے وقت میں، وہ اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچتا تھا؟

باب چہارم

کشمیر .... پہلا معرکہ اور پہلی محبت

کشمیر سپاہی کی پہلی محبت تھی۔ ستمبر 1947ء میں ضابطے کے مطابق سیکنڈ لیفٹیننٹ سے لیفٹیننٹ کے عہدے پر ترقی پانے کے کچھ ہی عرصہ بعد کوہالہ کے پل پر ان کی ڈیوٹی لگائی گئی جہاں انہیں سرحد پار ڈوگرہ فوج کی چوکی پر نگاہ رکھنا تھا۔ میجر راجہ اسلم بھی یہاں کچھ دن ان کے ساتھ رہے وہ ان کے افسر ہی نہ تھے اب ان کے دوست بھی بن چکے ہیں۔ لیفٹیننٹ اختر نے کشمیر کے محاذ پر اپنی پہلی جنگ لڑی اور نہ صرف اپنوں بلکہ دشمن سے بھی خراج تحسین وصول کیا۔ یہاں انہوں نے قبائلی لشکروں کو سرحد پار جاتے دیکھا اور احکامات کے برعکس انہیں کشمیر جانے میں مدد فراہم کی۔ بعد ازاں انہوں نے کشمیر میں بریگیڈیئر اور جنرل کے طور پر بھی فرائض انجام دیئے۔ کشمیر کی وادیوں اور پہاڑیوں پر انہوں نے اپنے سپاہیوں کی تربیت کرتے ہوئے حکم اور حملے کے درمیان کم از کم وقت کا ریکارڈ قائم کرنے کی کوششیں کیں۔ اپنے جوانوں کو اسلحہ سے بہترین طور پر کام لینے اور جنگ کے ہنگام پہاڑوں پر قبضہ کرنے کے ہنر سے آشنا کیا اگر سپاہی سے اس کی خواہش کے بارے میں پوچھا جاتا تو یقیناً وہ کشمیر کے محاذ پر اپنے ہنر اور حوصلے کی آزمائش کرنے کا فیصلہ کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سالہا سال تک ذہنی اور عملی طور پر کشمیر کے محاذ پر ایک فیصلہ کن جنگ لڑنے کی تیاری کر رہے تھے۔

لیفٹیننٹ اختر ایک رات کوہالہ کے پل پر گشت کر رہے تھے جس کے پار پاکستان سے Stand Still (جوں کا توں) کا معاہدہ کر لینے والا ڈوگرہ ہری سنگھ ابھی تک زیر آرائے سلطنت تھا۔ ڈوگرہ فوجیوں نے اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ انہیں پل کے اوپر دکھائی نہیں دینا چاہئے جو پاکستان اور کشمیر کی سرحد متعین کرنے والے دریائے

جہلم پر واقع ہے۔اختر اپنے سپاہیوں کے ساتھ پل سے پیچھے ہٹ آئے لیکن اتفاق سے جب دوسرے روز علاقے کا ڈوگرہ کمانڈر دورے پر آیا تو اس طرف سے نشاندہی کی گئی کہ سرزمین کشمیر کے آغاز کی نشاندہی کرنے والا سنگ میل پل کے پار واقع ہے، لہٰذا دریا اور اس پر بنا ہوا پل پاکستان کی حدود میں واقع ہیں۔ ڈوگروں کے لئے اس دلیل کو ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

کوہالہ کے پل سے متصل بلندی پر بنے پاک فوج کے خوبصورت مرکز میں جہاں آج بھی مختصر سی عسکری چوکی قائم ہے، اگرچہ دو چھوٹی توپوں چند مشین گنوں اور گنتی کی رائفلوں کے سوا کچھ نہ تھا، سپاہیوں کی تعداد بھی 100 سے کم تھی لیکن پاکستانی فوجیوں کے پر اعتماد اور جارحانہ رویے نے ڈوگروں کو مرعوب کئے رکھا۔انہوں نے عید الضحیٰ کے روز کچھ بکرے تحفے کے طور پر بھیجے اور یہ اشارہ دیا کہ وہ تصادم نہیں چاہتے، اگرچہ بعد ازاں ایک رات انہوں نے پل اڑانے کی کوشش بھی کی کہ وہ پاکستانی دستوں سے خوفزدہ تھے جو ان کے خیال میں سے کسی وقت ان پر حملہ کر سکتے تھے اس ناکام کوشش کے بعد وہ اس وقت اپنی چوکی چھوڑ کر فرار ہو گئے جب کشمیر کو بھارت میں شامل کرنے کی کوششوں کے بعد جنگ آزادی کا آغاز ہو چکا تھا۔

اب ایبٹ آباد اور مری کے راستے قبائلی لشکر رات کی تاریکی میں کشمیر جانے لگے۔ انگریز کمانڈر انچیف اور بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کے انگریز افسروں کی طرف سے کوہالہ کی چوکی پر ہدایات موصول ہوئیں کہ قبائلیوں کو سرحد پار جانے کی اجازت نہ دی جائے نہ صرف یہ بلکہ ہر قسم کی ٹریفک روک دی جائے۔ لیفٹیننٹ اختر دن کی روشنی میں تو ان ہدایات کی پابندی کرتے لیکن جب رات کی تاریکی چھا جاتی اور جہلم کے دونوں طرف سرد ہوائیں بہنے لگتیں تو وہ پل کی زنجیر ہٹا کر اسے آمد و رفت کے لئے کھول دیتے۔صبح کے چار بجے تک، جب فجر کی اذان میں تھوڑا سا وقت باقی ہوتا یہ زنجیر کھلی رہتی جیسا کہ عمر بھر ان کا مزاج رہا وہ کشمیر کی جنگ پر کم ہی اظہار خیال

کرتے اور جب بولتے تو زیادہ تر جنگ کے عملی پہلوؤں پر بات کرتے۔ وہ برسر جنگ کشمیریوں کی عملی مدد کرنے کے بارے میں سوچتے رہتے۔ بعض اوقات چوکی والی پہاڑی پر یا پل پر گشت کرتے ہوئے وہ ٹکٹکی باندھ کر سرحد پار دیکھنے لگتے اور اس عالم میں دنیا و مافیہا سے بےخبر ہو جاتے۔ بعد میں بھی جب انہوں نے باغ اور مری میں اپنے عسکری فرائض انجام دیئے، انہیں کئی بار کشمیر کی سرحدوں پر کھڑے، سرحد پار کی روشنیوں کو خواب کے سے عالم میں دیکھتے ہوئے پایا گیا۔ وہ اپنے خواب میں جیئے لیکن اپنے جذبات پر قابو رکھنے والے آدمی تھے لیکن راوی کا بیان ہے کہ ایک بار سرحد کے اس طرف دیکھتے ہوئے ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ باوردی آدمی نے اپنے آنسو پونچھے اور زبان سے کچھ نہ بولا۔ اس کی دنیا اس کے من میں آباد رہتی تھی۔ وہ اس کی روشنیوں، تاریکیوں اور ویرانیوں میں تنہا راہیں تلاش کرتا اور اپنے احساسات پر ایک چوکیدار کی طرح نگراں رہتا۔ وہ اپنے جذبات میں بہت کم کسی کو شریک کرتا تھا۔

اہل کشمیر اور قبائلی آزادی کی جنگ جاری رکھے ہوئے تھے لیکن اب راولپنڈی کے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے کوہالہ کی چوکی پر وقفے وقفے سے یہ پیغام موصول ہوتا رہا کہ پل پر سے قبائلیوں کو گزرنے نہ دیا جائے پھر ایک شام ایک انگریز بریگیڈیئر بنفس نفیس کوہالہ پہنچ گئے۔ انہوں نے چوکی پر شام کی چائے پی اور کچھ دیر سوچتے رہے، پھر انہوں نے کہا مجھے اطلاع ملی ہے کہ آپ لوگ رات کو دس بجے پل کھول دیتے ہیں راجہ میجر اسلم نے تردید کی اور کہا کہ وہ احکامات کی پابندی کرتے ہیں۔ وہ کچھ دیر خاموش سا بیٹھا رہا۔ معمولاً جب کبھی دورے پر آتا تو رات کی تاریکی گہری ہونے سے پہلے واپس چلا جایا کرتا تھا لیکن آج اس کے تیور بدلے بدلے سے دکھائی دیتے تھے۔ کچھ دیر بعد اس نے پھر کہا کہ آپ لوگ احکامات کی خلاف ورزی کر رہے ہیں کیا تماشا تھا کہ ایک ملک اپنی اہم ترین جنگ لڑ رہا تھا اور پیشہ ور فوج

کے غیر ملکی افسر اسے غیر جانبدار اور غیر متعلق رکھنے پر مصر تھے۔ ان کے پاکستانی ماتحت علی الاعلان ان احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ ملک کی سلامتی کے تقاضے پورے کرنے پر مجبور ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایسا کہنے کی جرأت کرتا تو ضابطے کے مطابق اس کا کورٹ مارشل کیا جا سکتا تھا۔

بریگیڈیئر نے دس بجے رات کا کھانا کھایا اور کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ سوال یہ تھا کہ اگر اس نے رات یہیں بسر کرنے کا فیصلہ کیا تو کیا ہوگا۔ قبائلیوں کے ایک دستے کو آج رات یہیں سے گزرنا تھا ان کے ساتھ پہلے سے یہ بات طے تھی جب وہ اچانک نمودار ہوں گے روکے جانے پر واویلا کریں گے اور وعدہ یاد دلائیں گے تو کیا ہوگا؟ وہ پیشہ ور فوجی نہیں تھے کہ اشاروں میں بات سمجھائی جا سکتی، پھر زبان کی وجہ سے ابلاغ کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ تو کیا آج بھید کھل جائے گا؟ کیا لیفٹیننٹ اور میجر کی جواب طلبی ہوگی اور انہیں فوج سے رخصت کر دیا جائے گا۔

راجہ اسلام نے لیفٹیننٹ کو ایک طرف لے جا کر اپنی تشویش سے آگاہ کیا اور اس سے مشورہ طلب کیا۔ میجر اپنے ماتحت کا جواب سن کر ششدر اور بھونچکا رہ گیا۔ یہ ملک کی آزادی اور بقا کا سوال ہے اس نے کہا قبائلی ہمیشہ کی طرح آج رات بھی پل پار کریں گے جہاں تک بریگیڈیئر کا تعلق ہے اسے اس عمل میں رکاوٹ ڈالنے کا کوئی حق نہیں۔ اگر وہ اپنی بات پر مصر رہا تو میں قومی مفاد کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے والے اس غیر ملکی کو قتل کر دوں گا۔ پھر ہمیشہ کے ٹھنڈے لہجے میں اس نے کہا اس ہنگامے میں کون جانتا ہے کہ کس پر کیا بیتی ہے ہمیشہ کی طرح اس کے پاس اب بھی سوال کا جواب موجود تھا، ہمیشہ کی طرح وہ اب بھی خطرے مول لینے پر تیار تھا اور وہ ہمیشہ کی طرح ہیجان سے پاک تھا۔

پاک بھارت تصادم کا منظر دیکھتے ہوئے انگریز افسر جو اپنے انگریز کمانڈر انچیف سے ہدایات وصول کرتے تھے، اس صورتحال کے بارے میں کس طرح سوچتے

تھے؟ روایت کے مطابق انگریز کمانڈر انچیف نے پاکستانی فوجوں کو کشمیر کی طرف حرکت دینے کے بارے میں قائداعظم کے احکامات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ دوسری طرف انگریز افسر بخوبی جانتے تھے کہ وہ اپنے ماتحتوں کو غیر جانبدار رہنے پر مجبور نہیں کر سکتے، چنانچہ وہ اکثر چشم پوشی سے کام لیتے۔ اس انگریز بریگیڈیئر نے بھی آخر کار یہی کیا۔ رات کا کھانا کھانے کے کچھ دیر بعد وہ واپسی کے لئے تیار ہو گیا اور جاتے ہوئے اس نے رازداری کے انداز میں میجر اسلم سے کہا پل کو زیادہ دیر کے لئے مت کھولا کرو۔

میجر اسلم اب اپنے ماتحت کے مداح ہوتے جا رہے تھے، اگرچہ وہ اسے فوجی ضابطوں کی یاددہانی کراتے اور ان سے انحراف پر ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتے لیکن اب وہ محسوس کرنے لگے تھے کہ وہ ایک غیر معمولی آدمی ہے اور ایسے لوگ محض ضابطوں کی پاسداری کے لئے نہیں بنے ہوتے۔ ایک اور واقعہ نے انہیں اس بارے میں اپنی رائے کو پختہ تر کرنے کا موقعہ دیا اس رات وہ مری میں تھے جب انہیں اس بارے میں پتا چلا لیفٹیننٹ اختر معمول کے مطابق کوہالہ کے پل پر پہرہ دے رہے تھے کہ بھارتی طیارے فضا میں نمودار ہوئے اور انہوں نے پل کا نشانہ لے کر بم گرائے کہ سرزمین کشمیر تک پاکستانیوں کی رسائی مشکل بنا دی جائے۔ پل تو محفوظ رہا لیکن کئی بم اس سے متصل بازار میں گرے، جہاں 43 سال گزر جانے کے باوجود آج بھی وہی مختصر سی آبادی موجود ہے۔ ایک آدھ بم دریا میں گرا اور کچھ پہاڑوں پر ضائع ہو گئے۔ بازار میں گرنے والا 25 پاؤنڈ کا بم ایک بھاری گینڈ کی طرح سڑک پر آ رہا اور پھٹا نہیں۔ بھارتی جہازوں کے واپس چلے جانے کے بعد دیہاتی بھاگتے ہوئے پل کی طرف گئے اور انہوں نے لیفٹیننٹ کو اس بم کے بارے میں بتایا جیسا کہ اس کا مزاج تھا اس نے ان کی بات توجہ سے سنی اور پھر معمول کے انداز میں اس طرف بڑھا جہاں بم پڑا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے

دوسروں کو پیچھے رہنے کے لئے کہا اپنی رائفل ایک سپاہی کو تھمائی اور خاموشی سے آگے بڑھا، پھر دونوں ہاتھوں سے بم اٹھا کر دریا کی طرف اچھال دیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ دوبارہ پل پر گشت کرنے میں مصروف تھا۔

اس واقعہ پر لیفٹیننٹ کے افسر کا رد عمل کیا تھا؟ بوڑھا جرنیل آج اپنے ماتحت کی شجاعت کو خراج تحسین پیش کرتا ہے لیکن اس کا کہنا ہے کہ جب اسے مری میں ٹیلی فون پر اس بارے میں بتایا گیا تو اس نے سختی سے لیفٹیننٹ کو ڈانٹا اور کہا برخوردار تم نے اپنی جان کو خطرے میں ڈالا اپنے سپاہیوں اور بازار میں کھڑے تماشائیوں کی زندگیوں کو بھی۔ اگر بم پھٹ جاتا تو کیا ہوتا میں معافی چاہتا ہوں جناب اس نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ اگر دوسری بار ایسا ہی واقعہ پیش آتا تو کیا وہ ضابطے کی پابندی کرتا اور بم سے دور کھڑا رہتا؟ وہ ایک نافرمان آدمی نہیں تھا شاید اب کی بار اس کی جدت طبع کوئی دوسری راہ تلاش کر لیتی اور شاید اب کی بار وہ جواب طلبی سے بچنے کی کوشش کرتا۔

جنگ جاری تھی اور کوہالہ کی چوکی سے خاموشی کے ساتھ مجاہدین کی مدد کا عمل بھی ایک رات مسلم کانفرنس کے سربراہ اور کشمیر کی جنگ آزادی کے سیاسی سالار چودھری غلام عباس خاموشی سے کوہالہ پہنچے اور انہوں نے سوال کیا کہ فوجی افسران کیا مدد کر سکتے ہیں؟ انہیں پل سے کچھ فاصلے پر دریا پار کرنے کا مسئلہ درپیش تھا چنانچہ ان کے لئے راتوں رات رسیوں کا پل بنایا گیا۔ انہیں کوہالہ کی ڈوگرہ چوکی سے فرار ہونے والوں کی باقی ماندہ رائفلیں بھی دی گئیں۔ کشمیریوں نے اپنی آزادی کی جنگ اسی بے سروسامانی اور پاک فوج کی ایسی ہی خاموش اور محدود امداد سے لڑی۔ آزاد کشمیر کے صدر سردار عبدالقیوم خاں جو تب چودھری غلام عباس کے شمشیر زنوں میں سے ایک تھے کبھی کبھی مظفر آباد کے ایوان صدر سے کار میں راولپنڈی آتے ہوئے کچھ دیر کے لئے کوہالہ سے آگے جہلم کے اس کنارے پر رک جاتے ہیں جہاں سے سرد

راتوں میں رسیوں کے اس پل کی مدد سے اور کبھی اس کے بغیر دریا کو پار کرکے اپنے دن پاکستانی جنگل میں گزارہ کرتے تھے۔ کیا انہیں یاد ہے کہ ادھر کچھ فاصلے پر پاک فوج کا ایک لیفٹیننٹ راتوں کو کوہالہ کے پل پر ٹہلا کرتا تھا اور خاموشی سے کشمیریوں کی مدد کرتا تھا؟

جنگ پھیلنے لگی اور پل سے آگے کا علاقہ آزاد کرالیا گیا تو لیفٹیننٹ اختر اور میجر اسلم کبھی کبھار بے تاب ہوکر آگے نکل جاتے کبھی کبھار ان کے پاس اسلحہ اور دوسرا سامان بھی ہوتا۔ وہ جدید جنگ کے قرینوں سے نا آشنا قبائلیوں کی رہنمائی کرنے اور انہیں مشورہ دینے کے لئے بے چین ہوتے۔ فوجی ضابطے ان کی راہ میں رکاوٹ تھے۔ وہ کبھی اس رکاوٹ کے ادھر اپنے اضطراب کے ساتھ جمے رہتے اور کبھی اس قانون نہ پا کر کسی جیپ یا ٹرک میں اس طرف نکل جاتے۔ اسی عالم میں ایک بار وہ لوٹ کر آئے تو انہوں نے بریگیڈ کمانڈر کو انتظار کرتے پایا اس نے ترپال کے نیچے بڑی مشین گن کو دیکھا اور برہم ہوگیا۔ وہ ان کا سالار تھا لیکن یہ اس کی جنگ نہیں تھی۔ وہ چیخا چلایا اور اس کے ماتحت خاموشی سے سنتے رہے۔ آخر کار وہ بھی خاموش ہو رہا اور واپس چلا گیا۔ اگر لیفٹیننٹ اپنے جذبات کا اظہار کرنے والا آدمی ہوتا تو شاید وہ کوہالہ کی پہاڑی پر کھڑا ہو کر چیخ اٹھتا کہ یہ دفاع وطن کی کیسی جنگ ہے جو اتنی بے بسی اور لاچاری سے لڑی جارہی ہے؟ یہ کیسا عجیب زمانہ ہے کہ اپنے وطن سے محبت کے جرم کو چھپانا اور ایک غم کی طرح پالنا پڑتا ہے، لیکن وہ اپنے احساسات کو الفاظ میں نہیں عمل میں بیان کرنے والا آدمی تھا اور پھر عمل کا لمحہ آپہنچا، جب اس کے دست وبازو آزاد تھے، اس کی پرواز خیال آزاد تھی، اسے ایک معرکے نے مدعو کرلیا، اس کا حوصلہ اور ہنر آزمائش کی سان پر تھے۔

کشمیر کی پانڈو ٹیکری کے اس معرکے سے پہلے جس نے لیفٹیننٹ اختر کو ایک بہادر اور پرجوش افسر کی حیثیت سے فوج میں متعارف کرایا اور اگلے چار عشروں کے

لئے ایک بے مثال عسکری کیریئر کی بنیاد فراہم کی، انہیں ایک ایسی ذمہ داری سونپی گئی جس کا ان کے فوجی ریکارڈ میں کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ مہاجروں کی تلاش کے لئے پوٹھوہار کے علاقے میں آنے والی دو سکھ کمپنیاں اپنے مشن کی تکمیل کے بعد واپس جا رہی تھیں۔ فوج کے جاسوسی ذرائع نے مطلع کیا کہ واپس جانے کے مغضوب الغضب سکھ فوجی راستے میں گڑبڑ پھیلانا چاہتے ہیں۔ ایک دن آدھی رات کو جہلم سے سر ظفر اللہ کے برادر نسبتی جنرل نذیر نے 2 فیلڈ رجمنٹ کے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو یہ اطلاع دیتے ہوئے کہا کہ امرتسر جانے والی یہ سکھ کمپنیاں راستے کی بعض شہری تنصیبات کے علاوہ سرائے عالمگیر سے آگے دریائے جہلم پر رسول ہیڈ ورکس کو تباہ کرنا چاہتی ہیں۔

یہ 1948ء میں موسم بہار کے دن تھے۔ لیفٹیننٹ اختر کو سوتے میں بیدار کر کے کہا گیا کہ وہ 60 سپاہیوں کے ساتھ فوراً سکھ کمپنیوں کے تعاقب میں روانہ ہو جائیں پھر کمانڈر نے قدرے متفکر ہو کر کہا اختر ان کی تعداد آپ سے دوگنا 120 ہے۔ ان کے پاس بھاری مشین گنیں اور مارٹر توپیں ہیں جبکہ ہم آپ کو ہلکی مشین گنوں سے زیادہ کچھ نہیں دے سکتے۔ کمانڈر کو آدھی رات کو یہ گفتگو آج بھی یاد ہے سر! آپ کوئی فکر نہ کریں اختر نے کہا ہم ڈٹ کر مقابلہ کریں گے لیکن مقابلے کی نوبت نہیں آئی۔ اپنے سپاہیوں، گاڑیوں اور ہلکی مشین گنوں کے ساتھ اختر سکھوں کا تعاقب کرتے رہے۔ انہوں نے فاصلہ برقرار رکھا اور ان کی نگرانی کرتے رہے۔ وہ راتوں کو رک جاتے، جنگل میں برا بھلا کھانا پکا کر کھاتے اور دشمن پر نگاہ رکھتے معلوم نہیں سکھوں نے تخریب کاری کا کوئی منصوبہ ہی نہیں بنایا تھا یا بعد ازاں انہوں نے ارادہ بدل دیا۔ بارہ دن کے بعد اختر اپنے سپاہیوں کے ساتھ لوٹ آئے، جب سکھ پاکستانی سرحد عبور کر کے بھارت میں داخل ہو رہے تھے۔ راولپنڈی پہنچ کر اپنے کمرے میں جرابیں اتارتے ہوئے لیفٹیننٹ اختر نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کیا

ہم یونہی میدانوں میں مارے پھریں گے؟ کیا ہماری قسمت میں کوئی مقابلہ نہیں لکھا؟

رجمنٹ کا کمانڈر اس وقت ایبٹ آباد کی کاکول اکیڈمی میں لیکچر دینے گیا ہوا تھا جب اسے حرکت کرنے اور کشمیر پہنچنے کا حکم ملا۔ انگریز کرنل نے یہ حکم دیتے ہوئے بتایا کہ وہ پاکستانی سرحد پار کر کے کشمیر نہیں جائے گا۔ محمد خان کیانی نامی ایک پاکستانی میجر (بعد میں بریگیڈیئر) کو قیادت کی ذمہ داری سونپی گئی اور رجمنٹ کھاریاں کے راستے، میر پور سے آگے کوٹلہ اعوانان کی طرف روانہ ہوگئی۔ رجمنٹ کو تیاری کے لئے صرف دو گھنٹے کا وقت دیا گیا۔ پیغام واضح تھا کہ یہ جنگ کی تیاری ہے۔

لیفٹیننٹ اختر اولا توپ خانے کے ساتھ عقب میں تھے لیکن پھر انہیں آگے بڑھنے کا حکم ملا، آگے اور آگے اور آگے۔ اب معرکہ کارزار گرم ہونے والا تھا اور مشکل ذمہ داریاں زیادہ ذمہ دار اور اہل لوگوں ہی کو سونپی جا سکتی تھیں۔ اختر بہترین لوگوں میں سے بہترین سپاہی تھے، لہٰذا جب جولائی 1948ء میں پانڈو کی دس ہزار فٹ بلند پہاڑی پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تو وہ اس منصوبے پر عملدرآمد کرنے والے بنیادی لوگوں میں سے ایک تھے۔

قبائلی یلغار کی وجہ سے دشمن پہلے ہی بے حد چوکنا تھا لہٰذا اس حملے کے لئے معمول سے کہیں زیادہ رازداری کی ضرورت تھی۔ ایک سے زیادہ گشت کرنے والے دستے اگلے علاقوں میں بھیجے گئے اور ضروری معلومات حاصل کر لی گئیں۔ کسی جنگ میں رزم آرا لشکروں کے پاس منصوبہ بندی کے لئے کبھی کافی وقت نہیں ہوتا اور یہ جنگ تو ایک عجیب افراتفری کے عالم میں لڑی جا رہی تھی، ناکافی سپاہ، محدود اسلحہ اور گولہ بارود، انتہا تو یہ ہے کہ بلندی کی اس جنگ کے لئے پاک فوج کے پاس کافی اور موزوں وائرلیس سیٹ بھی موجود نہ تھے۔ توپ خانے کے ذریعے متوقع نشانوں پر حملوں کے لئے جسے اس معرکے میں اہم ترین کردار ادا کرنا تھا، اعداد و شمار مرتب کر

لئے گئے۔ 101 بریگیڈ کمانڈر اکبر خاں نے راتوں کو جاگ کر اپنے ناجین کی مدد سے پاکستانی دستوں کی حکمت عملی اور دشمن کے متوقع ردعمل پر غور و خوض کیا۔ قبائلیوں کی آفریدی فورس کے علاوہ تین آبز رور کمپنیاں اے بی اور سی تشکیل دی گئیں۔ لیفٹیننٹ اختر اے کمپنی کے ساتھ تھے۔ بریگیڈ اکبر خان کی تحریری یادداشت کے مطابق میجر قیوم شیر بعد میں بریگیڈیئر کی قیادت میں آگے بڑھنے والی بی کمپنی دشمن کی زبردست گولہ باری کی زد میں آ گئی، کئی مجاہد شہید ہوئے اور کمپنی کی پیش قدمی دم توڑ گئی۔ اب سارا بار اے اور سی کمپنی پر آ پڑا تھا۔ اس کے جانبازوں کو جنہیں ہر قیمت پر فتح حاصل کرنے کے لئے کہا گیا تھا صورتحال کی نزاکت کا احساس تھا۔ یہ صبح صادق کا وقت تھا جب دونوں کمپنیوں کے جانباز پانڈو گاؤں میں داخل ہوئے۔ اے کمپنی نے یہاں پوزیشن سنبھال لی اور سی کمپنی نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تب یکایک دشمن نے ان بہادروں پر فائر کھول دیا۔ اچانک شروع ہونے والی گولہ باری اتنی غیر متوقع تھی کہ اس سے ایک افراتفری پھیل گئی۔ کمپنیوں کا باہمی رابطہ ٹوٹ گیا اور فورس کمانڈر سے بھی ان کا ابلاغ ختم ہو گیا اب وائرلیس پر لیفٹیننٹ خاں زماں کے سوا کسی کی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ اس نے عقب میں موود توپ خانے سے فائر مانگا چنانچہ پاکستانی دستوں نے بھرپور گولہ باری کی۔

فورس کمانڈر تشویش کا شکار تھے کہ لیفٹیننٹ اختر کہاں گئے؟ دن بھر کا رابطہ اپنی فوج سے کٹا رہا جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا ان کا وائرلیس سیٹ خراب ہو گیا تھا پھر یکایک وائرلیس پر ایسی مدھم سی آواز سنائی دی جس کی شناخت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ بے تدبیری یہ تھی کہ کوئی خفیہ شناختی لفظ (کوڈ ورڈ) بھی مقرر نہ کیا گیا تھا۔ مدھم آواز میں بولنے والے نے بتایا کہ وہ لیفٹیننٹ اختر ہے اور اس نے دشمن کے مورچوں پر گولہ باری کی درخواست کی۔ اگلے 45 منٹ تک پانڈو کی پہاڑی اور گرد و نواح کا علاقہ پاکستانی توپ خانے کی گولہ باری سے لرزتا رہا۔ یہ کمال مہارت اور ہم آہنگی

سے کی جانے والی گولہ باری تھی بعد ازاں ایک افسر نے کہا اس گولہ باری کی آڑ
میں لیفٹیننٹ اختر اور خان زماں آگے بڑھتے چلے گئے۔ اس روز ہمارے توپ
خانے اور ان بہادر نوجوانوں نے ایسی بے مثال کارکردگی کا مظاہرہ کیا کہ گنرز ہمیشہ
ان پر فخر کرتے رہیں گے 24 گھنٹے جاری رہنے والی لڑائی 27 جولائی کو ختم ہوگئی،
جب پانڈو کی ٹیکری پر پاکستانی پرچم لہرا دیا گیا ان رفعتوں پر یہ پرچم آج بھی لہراتا
اور مادر وطن کے شہید سپوت کی یاد تازہ کرتا ہے۔ بیشتر فوجی افسر کہتے ہیں کہ اگر اس
پہاڑی پر قبضہ نہ کیا جاتا، جہاں سے دشمن اب پاکستانی توپ خانے کی زد میں تھا تو
گردوپیش کا بہت سا علاقہ پاکستان کے ہاتھ سے نکل جاتا۔

ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اگر ایک فوجی اپنے وطن کے لئے لڑتا
اور کامیابیاں حاصل کرتا ہے تو اس میں کمال اور کارنامے کی کیا بات ہے کہ اسے ایسا
کرنے کی تنخواہ دی جاتی ہے۔ اخبارات کے لئے تبصرے لکھنے اور ہوٹلوں میں گپ
اڑانے والے زود رنج دانشور نہیں جانتے کہ انسانی زندگی ایک ایسی چیز ہے جس کی
قیمت ادا نہیں کی جا سکتی۔ جب جنگ کا میدان گرم ہوتا ہے فضا بارود کی بو، آگ اور
لوہے سے بھر جاتی ہے تو یہ سکھائے پڑھائے سبق نہیں جو آدمی کے کام آتے ہیں۔
اس وقت صرف وہی سرخرو ہوتا ہے جو خوف اور کنفیوژن میں اپنا ذہن اور حوصلہ
بروئے کار لا سکتا ہے، جو جان نچھاور کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔

اس روز جب دشمن کی پوزیشنوں کا جائزہ لینے کی بے تابی میں اختر اپنے ساتھیوں
سے بچھڑ کر آگے چلے گئے تھے تو یونٹ میں ان کی شہادت کا اعلان کر دیا گیا تھا بعد
میں وہ ہنستے ہوئے کہا کرتے تھے میں تو اپنی زندگی ہی میں شہادت کا اعزاز حاصل
کر چکا ہوں۔ شہادت کم گو آدمی کے غور و فکر اور اظہار خیال کا ایک پسندیدہ موضوع
تھا، اسی حوالے سے انہوں نے اگلے چار عشروں میں سینکڑوں ہزاروں بار اپنے
ماتحتوں کو یہ پیغام دیا کہ دنیا کی کوئی قوم مسلمانوں سے بہتر سپاہی پیدا نہیں کر سکتی

23 جون 1988ء کو جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے رسالپور میں پاک فضائیہ کے فلائنگ اور انجینئرنگ کیڈٹوں کی پاسنگ آؤٹ پریڈ سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا

ایمان نہ صرف ہر قسم کی رہنمائی کا سرچشمہ ہے بلکہ امن ہو یا جنگ مسلمان سپاہی کو فعال بنانے کا واحد جذبہ محرکہ بھی یہی ہے۔

مدتوں بعد بھی پانڈو کے محاذ پر اپنی اکثریت کے باوجود پسپا ہونے والے 163 سکھ بریگیڈ کے کمانڈر سے لندن میں اچانک ان کی ملاقات ہوئی تو اس نے بے اختیار پاکستان کے لئے دس ہزار فٹ اونچی چوٹی فتح کرنے والوں کے حوصلے اور ہمت کو خراج تحسین پیش کیا اس نے کہا تم فتح کے مستحق تھے گنتی کی جو چند توپیں پاکستانی دستوں کے پاس تھیں وہ ان بلندیوں پر کس طرح پہنچائی گئی تھیں؟ 41 سال پرانی یادیں تازہ کرتے ہوئے توپ خانے کے ایک سپاہی نے بتایا ہم نے ان کے پرزوں کو الگ الگ کیا اور کندھوں پر اٹھا کر اوپر لے گئے۔ یہ اس قدر پر مشقت کام تھا کہ علاقے کے اس سرد موسم میں ہماری وردیاں پسینے میں بھیگ گئیں لیکن اس روز ہم پر شوق اور جنون کا ایک عجیب عالم طاری تھا اس روز تو کوئی پہاڑ بھی ہمارا راستہ نہیں روک سکتا تھا۔

پاکستان کے دورے پر آنے والے غیر ملکی فوجی افسروں کو جنہیں پاکستان کے عسکری نظام اور فوجی تاریخ سے متعارف کرانا مقصود ہو، دوسرے مقامات کے علاوہ پانڈو کی اس ٹیکری پر بھی لے جایا جاتا ہے۔ ترکی، آسٹریلیا اور امریکہ سے آنے والے ہمیشہ حیرت سے سوال کرتے ہیں کہ ان بلندیوں پر توپیں کیسے پہنچا دی گئیں؟

جولائی 1948ء میں پانڈو کے محاذ پر سپاہی کے دل میں کشمیر سے محبت کا جو اکھوا پھوٹا تھا وہ رفتہ رفتہ تناور درخت بن گیا۔ پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو بھی اس راز سے آگاہ تھے کہ یہ شخص کشمیر کے محاذ پر ایک فیصلہ کن معرکے کی بے

تاب آرزو اپنے دل میں آباد کئے ہے۔ چنانچہ جون 1976ء سے 1976ء کے آخری دنوں تک وہ جب بھی مری گئے جہاں بریگیڈیئر اور بعد ازاں میجر جنرل اختر عبدالرحمن مری کے جی او سی کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے تھے، تو وہ انہیں بلا بھیجتے۔ بھٹو گرما کی شدت میں تفریح، غور و فکر اور بسا اوقات اہم شخصیتوں سے ملاقاتوں کے لئے مری کا رخ کرتے تھے لیکن وہ عام طور پر اس کمانڈر سے گفتگو کا وقت ضرور نکال لیتے جو محاذ کشمیر کے حوالے سے کمال واقفیت اور مہارت سے گفتگو کرتا تھا۔ مسٹر بھٹو یہ جاننے کی کوشش کرتے کہ اگر بھارت اس سرحد پر حملہ کر دے تو پاکستان کی حکمت عملی کیا ہوگی اور پاک دستوں کی کارکردگی کیسی رہے گی اپنے مخالفین کو فنا کرنے کی آرزو رکھنے والے متنازعہ بھٹو کے مخالفین ان پر بھارت کے معاملے میں نرم گوشہ رکھنے کا الزام عائد کرتے رہے ہیں۔ بھٹو نے اپنے اقتدار کے لئے خواہ کیسے ہی کھیل کیوں نہ رچائے ہوں لیکن خطرات مول لے کر پاکستان کا ایٹمی پروگرام شروع کرنے والا یہ سیاستدان پاکستان کے روایتی دشمن کے بارے میں اپنی بیٹی سے مختلف رویہ رکھتا تھا۔

باب پنجم

جنت

1945ء میں اختر عبدالرحمٰن نے ایم اے کا امتحان پاس کا ے تو ان کی عمر صرف 20 سال تھی، اپنے بیشتر ہم جماعتوں سے دو سال کم ایم اے کا امتحان دینے کے بعد جوان سال اختر نے سرخوشی اور کسی قدر لاابالی پن کے چند ماہ گزارے۔ اپنی بواجی کی نگران آنکھوں تلے جو تعلیم کو بے حد اہمیت دیتی تھیں۔ اس نے زندگی کے کڑے امتحان کا ایک مرحلہ سر کرلیا تھا اور اب بہت دنوں تک کرنے کے لئے کچھ نہ تھا۔ ایک ایسے آدمی کے لئے جو ہمیشہ مصروف رہنے کا عادی تھا اور جو ورزش اور شام کی مختصر سی چہل قدمی کے سوا کبھی کسی تفریح کا عادی نہ تھا، یہ ایک مختلف صورتحال تھی، نوجوان آدمی نے امتحان کے نتائج کا انتظار کرنے کے لئے کچھ دن لاہور میں اپنے دوستوں کے ساتھ گزارے اور پھر اپنے گاؤں میں بواجی کے پاس چلا گیا۔

امتحان کا نتیجہ معلوم کرنے کے لئے، وہ ایک بار پھر گاؤں سے لاہور آیا۔ جہاں اخبار تک دستیاب نہ ہوتا تھا۔ چند دن کے بعد بواجی کو اختر کا خط ملا کہ ایم اے اقتصادیات کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کرنے کے بعد وہ ڈی ایس پی بھرتی ہو گیا ہے اور ان دنوں تربیت کے مراحل سے گذر رہا ہے۔ اس نے لکھا تھا کہ جیسے ہی چھٹی ملے گی وہ گھر آئے گا اور اپنی بوا کو بتائے گا کہ اس نے پولیس میں بھرتی ہونے کا فیصلہ کیوں کیا؟

بوا نے خط پڑھا اور گم سم سی بیٹھی رہیں۔ انہیں اس سے واضح طور پر صدمہ پہنچا تھا۔ اگر اس لڑکے کو تھانیدار ہی بننا تھا تو اسے گورنمنٹ کالج ایسے ادارے میں اس چاؤ اور اہتمام کے ساتھ تعلیم دلانے کی کیا ضرورت پڑی تھی۔ بیٹا اب بڑا ہو گیا تھا اور اس نے اپنی مرضی سے زندگی کا ایک اہم فیصلہ کرلیا تھا بوا یہ گوارہ کرلیتیں لیکن وہ

بہترین سے کم کسی چیز پر مفاہمت کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتی تھیں۔ پریشانی کے عالم میں انہوں نے اپنی بڑی بیٹی سلطان کو خط لکھا کہ وہ اپنے بھائی کو سمجھانے کی کوشش کرے۔ سلطان جنہیں اختر آپا سلطان کہتے تھے، ریلوے میں ملازمت کرنے والے اپنے شوہر کے ساتھ بمبئی میں تھیں۔ آپا کو یقین تھا کہ وہ اپنے بھائی کو قائل کر سکتی ہیں۔ انہوں نے فوری طور پر اپنے گھریلو ملازم کو ساتھ لیا اور جستروال روانہ ہو گئیں۔

گاؤں پہنچنے کے بعد انہوں نے بواجی سے مشورہ کیا ملازم کو واپس بمبئی بھیج دیا اور بھائی کو تار دیا کہ وہ جستروال آئے۔ اختر اگلے ہی دن گاؤں پہنچ گئے۔ آپا نے ان سے بحث کرنے کی بجائے صرف یہ کہا کہ وہ انہیں بمبئی چھوڑ آئے۔ یہ چار پانچ دن کا سفر تھا اور ظاہر ہے کہ ٹریننگ کے دوران اتنی طویل رخصت نہیں مل سکتی تھی۔ اختر انکار نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی شادی شدہ بہن، جن سے انہیں ایک خاص تعلق تھا، جستروال سے بمبئی تک تنہا سفر نہیں کر سکتی تھیں۔ ایک بھائی کے لئے لازم تھا کہ وہ اپنی بہن کو عزت اور تکریم کے ساتھ اس کے گھر پہنچا کر آئے۔ بہن کی دوٹوک فرمائش، والدہ کی تائید اور گھر میں پھیلی معنی خیز خاموشی کا مطلب واضح تھا۔ اہل خاندان کو گوارا نہیں تھا کہ اختر پولیس کی نوکری کرے۔ ایک ایسے آدمی کے لئے جسے اپنے خاندان سے بڑا گہرا تعلق تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ صاف صاف انکار کر دے۔ اگرچہ شروع میں انہوں نے ٹالنے کی کوشش کی لیکن تھوڑے سے تامل کے بعد آخر کار وہ آمادہ ہو گئے۔ انہوں نے پولیس والوں کو استعفیٰ لکھ کر بھیج دیا اور بہن کے ساتھ بمبئی روانہ ہو گئے اگلے دو ماہ اختر نے ہندوستان کے کاروباری دارالحکومت میں گزارے جہاں انہوں نے اپنے بہنوئی کو پولیس کے ساتھ وابستگی کے پس منظر سے آگاہ کیا۔ وہ آئی سی ایس افسر بننا چاہتے تھے اور امتحان سے فراغت کے بعد مقابلے کے امتحان منعقد نہیں ہو رہے تھے۔ اکاؤنٹس اور فوج کے علاوہ یہ صرف

پولیس کا محکمہ تھا، جہاں بھرتی کا عمل جاری تھا، چونکہ ان کے لئے فارغ رہنا ممکن نہ تھا لہٰذا جیسے ہی پولیس میں آسامیاں نکلیں اور ملازمت کے لئے درخواستیں طلب کی گئیں تو انہوں نے درخواست بھیج دی اور منتخب کر لئے گئے۔

اختر صبح سویرے اٹھ بیٹھتے اور دیر تک ٹائمز آف انڈیا کا مطالعہ کرتے رہتے۔ اخبار سے فارغ ہوتے تو کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتے۔ ان کے بہنوئی دفتر سے گھر لوٹ آتے تو ان سے گپ شپ ہوتی لیکن جلد ہی وہ بور ہونے لگے کہ وہ گھومنے پھرنے والے آدمی نہیں تھے۔ بمبئی فلمی صنعت کا مرکز تھا۔ آئے دن نئی فلمیں ریلیز ہوتی تھیں۔ شہر میں تھیٹر والے تھے اور آئے روز ثقافتی تقریبا منعقد ہوتی تھیں لیکن اختر کو ان میں سے کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی تو اس بوریت کا کیا حل تلاش کیا جائے۔ سفر سے رغبت رکھنے والے ریلوے افسر نے اس کا حل ڈھونڈ نکالا۔ انہوں نے دفتر سے چھٹی لی اور وہ ہرن کے شکار کے لئے نکل پڑے۔ مختلف علاقوں میں وہ گھومتے پھرے۔ دونوں جوان آدمیوں نے اپنی بہت سی راتیں سرکاری ریسٹ ہاؤسوں یا جنگلوں اور بیابانوں میں کھلے آسمان تلے گزاریں۔ جب وہ لوٹ کر آئے تو تازہ دم اور آسودہ دکھائی دیتے تھے۔

ایک صبح ٹائمز آف انڈیا کا مطالعہ کرتے ہوئے اختر اپنے بہنوئی کی طرح متوجہ ہوئے اور بلند آواز سے سوچنے (Loud Thinking) کے انداز میں انہیں بتایا کہ فوج میں کمیشنڈ افسروں کے لئے بھرتی کا اشتہار نکلا ہے اور یہ کہ کیا انہیں اس کے لئے درخواست داخل نہیں کر دینی چاہئے۔ انہوں نے اس خیال کی پرجوش تائید کی۔ درخواست بھیج دی گئی اور چند ہی روز میں اختر انٹرویو اور امتحان کے لئے طلب کر لئے گئے۔ تھوڑے دن بعد اختر واپس آئے تو انہیں سامان سمیٹ کو دیولالی واپس جانے کی جلدی تھی جہاں انہیں دو سالہ تربیت سے گزر کر کمیشن حاصل کرنا تھا۔

اختر فوج میں گئے تو جلد ہی ان کی بہن کے میاں کا تبادلہ بمبئی سے سی پی ہو گیا۔

جب کبھی ایک رات کے سفر کے بعد وہ بہن اور بہنوئی سے ملنے آتے تو خوش دکھائی دیتے۔ فوج کا ادارہ انہیں پسند آیا تھا اور اس میں ان کا جی لگ گیا تھا۔ وہ ایک محنتی آدمی تھے اور چیلنج قبول کرنے والے۔ وہ ایک ایسی ہی زندگی سے سمجھوتہ کر سکتے تھے، جہاں آزمائش اور امتحان کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو فروری 1947ء سے چند روز پہلے جب آخر کار انہیں کمیشن ملا اپنے ایک خط میں انہوں نے لکھا مجھے یقین ہے کہ فوج میں میرا مستقبل شاندار ہے اس وقت برصغیر کی آزادی میں صرف چھ ماہ باقی تھے۔

کہا جاتا ہے کہ ہر بڑے آدمی کے پیچھے ایک خاتون کا ہاتھ ہوتا ہے۔ خاندان کے لاڈلے اور اکلوتے بیٹے اختر عبدالرحمن کے پیچھے ایسی دو عورتوں کا ہاتھ تھا۔ ان کی والدہ اور ان کی اہلیہ رشیدہ بیگم وہ اس لحاظ سے ایک بڑے ہی خوش قسمت آدمی تھے کہ یہ دونوں عورتیں جو حد درجہ عبادت گزار واقع ہوئی تھیں اور شب و روز خدا کے حضور ان کے لئے دعائیں مانگتی اور ان پر جان چھڑکتی تھیں۔

1949ء میں اختر ترقی پا کر کیپٹن ہو گئے اور نوشہرہ کے آرٹلری سکول میں انسٹرکٹر کے طور پر ان کی تعیناتی عمل میں آئی۔ ستمبر 1951ء تک وہ یہاں پڑھاتے رہے۔ جب انہیں لانگ گنری کورس کے لئے برطانیہ جانا پڑا (اپریل 1952ء میں وہ دوبارہ اسی سکول میں پڑھانے کے لئے لوٹ آئے) انہی دنوں ان کی بڑی بہن آپا سلطان کے شوہر نصر اللہ خان خلیل بھی جو بعد ازاں ریلوے کے ایک بڑے منصب سے ریٹائر ہوئے اسی شہر میں تعینات کر دیئے گئے۔ کیپٹن کی والدہ اور ہمشیرہ یکجا ہوئیں تو اس کی شادی کا سوال زیادہ شدت سے زیر بحث آنے لگا۔ اب وہ 27 سال کے ہو گئے تھے اور شادی کے لئے ان کی عمر معمول سے کچھ زیادہ ہو گئی تھی۔ آپا سلطان کی بڑی شدید خواہش تھی کہ ان کے بھائی کی شادی ان کی پھوپھی کی پوتی رشیدہ بیگم سے طے پا جائے۔ آپا سلطان کا بچپن جستر وال میں اس خاندان

کے ساتھ گزرا تھا رشیدہ کی بڑی بہن اس کی ہم عمر سہیلی تھیں۔ بچپن ہی سے وہ اس کم گو سنجیدہ اور شائستہ بچی کو بھائی سے بیاہنے کا خواب دیکھتی تھی جس کے والد تحصیلدار تھے اور جن کا شمار قصبے کے معزز لوگوں میں ہوتا تھا۔

آزادی کے بعد رشیدہ بیگم کا خاندان فیصل آباد میں تھا۔ کیپٹن کی والدہ اور بہن نے طویل صلاح مشورے اور کیپٹن کی آمادگی کے بعد پختہ رائے قائم کر لی تو دونوں خواتین نوشہری سے فیصل آباد پہنچیں۔ اختر کی والدہ اپنے حسن سلوک کی وجہ سے سسرالی رشتہ داروں میں بڑی مقبول تھیں، چنانچہ فیصل آباد میں جو تب ایک چھوٹا سا بے ڈھب قصبہ تھا ان کا بڑی خوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔ ماں بیٹی نے روایتی تمہید کے ساتھ جھجکتے ہوئے رشیدہ بیگم کی نانی سے رشتے کی بات چھیڑی تو فوراً ہی اثبات میں جواب ملا ”ہمیں اختر سے زیادہ عزیز کون ہو سکتا ہے“ آپا سلطان کو جو مال روڈ لاہور کے ایک بہت پرانے اور کشادہ گھر میں اپنا زیادہ تر وقت اپنے نواسے نواسیوں کے ساتھ کھیلنے اور عبادت میں گزارتی تھیں، 1952ء میں خزاں کے وہ دن خوب اچھی طرح سے یاد ہیں۔ مرحوم کے ذکر پر بات بے بات رو پڑنے والی آپا کو یاد ہے کہ شادی کی تیاریاں تین ماہ جاری رہیں۔ خوش چہرہ اور سلیقہ مند بہو کے لئے زیور بنوائے گئے بہت سوچ سوچ کر لباس سلوائے گئے اور جب بارات نوشہرہ سے فیصل آباد روانہ ہوئی تو اس میں اختر کے بہت سے فوجی دوست اور ان کی بیگمات شامل تھیں۔ خاندان میں طویل عرصے کے بعد مسرت کی ایک تقریب برپا ہو رہی تھی، لہٰذا جی بھر کر اہتمام کیا گیا خاص طور پر ولیمے کی دعوت میں۔ وسطی پنجاب سے دور، صوبہ سرحد کے اس شہر میں رشتہ داروں کا زیادہ اجتماع تو ممکن نہ تھا لیکن ان میں بہت سے شریک ہوئے تاہم فوجی افسروں، پاس پڑوس والوں اور فوجی افسر کے جاننے والوں کی زیادہ بڑی تعداد تقریب میں شریک تھی، دولہا، دلہن دونوں ہی متین مزاج اور کم گو واقع ہوئے تھے لیکن مہمان خوب چہکتے پھرے، کھانے کا خوب اہتمام

کیا گیا۔ فوجی بینڈ نے مسرت آمیز نغموں کی دھنیں بکھیریں اور دلہن کو افسروں کی بیگمات نے کئی دن تک گھیرے رکھا۔

سروقد کی پسندیدہ اور شائستہ خاتون نے جلد ہی خاندان والوں کے دل میں گھر بنا لیا اور سب سے زیادہ اپنے دولہا کے دل میں، جو اب تک فرائض کی ادائیگی اور فوج کی سخت زندگی میں منہمک رہا تھا۔ اب جیسے گھر میں ایک پائیں باغ آباد ہو گیا تھا۔ زندگی کے لطیف پہلو نے اپنا دروازہ اس آدمی پر کھول دیا تھا جو زندگی کو آسائش میں نہیں جدوجہد میں تلاش کرتا پھر رہا تھا اور جب ایسا ہوا تو لوگوں نے حیرت کی کہ سخت جان آدمی نے مسرت کی سرشاری سے ہم آہنگ ہونے میں تامل سے کام نہیں لیا۔ جاننے والوں کے بہت سے گھروں میں روایت کے مطابق نئے جوڑے کے لئے دعوتوں کا اہتمام کیا گیا اور جلد ہی ارد گرد کھسر پھسر سنائی دینے لگی کہ اختر میاں دلہن پر بری طرح ریجھ گئے ہیں۔ پہلے تو وہ کبھی کبھار کلب جانے یا دوستوں سے گپ شپ کا وقت نکال لیا کرتے تھے اب اس سے بھی گئے۔ ایک شام کسی نے ان پر ہنسوں کا جوڑا کی پھبتی کسی اور رفتہ رفتہ یہ حکایت عام ہو گئی۔

ہر آدمی اپنی ماں سے محبت کرتا ہے، اپنی بہنوں سے محبت کرتا ہے، اولاد سے محبت کرتا ہے اور کوئی شائستہ اطوار اپنی بیوی سے تلخی کے ساتھ پیش نہیں آتا لیکن اس آدمی کی بات ہی کیا ہے کہ جس پر اس کی ماں، بہنیں اولاد اور بیوی ہمیشہ جان چھڑکنے کے لئے تیار رہتے ہوں۔ اگر اچھائی کا پیمانہ وہ ہے جو خدا کے آخری پیغمبر رسول اللہ ﷺ نے بیان کیا تھا کہ اچھا وہ ہے جو اپنے اہل خانہ کے ساتھ اچھا ہے تو ایسے آدمی کی بھلائی میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

جنرل اختر کی والدہ 1982ء میں اپنے خدا کے پاس چلی گئیں۔ ان کی بڑی بہن اور اہلیہ بقید حیات ہیں۔ دو سال گزر جانے کے باوجود ان کی اہلیہ ابھی تک اپنے شوہر کے بارے میں گفتگو کرنے پر آمادہ نہیں ہوتیں کہ مرحوم کا ذکر آئے تو ان کی

حالت دگرگوں ہو جاتی ہے۔ اس کتاب کی تدوین کے لئے ملاقات کی غرض سے آپا سلطان کو کئی دن تک آمادہ کیا جاتا رہا۔ ان کے بھتیجے اور داماد نے جن سے مرحوم کو ایک قلبی تعلق تھا، ان سے وعدہ لیا کہ وہ گفتگو کے دوران اپنے جذبات پر قابو رکھیں گی لیکن پہلے ہی دن گھنٹہ بھر کی بات چیت کے بعد وہ یکا یک بے تاب ہو کر رو پڑیں میرے شوہر فوت ہوئے تو اختر نے مجھے سنبھال لیا اور ڈولنے نہ دیا۔ میرے خدا اب میں کس لئے زندہ ہوں انہوں نے چیخ کر کہا اور رو دیں۔ آپا کو یاد ہے کہ وہ کبھی اپنے عدیم الفرصت بھائی کے گھر جاتیں تو وہ زیادہ سے زیادہ دیر تک انہیں اپنے ہاں ٹھہرائے رکھنے پر اصرار کرتے۔ واپسی کا وقت آتا تو وہ سفر کے دوسرے شرکاء سے کہتے کہ وہ چاہیں تو چلے جائیں لیکن ان کی بہن کو ان کے پاس چھوڑ جائیں۔ وہ ان سے خاندان کے امور پر مشورے کرتے، ان کے لئے تحائف خریدتے (''آپا! تمہارے بیڈروم میں ٹی وی نہیں ہے نا، یہ روپے رکھ لو اور ٹی وی خرید لینا، اچھا غازی بیٹے آپا نہیں مانتیں تم خرید لاؤ، ان کے کمرے میں ٹی وی ہونا چاہئے'') بہن بیمار ہوئیں تو انہوں نے ہسپتال کے کمرے میں ٹیلی فون لگوانے کا اہتمام کیا کہ خود نہیں آ سکتے تو فون پر ہر روز خیریت پوچھ لیا کریں۔ عام حالات میں بھی وہ دوسرے تیسرے روز بہن سے فون پر بات کرتے۔ کبھی کبھی جب وہ انہیں ملنے آتے تو لاڈ کے ساتھ کہتے میں ہمیشہ اپنی بہن کا ممنون رہوں گا جس نے مجھ سے پولیس کی نوکری چھڑوائی۔

اپنے چاروں بیٹوں کے لئے جن میں سے ہمایوں اختر سیاست میں ہونے کی وجہ سے زیادہ معروف ہیں وہ کیا تھے؟ محض ایک شفیق باپ نہیں بلکہ ایک ہمدرد دوست اور ایک آئیڈیل ایک رہنما آئی ایس آئی کی تشکیل اور افغانستان کی جنگ آزادی میں اپنے عظیم کارنامے کی وجہ سے جس کی اہمیت کا تعین وقت گزرنے کے ساتھ ہی ہو سکے گا، تاریخ شاید اس آدمی کو یاد رکھے گی لیکن اس کی زندگی کا سب سے زیادہ

حیران کن پہلو خاندان بالخصوص اولاد کے معاملے میں گہری دلچسپی، مسلسل منصوبہ بندی اور ایک بے حد لچک دار اور متوازن رویہ تھا۔ ان کے چار بیٹوں میں سے ایک نے ایم بی اے ایک نے چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ اور دو نے انجینئرنگ کی تعلیم پائی۔ ان چاروں کی زندگی میں آج بھی ان کا شہید باپ سب سے بڑا رہنما ہے۔ اپنے بے تکلف دوستوں کو وہ بتاتے ہیں کہ جب کوئی مشکل مرحلہ کوئی چیلنج درپیش ہو تو وہ خود سے سوال کرتے ہیں کہ اگر ان کے والد زندہ ہوتے تو کیا رویہ اختیار کرتے۔ ان کے ایک بیٹے نے کہا میں ان کے راستے پر چلنے اور ان کی طرح زندگی گزارنے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن پھر میں اپنے آپ سے کہتا ہوں یہ آسان نہیں ہے۔

دنیا میں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنی اولاد کی محبت میں اتنا جذباتی ہو اور پھر اتنا عملی، اتنا محتاط اور اتنا متوازن لوگ اپنی اولاد سے محبت کرتے ہیں اور اسے بگاڑ دیتے ہیں یا پھر سخت گیری سے۔ جنرل اختر عبدالرحمن کے اندر کوئی چیز تھی جو انہیں ہمیشہ بیدار اور چوکس ہی نہیں بلکہ محتاط بھی رکھتی تھی۔ انہوں نے اپنی اولاد کے ساتھ ٹوٹ کر محبت کی کہ وہ یتیمی میں پلے تھے اور انہوں نے اپنے اردگرد سازشیں برپا ہوتے دیکھی تھیں۔ انہیں والد کی محبت نہ ملی تھی لہٰذا وہ خاندان اور اولاد کے ہو گئے لیکن انہوں نے اپنے بچوں کو نظم و ضبط کا پابند بنایا اور اسے بگڑنے نہیں دیا۔ انہوں نے اپنی اولاد کے ساتھ گہرے اور مسلسل ابلاغ کا رشتہ قائم کیا اور اسے عمر بھر برقرار رکھا۔ ہمایوں کے بقول میرے والد کہتے تھے کہ مجھ میں اور میری اولاد میں کوئی جنریشن گیپ نہیں اور وہ سچ کہتے تھے۔

شام ہوتی تو وہ اپنے بچوں میں آبیٹھتے۔ وہ ان سے سکول میں گزرتے ہوئے وقت کے بارے میں پوچھتے۔ ان سے ہوم ورک کے بارے میں دریافت کرتے اور جب اس امر کا اطمینان کر لیتے کہ ان کی معمول کی پڑھائی ڈھنگ سے ہو رہی ہے تو خود انہیں سکھانے کی کوشش کرتے۔ وہ قریب رکھی ہوئی رسی، چھت سے لٹکتے

پنکھے یا کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے سوال کرتے کہ اسے انگریزی میں کیا کہتے ہیں۔ وہ بار بار اس لفظ کو دہراتے حتیٰ کہ وہ بچے کی یادداشت کا حصہ ہو جاتا۔ وہ انہیں کوئی موضوع دیتے اور باری باری سب بچوں کو اس پر تقریر کرنے کے لئے کہتے جو کوئی ڈھنگ کی بات کہتا اسے کوئی چھوٹا سا انعام دیا جاتا۔ وہ انہیں سوال کرنے کے لئے اکساتے اور ہر سوال کا جواب دیتے۔ ہارون خاں کو یاد ہے کہ جب ایوب خاں کے دور میں پنڈت نہرو پاکستان کے دورے پر آئے تو بھارت سے نفرت کرنے والے افسر کے بیٹے نے ان سے سوال کیا کہ ہم بھارتی وزیراعظم کو گرفتار کیوں نہیں کر لیتے۔ دیر تک وہ اپنے بیٹے کو بتاتے رہے کہ دنیا کے رسم و رواج کیا ہیں۔ سفارت کاری اور حکومتوں کے باہمی مذاکرات کیا ہوتے ہیں اور یہ کہ لڑائی کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔

اولاد سے اس قدر محبت کرنے والے آدمی کے لئے بچوں پر سختی کرنا آسان نہیں تھا لیکن جب ضرورت پڑتی تو وہ ایسا کرتے۔ ان کے لئے آموختہ یاد کرنے، ہوم ورک کرنے اور کھیلنے کا وقت مقرر تھا جس کی سختی سے پابندی کی جاتی۔ یہ اس وقت بھی ہوتا جب گھر میں مہمان آئے ہوئے ہوں۔ شوخی یا کھیل کود پر آمادہ کسی بچے کو پانچ سات منٹ کی مہلت دی جاتی اور اسے محبت سے سمجھایا جاتا لیکن اگر وہ راہ راست پر نہ آتا تو ڈانٹ پڑتی اور ایسی سختی کے ساتھ اس سے حکم کی تعمیل کرائی جاتی جو بظاہر ان گھروں کا نہیں دفتری نظم و نسق کا ضابطہ ہوتا ہے۔ باپ کو ہمیشہ یہ خیال تھا کہ کسی بچے میں محرومی کا احساس پیدا ہونے نہ پائے لہٰذا ان کے بیٹوں کے بقول ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ انہیں سزا دی گئی ہو تو کچھ ہی دیر کے بعد باپ نے محبت کے ساتھ بیٹے کو سینے سے نہ لگا لیا ہو۔ وقت گزرنے کے ساتھ گھر اور بچوں میں باپ کی مشغولیت بڑھتی گئی جب تک وہ بریگیڈیئر نہیں بنے تھے تو وہ کوئٹہ، نوشہرہ، ایبٹ آباد اور راولپنڈی کی شاموں میں دوستوں کے ساتھ ٹینس کھیلنے کے لئے وقت نکال لیا

کرتے تھے لیکن پھر یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔

وہ اپنے بچوں کو کس طرح سکھاتے تھے اور ان سے کس طرح کی گفتگو کرتے تھے۔ ان کے بیٹے نے بتایا کہ ایبٹ آباد کی ایک سرد سہ پہر کو جب بارش برس رہی تھی، وہ اسے ساتھ لے کر کھڑکی کے پاس کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے اپنے بیمار بچے کو ہسپتال لے جانے والے مالی کی طرف اشارہ کیا اور اپنے بیٹے کو بتایا کہ زندگی میں کس طرح امتحان اور آزمائشیں آتی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ایک باپ کے لئے اپنے بیمار بچے کے ساتھ بارش میں ہسپتال جانا کس قدر تکلیف دہ ہے اور پھر اسے یہ نکتہ سمجھانے کی کوشش کہ ایک تعلیم یافتہ اور صحت مند آدمی زیادہ بہتر طور پر زندگی کے چیلنج کا سامنا کر سکتا ہے۔

جنرل نے اپنی اولاد کے لئے وقت اور توجہ ہی نہیں روپے پیسے کے معاملے میں بھی بڑے ایثار سے کام لیا۔ پچاس اور ساٹھ کے عشرے میں جب وہ اعلیٰ افسر نہیں بنے تھے اور فوجی افسروں کی تنخواہیں بھی نسبتاً کم تھیں ان کے بچے اعلیٰ اداروں میں تعلیم پاتے تھے ان کے ایک ساتھی نے ایک بار دریافت کیا کہ وہ بچوں کی تعلیم پر کس طرح زائد اخراجات کے متحمل ہو رہے ہیں میرے پاس کار نہیں ہے انہوں نے کہا اور میں بعض دوسری آسائشوں سے بھی دستبردار نہیں ہو سکتا ہوں لیکن میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ بچوں کی تعلیم میں کسی اعتبار سے کوتاہی کروں حقیقت تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ پر بعض بڑی سخت پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ وہ ڈھاکہ میں ہوں کوئٹہ راولپنڈی یا ایبٹ آباد میں، وہ گھر سے باہر کبھی کچھ نہیں کھاتے تھے۔ خوش ذوق آدمی نے اپنی زندگی کا ایک طویل عرصہ دو پتلونوں، دو بش شرٹوں اور ایک آدھ شلوار قمیض کے ساتھ گزارا۔ یہ صورتحال اس وقت تک برقرار رہی جب تک ان کے بیٹے امریکہ سے ان کے لئے لباس اور دوسری اشیاء بھجوانے لگے۔ ان کے بیٹے آج بھی والد کے اس ایثار کا تذکرہ کرتے ہوئے جذباتی ہو جاتے ہیں جنہوں نے بچوں کی

اعلیٰ تعلیم کے لئے فوجی افسر کے طور پر حاصل ہونے والا واحد رہائشی پلاٹ بیچ ڈالا تھا۔ ان کے بیٹوں میں سے جب کوئی اس ایثار سے کام نہیں لیا اور یہ کہ انہیں وہی کچھ کرنا چاہئے تھا، جو انہوں نے کہا ایک گھریلو تقریب کی وڈیو فلم میں جو ان کی شہادت سے کچھ عرصہ پہلے منعقد ہوئی، انہیں اپنے ایک بیٹے کی طرف سے تحفے کا پیکٹ موصول ہونے کے بعد، اس کے ساتھ لکھے گئے خط کو پڑھتے دکھایا گیا ہے۔ اس خط میں اولاد سے ان کی غیر معمولی محبت اور قربانیوں کا تذکرہ ہے۔ جنرل نے ایک آدھ فقرہ پڑھا پھر جذبات کی شدت سے اس کی زبان گنگ ہوگئی اور آنکھوں میں نمی سی آگئی۔

جنرل کو اس بات پر بڑا فخر تھا کہ ان کے چاروں بیٹے جنہوں نے اعلیٰ تعلیم پائی، مغرب کی چکا چوند سے متاثر اور بے راہرو نہیں ہوئے۔ وہ مسرت کے ساتھ کہتے تھے کہ ان میں سے کسی نے ان کی مرضی کے بغیر شادی نہیں کی۔ ان کے چاروں بیٹوں اکبر، ہمایوں، ہارون اور غازی خان کی شادیاں ان کی مرضی سے انجام پائیں، اگرچہ ہر رشتے میں بچوں کی رضامندی حاصل کی گئی ہماری شادیاں اس طرح نہیں ہوئیں کہ والدین نے طے کرلیا اور لڑکے کو ہانکتے ہوئے لے گئے ہمایوں اختر نے کہا وہ ہمارے ساتھ دوستانہ انداز سے بات کرتے تھے وہ صاف صاف پوچھتے تھے کہ کیا تم فلاں خاندان کی فلاں بیٹی سے شادی کرنا پسند کرو گے۔ ان کے ایک بیٹے قریبی رشتہ داروں کے ہاں اور تین ممتاز فوجی افسروں جنرل زاہد علی اکبر، جنرل رحیم الدین اور ایئر وائس مارشل صدر الدین کے ہاں بیاہے گئے۔ اختر عبدالرحمن کہتے تھے کہ اپنے والد کی طرح وہ اپنے ماں باپ کے اکلوتے بیٹے تھے پھر یہ کہ انہیں والد کا پیار نصیب نہ ہوسکا۔ انہوں نے اپنے بچوں کے ساتھ گہری وابستگی میں اس کا مداوا تلاش کرنے کی کوشش کی اور مرحوم کے بقول وہ اس میں کامیاب رہے خدا نے مجھے دنیا میں اپنی محرومیوں کا صلہ دے دیا ایک بار انہوں نے کہا۔

جنرل کے چار بیٹے تھے اور بیٹی ایک بھی نہ تھی۔ ایک بار انہوں نے کہا خدا نے مجھے ایک بیٹا عطا کیا تو میں نے اس کا جشن منایا۔ دوسری بار بھی میں نے بیٹے کے لئے دعا کی، تیسری اور چوتھی بار بھی۔ وہ اپنی اولاد کی تعلیمی استعداد اور جسمانی صحت مندی ہی کے لئے منصوبہ بندی نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی روحانی اور اخلاقی ترقی کے لئے بھی ہمیشہ متفکر رہتے تھے ان کے سب سے چھوٹے بیٹے غازی خان 1978ء میں چارٹرڈ اکاؤنٹ کی ڈگری کے لئے امریکہ جا رہے تھے، وہ اسے ائیر پورٹ پر چھوڑنے گئے اور کہا بیٹا! کل تک تمہاری عزت میری ہاتھ میں تھی اور آج سے میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے ان کے بچوں کا کہنا ہے کہ امریکہ میں قیام کے دوران انہیں ہمیشہ اس امر کا خیال رہا کہ کہیں ان کی وجہ سے ان کے باپ کی تکریم پر حرف نہ آئے جو اپنی توقیر کے معاملے میں از حد حساس واقع ہوئے تھے۔

ہارون خاں نے جواب ایک صنعتی ادارے کے سربراہ ہیں بتایا کہ بچپن میں ایک بار انہوں نے ملازم کے کوارٹر میں پڑا مٹی کا تیل شربت سمجھ کر حلق میں انڈیل لیا جس سے وہ بے ہوش ہو گئے۔ ملازم جو چست اور سمجھدار آدمی تھا اس وقت بچے کو ہسپتال لے گیا جب اس کی والدہ گھر پر نہیں تھیں اور والد غسل خانے میں تھے جیسے ہی انہیں صورتحال کا علم ہوا تو بھاگتے ہوئے ہسپتال پہنچے۔ ہر حال میں ذہنی بیداری اور حوصلہ مندی قائم رکھنے والے آدمی نے ڈاکٹر سے بچے کی زندگی کے بارے میں پوچھنے کے بعد پہلا سوال یہ کیا کہ کیا اس حادثے کا اس کی آئندہ زندگی پر تو کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ انہیں ہمیشہ یہ فکر لاحق رہی کہ ان کے بچے زندگی میں بہترین صلاحیتوں سے بہرہ ور ہوں اور ان میں کسی پہلو سے کوئی کمی نہ رہ جائے۔ ان کی ساری زندگی اس مقصد کے لئے سوچ بچار اور منصوبہ بندی کرتے گزری۔

انہوں نے اپنی اولاد کو شائستگی اور دیانت سکھانے کی کوشش کی۔ انہیں بتایا کہ

زندگی میں توازن کی اہمیت کیا ہے اور ہمیشہ اس بات پر زور دیتے رہے کہ ایک مسلمان کو ہمیشہ خدا سے ڈرتے رہنا چاہئے۔ نیو یارک میں کاروباری مشاورت کا ادارہ چلانے والے اکبر کہتے ہیں کہ جب وہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں تعلیم پا رہے تھے تو ان کے والد ہمیشہ انہیں فراخدلی سے روپے بھیجتے تھے۔ معمول کی مقررہ ماہانہ رقم کے علاوہ اگر اچانک زائد روپوں کی ضرورت پڑتی تو وہ انہیں خط لکھتے یا فون کرتے یا نہیں پڑتا کبھی انہوں نے یہ سوال کرنے کی ضرورت محسوس کی ہو کہ روپے کس مقصد کے لئے درکار ہیں۔

ہمایوں کی بیٹی ثناء کے ساتھ جواب لاہور میں تیسری جماعت میں تعلیم حاصل کر رہی ہے، وہ غیر معمولی لاڈ پیار کے عادی تھے۔ یہ بچی آزادی کے ساتھ ان کے کمرے میں آتے جاتے دیکھی جا سکتی تھی 5 اگست 1988ء کو اس بچی کی چھٹی سالگرہ پر ان کے سکول کے ساتھیوں سمیت 40,50 بچوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ گھر کو روشنیوں سے سجایا گیا جب کیک کاٹنے کا وقت آیا تو انہیں بتایا گیا کہ سفر سے لوٹ کر آئے اور تھکے ماندے ہمایوں اپنے کمرے میں سو رہے ہیں تو انہوں نے خود آ کر کیک کاٹا لیکن مصروف آدمی اس کے بعد اپنے کمرے میں واپس نہیں گیا، وہ تقریب کے خاتمے تک وہیں ٹھہرے اور بچوں سے باتیں کرتے رہے۔ وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے بچوں میں سے کوئی احساس محرومی کا شکار ہو۔ وہ چاہتے تھے کہ جب وہ زندگی کے چیلنج کرنے اور آزمائشوں سے دوچار کرنے والے میدان میں داخل ہوں تو وہ بھی بڑی مضبوط اور پر اعتماد شخصیتوں کے مالک ہوں اور وہ یہ بات جانتے تھے کہ اس کے لئے والدین کو قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔

جنرل کی زندگی میں ان کی والدہ کا کردار بڑا گہرا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ایک دوسری ہستی اس دائرے میں داخل ہوئی اور بتدریج اس کا کردار بڑھتا چلا گیا۔ یہ ان کی اہلیہ رشیدہ بیگم تھیں۔ جنرل اختر اپنے گروہ پیش کے لوگوں سے بڑی

توقعات رکھنے والے Demanding آدمی تھے۔ وہ ان سے ہر وقت چوکس رہنے وقت کی پابندی کرنے اور مطلوبہ نتائج فراہم کرنے کا مطالبہ کرتے تھے اور اس معاملے میں خاصے بے لچک واقع ہوئے تھے اسی لئے ان کے بعض ماتحت انہیں ناپسند کرتے تھے رشیدہ بیگم ان ہستیوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے خود کو جنرل کی پسند اور ناپسند کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ وہ اس اعتبار سے ایک مثالی مشرقی خاتون ہیں کہ انہوں نے خود کو اپنے شوہر اور خاندان کے لئے وقف کر دیا ان کے مزاج کی لچک، خدمت گزاری اور غیر معمولی سوجھ بوجھ نے اس میں ان کی مدد کی اور انہوں نے جنرل کے گھر کو جنت بنا دیا۔

جنرل اختر صبح چھ بجے سو کر اٹھتے اور غسل خانے کا رخ کرتے تو ان کی خواہش ہوتی کہ وہ جیسے ہی باہر نکلیں، چائے کی پیالی میز پر دھری ہو۔ چائے کی یہ پیالی انہیں ہمیشہ میز پر رکھی ہوئی ملتی۔ وہ چائے پیتے اور اخبار پڑھنے میں محو ہو جاتے۔ وہ اخبار دیکھ چکتے تو غسل کرتے۔ اسی دوران ان کی وردی استری کر کے لائی جاتی۔ رشیدہ بیگم اپنے ہاتھوں سے رنگس فارمیشن سائن اور کالر کے نشانات وردی پر سجاتیں۔ گندگی اور بے ترتیبی سے چڑنے والے آدمی کو اپنی وردی سے بڑی محبت تھی جیسی کہ ایک تکمیل پسند فوجی افسر کو ہونی چاہئے جیسے ہی وہ غسل خانے سے پاؤں باہر رکھتے یہ وردی ان کو پیش کی جاتی اگرچہ ہمیشہ اس کا احتیاط سے جائزہ لے لیا جاتا تھا لیکن وہ خود بھی اس کا کڑی نظر سے معائنہ کرتے۔ اگر کہیں ذرا سا داغ، دھبہ بھی دکھائی دیتا تو ان کے لئے دوسری متبادل وردی لائی جاتی جو ہمیشہ تیار رکھی جاتی تھی اور اس کے ساتھ پالش سے چمکتا ہوا جوتا، جرابیں، ٹوپی اور گھڑی۔

وہ ٹھیک وقت پر ناشتہ کرنے کے عادی تھے اور اس میں ذرا سی تاخیر بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جنرل حمید کے بقول جو ان کے افسر رہے اور جن سے مرحوم کو خاص تعلق خاطر تھا۔ جنرل اختر ایک فوجی کے طور پر اپنے مزاج میں قدیم انگریز

افسروں کی طرح تھے، دیانتدار، وقت کے پابند اور بہترین سے کم کسی چیز پر مفاہمت نہ کرنے والے میز پر پہنچنے سے پہلے ان کے لئے ناشتہ چن دیا جاتا۔ اس دوران رشیدہ بیگم باورچی خانے کا چکر لگا کر اس امر کا جائزہ لیتیں کہ سب چیزیں ڈھنگ سے تیار کی گئی ہیں یا نہیں۔ وہ ہلکا سا ناشتہ کرتے تھے۔ ذرا سا دلیہ، ایک آدھ توسٹ، بغیر زردی کے تلا ہوا انڈا، ذرا سا پھل یا جوس لیکن وہ یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ ان میں سے کوئی چیز معیار سے گری ہوئی یا بدذائقہ ہو۔ ہمیشہ مصروف عمل رہنے اور ہمیشہ سوچ بچار کرتے رہنے والے آدمی کو اس بات سے بھی بڑی چڑ تھی کہ جب وہ دوپہر میں گھر لوٹیں تو صفائی کا عمل جاری ہو لہذا اگر کوئی میلا پردہ دھلنا تھا کسی جگہ کیل ٹھونکا جانا تھا یا کسی کمرے کا فرش صاف ہونا تھا تو یہ سب کام ان کے لوٹ آنے سے پہلے کر لئے جاتے اور سہ پہر کو یہ صاحب خانہ کے لئے انتظار کرتا ہوا گھر ہوتا۔

جتنی دیر میں وہ لباس تبدیل کرتے، میز پر کھانا چن دیا جاتا۔ اپنی صحت کا خیال رکھنے والے آدمی کو ہمیشہ اصرار تھا کہ اس کے لئے پکائے گئے کھانے میں گھی اور مرچ کم ہو (کبھی کبھار گوشت اور زیادہ تر سبزی) اور پھر اس کا ذائقہ بھی اچھا ہونا چاہئے۔ دوپہر کو گھنٹہ بھر آرام کرتے اور اس وقت وہ ذرا سی مداخلت بھی گوارہ نہ کر سکتے تھے، وہ سو کر اٹھتے تو ورزش کا سامان پتلون، جرابیں اور پی ٹی شوز وغیرہ رکھی ہوتیں۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لئے سیر کے لئے نکل جاتے تو گھر میں ایک بار حرکت کے آثار پیدا ہوتے اور باقی ماندہ کام تیزی سے نمٹائے جاتے تاکہ جب وہ لوٹ کر آئیں تو گھر پھر سے پرسکون اور مرتب ہو۔ واپس آ کر جرنیل شلوار قمیص پہن لیتا۔ ٹیلی فون پر دفتر والوں سے گفتگو کرتا، ضروری فائلوں پر نظر ڈالتا، بیوی بچوں سے گپ شپ کرتا حتیٰ کہ رات کے کھانے کا وقت ہو جاتا۔

اس ساری ترتیب اور اہتمام کے لئے رشیدہ بیگم کو بڑی بھاگ دوڑ کرنا پڑتی لیکن

انہوں نے کبھی یہ شکایت نہ کی کہ ان پر کام کا بوجھ لدا رہتا ہے۔ اس کے برعکس وہ ایک عبادت کی طرح اس کا اہتمام کرتیں۔ مہمانوں کا خیال رکھتیں اور بچوں کا بھی، ایک بار جنرل نے کہا ساری زندگی مجھے اپنے بچوں کے حوالے سے کبھی الجھن کا سامنا نہیں ہوا۔ میں نے ہمیشہ انہیں صاف ستھرے لباس میں ملبوس دیکھا انہوں نے کبھی اس طرح کی ہنگامہ آرائی نہیں کی جس سے میرے کام میں خلل پڑے اور میں اس کے لئے اپنی بیوی کا ممنون ہوں۔

اپنی اہلیہ کے لئے جنرل کی ممنونیت محض اس لئے نہیں تھی کہ وہ ان کا اس درجہ خیال رکھتی تھیں۔ اس کے کچھ دوسرے اسباب بھی تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے جنرل کی والدہ کی، جن سے وہ بے پناہ محبت کرتے تھے، اس طرح خدمت کی کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے۔ ان کے ایک بیٹے نے بتایا کہ 1981ء میں جب وہ کچھ دن کے لئے امریکہ سے راولپنڈی آئے تو انہوں نے اپنی والدہ کو اپنی دادی اماں کے کپڑے استری کرتے اور ان کے پاؤں کی مالش کرتے دیکھا۔ وہ ایک لیفٹیننٹ جنرل کی اہلیہ تھیں اور گھر میں نوکر چاکر موجود تھے لیکن وہ جنرل کی والدہ کے کام اپنے ہاتھوں سے کرنے کو ترجیح دیتیں 1982ء میں جب بوا جی کو دل کا دورہ پڑا اور انہیں لاہور کے کمبائنڈ ملٹری ہسپتال میں داخل کرایا گیا تو رشیدہ بیگم روزانہ 16,16 گھنٹے تک ہسپتال میں ان کی خبر گیری کرتی رہتیں۔ وہ فخر سے کہتی ہیں بوا جی ان کے لئے دعا کرتی رہی تھیں اور یہ کہ اس سے بڑھ کر کوئی انعام نہیں ہو سکتا۔

وہ جنرل کے رشتہ داروں کا خون ان سے بڑھ کر خیال رکھتیں، خاص طور پر ان کا جو بسا اوقات حالات کے دباؤ کا شکار ہوتے۔ وہ ان کے لئے چپکے چپکے ضرورت کی چیزیں اور روپے بھجواتیں، حتی کہ بعض اوقات تو خود جنرل اس پر قدرے پریشان ہو کر کہتے کہ تم ان کی عادتیں بگاڑ دو گی۔

وہ اس امر کا خیال رکھتیں کہ ان کے ہمیشہ مصروف رہنے والے شوہر کی وجہ سے کسی الجھن کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ چنانچہ جب کبھی وہ انہیں کسی چیز کی طرف توجہ دلانا یا کسی خوشگوار واقعہ سے مطلع کرنا چاہتیں تو ان کے خوشگوار موڈ یا شام کے فارغ لمحات کا انتظار کرتیں ان میں گفتگو اور ابلاغ کا غیر معمولی سلیقہ پایا جاتا ہے اور انہوں نے اپنی اولاد کو بھی یہ سکھانے کی کوشش کی کہ گفتگو کا سلیقہ زندگی میں کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ ہر چند کہ انہوں نے صرف میٹرک تک تعلیم حاصل کی ہے لیکن خاندان کے لوگ ان کی بصیرت اور سوجھ بوجھ پر غیر معمولی اعتماد رکھتے ہیں اور اب بھی ہر اہم معاملے میں ان سے مشورہ لیا جاتا ہے۔

جنرل اختر عبدالرحمن ایک فوجی افسر کے طور پر اپنی تقریروں کو بہت سنجیدگی سے لیتے تھے۔ جب وہ تقریر لکھ چکتے تو ہمیشہ اپنی اہلیہ سے اس پر مشورہ کرتے۔

عبادت گزار خاتون پر ان کے دادا کا بہت گہرا اثر ہے جو بہت متین اور مذہبی آدمی تھے۔ ان کی حقیقی تعلیم دراصل ہی ہے جو کچھ انہوں نے گھر میں رہتے ہوئے اپنے دادا سے سیکھا اور اسے ہمیشہ یاد رکھا۔

وہ ہمیشہ سے اپنے دادا کی طرح مذہبی واقع ہوئی تھیں لیکن 1965ء کی جنگ نے انہیں اس طرح بدل ڈالا جیسے کوئی قلبی واردات ایک صوفی کو بدل ڈالتی ہے۔ میجر اختر عبدالرحمن تب برکی کے محاذ پر تھے۔

وہ ہمیشہ منکسر مزاج تھیں۔ وہ اپنے بیٹیوں سے کہتیں جب درخت کو پھل لگتا ہے تو وہ جھک جاتا ہے۔ ان کی بڑی بہن کے بقول جب ان کے بچوں کی تعریف کی جاتی تو وہ کہتیں نہیں! کوئی ایسی خاص بات تو نہیں انہوں نے اپنے دادا سے سیکھا تھا کہ جب کوئی تعریف کرے تو اسے من وعن قبول کر لینا اور اس پر پھول جانا احمقوں کا کام ہے۔ تقریبات میں وہ ہمیشہ اس امر کا خیال رکھتیں کہ کسی کو ان سے تکلیف نہ پہنچے۔ فوجی افسروں کی بیگمات تقریبات میں پروٹوکول کا اتنا ہی لحاظ رکھتی ہیں جتنا

کہ خود ان کے شوہر آئی ایس آئی یا چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کی اہلیہ کی حیثیت سے کسی تقریب میں خصوصی مہمان کی حیثیت سے مدعو ہوتیں اور وہاں ان کا سامنا اپنے شوہر کے کسی سابق سینئر کی اہلیہ سے ہو جاتا تو وہ انہیں گاڑی تک چھوڑنے جاتیں اور انتظار کرتیں کہ وہ ان سے پہلے گاڑی میں سوار ہو جائیں۔

ہمیشہ ان کا معلوم رہا ہے کہ جب ان کے گرد و پیش کوئی بیمار ہو جاتا، خاص طور پر جاننے والی خواتین میں سے کوئی تو وہ اس کی ڈھارس بندھاتی اور اس کی تیمارداری کرتیں۔ وہ ضرورت مندوں کی مدد کرتیں اور بعض اوقات اپنے ہاتھوں سے دوسروں کے لباس سیتیں۔ ایک بار تو ان کے شوہر اس پر ان سے بگڑ گئے۔ انہوں نے ادھ سلے کپڑے اٹھا کر پھینک دیئے اور کہا کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہیں۔ وہ ہمیشہ ضرورت مندوں کی مدد کے لئے آمادہ رہتیں۔ حتیٰ کہ ایک ریٹائرڈ فوجی افسر کی بیٹی کی شادی کے موقع پر انہوں نے اپنی کلائیوں سے سونے کی چوڑیاں اتار کر اسے دے دیں۔

جنرل کے ایک پرانے اے ڈی سی نے ایک بار کہا میں نے دنیا میں ایسی کوئی عورت نہیں دیکھی میں نہیں سمجھتا تھا کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی بہت ہوتے ہیں۔ ان کے ایک صاحبزادے نے کہا کہ ان کے والد کی ترقی میں ان کی والدہ کی انکساری و عاجزی، خدمت خلق اور عبادت گزاری کا حصہ ہے۔ خاندان کو جاننے والی ایک خاتون نے کہا اس گھر کے سکھ چین میں رشیدہ بیگم کی بے ریا خدمت اور سلیقہ مندی کا کردار کسی چیز سے کم نہیں۔

رشیدہ بیگم نے ایک بار اپنے شوہر سے کہا تھا کہ وہ ہمیشہ خدا سے اپنے میاں اور بچوں کی صحت اور خوشی کے لئے دعا کرتی ہیں لیکن انہوں نے کبھی ان کی ترقی کے لئے دعا نہیں کی۔ وہ ہمیشہ بڑی دلسوزی سے ایک اور دعا بھی کرتی رہیں کہ جب موت کا لمحہ آئے تو وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ہاتھوں سے قبر میں اتاری جائیں۔

جب کسی ایسی خاتون کے انتقال کی خبر آتی جس کے جنازے کو اس کے میاں کا کندھا نصیب ہوتا تو وہ ہمیشہ کہتیں وہ ایک خوش نصیب عورت ہے اب وہ اپنے پلو سے آنسو پونچھتی ہوئی کہتی ہیں کہ خدا نے معلوم نہیں ان کی یہ دعا کیوں قبول نہ کی۔

اب ان کا زیادہ تر وقت عبادت اور تسبیح و وظائف میں گزرتا ہے۔ کبھی کسی مدرسے کے بچوں کی ایک ٹولی گھر میں داخل ہوتی دکھائی دیتی ہے وہ دیر تک تلاوت کرتے رہتے ہیں۔ بکرے ذبح کیے جاتے ہیں اور گوشت بانٹا جاتا ہے وہ خواب دیکھتی ہیں اور ان میں کھوئی رہتی ہیں۔

17 اگست کے سانحہ کے بعد جب ہمایوں اختر نے سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو وہ انہیں اس سے منع کرتی رہیں لیکن پھر انہوں نے ایک روز اپنے شوہر کو خواب میں دیکھا اور وہ ان کا اشارہ پا کر اس پر آمادہ ہو گئیں۔

جنرل کی شہادت کی خبر آئی تو ان کی حالت بگڑنے لگی۔ وہ بار بار کہتی تھیں کہ وہ اپنے شوہر کی زندگی میں خدا سے جا ملنے کی خواہاں تھیں لیکن ان کی آرزو پوری نہ ہو سکی اور انہیں میاں کی موت کا صدمہ سہنا پڑا۔ خاندان کے بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اس صدمے سے جانبر نہ ہو سکیں گی لیکن رفتہ رفتہ اپنے بیٹوں اور بہوؤں کی مدد سے وہ سنبھلنے لگیں۔

ایک ایسے گھر میں جہاں سب لوگ ایک دوسرے سے یوں جڑے ہوں جدائی کا لمحہ اور بھی دل گداز ہوتا ہے 1982ء میں جب اختر کی والدہ کا انتقال ہوا تو بہت دن تک ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ راتوں کو سوتے ہوئے اچانک بوا بوا کہتے ہوئے اٹھ بیٹھتے اور ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں۔ 1982ء میں لاہور میں بوا جی کو دل کا دورہ پڑا تو جنرل بہت گھبرائے لیکن وہ منہ پکا کے انہیں تسلی تشفی دیتے رہے۔ وہ اس وقت راولپنڈی میں تھے جب انہیں والدہ کے انتقال کی خبر دی گئی۔ ہیلی کاپٹر میں سوار ہو کر وہ لاہور پہنچے۔ جب وہ بوا جی کے بستر کے قریب پہنچے جہاں

وہ سفید کفن میں ملبوس محو خواب تھیں تو یکا یک ان کے قدموں پر سر رکھ کر رو پڑے۔ دیر تک وہ روتے رہے پھر سر اٹھایا اور کہا ان قدموں تلے تو میری جنت تھی۔



باب ششم

جنگ کے میدان میں

معرکہ پانڈو کے سترہ سال بعد، جہاں سیکنڈ لیفٹیننٹ اختر نے دس ہزار فٹ اونچی پہاڑی پر پاکستان کا پرچم لہرایا تھا ایک بار جنگ کا میدان گرم ہوا۔ اب وہ لاہور میں برکی کے محاذ پر تھے، دسویں ڈویژن کی 24 فیلڈ رجمنٹ میں، سیکنڈ ان کمانڈ، میجر اختر عبدالرحمن اس نے اپنی زندگی کے یہ 17 قیمتی سال کس طرح گزارے تھے؟

ستمبر 1949ء میں اسے کیپٹن کے طور پر ترقی ملی اور کچھ عرصہ نوشہرہ کے آرٹلری سکول میں انسٹرکٹر کے فرائض انجام دیئے۔ یہاں طالب علم نے استاد کی طرح سوچنا اور برتنا سیکھا جو آگے سالوں میں اس کی شخصیت اور مزاج کا حصہ ہو گیا۔ ستمبر 1951ء میں وہ لانگ گنری کورس (برطانیہ) کے لئے منتخب کیا گیا اور اپریل 1952ء میں پھر نوشہرہ لوٹ آیا۔ جولائی 1953ء میں میجر کے طور پر ترقی دے کر اسے ایک رجمنٹ کے ہمراہ ملتان بھیج دیا گیا۔ یہاں فوراً ہی کوئٹہ سٹاف کالج سے سٹاف اینڈ کمانڈ کورس کے لئے بلاوا آ گیا، جس میں دوسروں کے علاوہ کیپٹن ضیاء الحق بھی شریک تھے اپریل 1954ء میں جب اس کی تقرری بیٹری کمانڈر کے طور پر چٹا گانگ میں ہو چکی تھی، اسے میجر بنا دیا گیا۔ اکتوبر 1954ء سے اپریل 1956ء تک یہ بیٹری ڈھاکہ میں متعین رہی۔ اپریل 1956ء سے فروری 1957ء تک جی ایچ کیو راولپنڈی میں فرائض انجام دیئے اور فروری 1957ء سے دسمبر 1957ء تک سٹاف کالج کوئٹہ میں دسمبر 1957ء میں آرٹلری بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں سے بریگیڈ میجر بنا دیا گیا، جہاں اس نے اگلے 15 ماہ تک خدمات انجام دیں۔ فروری 1959ء سے اپریل 1960ء تک ایک بار نوشہرہ میں بیٹری کمانڈر کے طور پر، اپریل 1960ء سے دسمبر 1960ء تک کیمبل پور میں

رجمنٹ کے سیکنڈ ان کمانڈ کے طور پر دسمبر 1960ء سے اپریل 1961ء تک یہ رجمنٹ مانسر کیمپ میں متعین رہی۔

اپریل 1961ء میں میجر کو پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں صلاح الدین کمپنی کا کمپنی کمانڈر بنا دیا گیا۔ یہ ایک اعتبار سے ان کی زندگی میں نئے عہد کا آغاز تھا، جہاں منفرد سپاہی کے جوہر دوسروں پر کھلے اور خود اپنے آپ پر بھی، کمیشنڈ افسروں کے لئے قائم کئے گئے افواج پاکستان کے تربیتی ادارے میں جنہیں آنے والے کل میں قیادت کے فرائض انجام دینا ہوتے ہیں، ہمیشہ بہترین لوگوں کا انتخاب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اکیڈمی کے ایک استاد سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ ان ذہین اور پرعزم نوجوانوں کے لئے ایک مثالی فوجی افسر اور رہنما کا کردار کا نمونہ بنے۔ اسے ایک باکردار، باہمت اور صاحب شعور آدمی کھائی دینا چاہئے، جس کی خواب تراشنے والے نوجوان تقلید کر سکیں۔ ادارے کے ایک سابق سربراہ نے کہا میں کبھی اس کمپنی کانڈر کا وجود برداشت کرنے کے لئے تیار نہ ہوتا جو اپنے طالب علموں میں نامقبول ہو جائے، ایک رہنما نامقبول کیسے ہوسکتا ہے ایک سابق جرنیل کی رائے میں فوج کے تربیتی ادارے میں کمپنی کمانڈر کا کردار روحانی باپ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس طرح ایک بچہ اپنے کردار کی تشکیل میں سب سے زیادہ اپنے والد کا اثر قبول کرتا ہے، اسی طرح ایک کیڈٹ اپنے اس استاد اور رہنما سے سیکھتا ہے ان اساتذہ سے کہا جاتا ہے کہ وہ ان نوجوانوں پر انفرادی طور پر توجہ دیں، جن میں سے بہت سے پہلی بار اپنے گھروں سے الگ ہوئے ہوتے اور روزمرہ کی آرام دہ زندگی کے مقابلے میں پہلی بار سخت کوشی کا ذائقہ چکھتے ہیں۔

انہیں حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا درس دیا جاتا ہے، انہیں سکھایا جاتا ہے کہ مردان کار بے وفائی کرنے اور غلط بیانی کرنے والے نہیں ہوتے۔ اس سارے عمل میں کیڈٹ تو ایک امتحان سے گزرتے ہی ہیں، خود ان کا استاد بھی ایک آزمائش

سے دو چار رہتا ہے۔ میجر اختر عبدالرحمن اس امتحان میں کس حد تک پورے اترے۔ پہلے سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ انہوں نے خود کو ایک سانچے میں ڈھال لیا اور ذمہ داری کا احساس اپنے آپ پر سوار کر لیا۔ تین سال تک ان کی صلاح الدین کمپنی دوسری تمام کمپنیوں سے بڑھ کر کارکردگی کا مظاہرہ کرتی رہی۔ میجر کو ہر میدان میں اول رہنے کا خبط تھا۔ چنانچہ ہر سال جب فوجی افسروں کے گھریلو باغیچوں کی آرائش کا مقابلہ رہتا تو بھی اس کے گھر کا چمن اول انعام حاصل کرتا۔

کاکول اکیڈمی کے کمانڈنٹ کرنل (بعد میں جنرل) عبدالحمید (بھوپالی) کو جن کے ساتھ بعد ازاں سپاہی نے لاہور چھاؤنی میں خدمات انجام دیں اور عمر بھر جاری رہنے والے تعلق کی بنیاد رکھی، 33 سالہ کمپنی کمانڈر کے تیور خوب یاد ہیں۔ فروری 1974ء میں لاہور کی اسلامی سربراہی کانفرنس کے انتظامات کی نگرانی کرنے اور بعد ازاں وزیراعظم بھٹو اور صدر ضیاء الحق کی طرف سے متعدد مناصب کی پیشکش مسترد کرنے والا جرنیل جو انیسویں صدی کے انگریز ججوں کی یاد دلاتا ہے، اپنے ماتحت کو شاندار لیکن جچے تلے الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتا ہے "ہمیشہ وقت کی پابندی کرنے والا کم گو" الفاظ کے استعمال میں حد درجہ محتاط، نہ خوشامد کرنے والا اور نہ نظم کی خلاف ورزی کا مرتکب ہونے والا، وہ آدمی جو کبھی خوف کا شکار ہو کر دبتا تھا اور نہ کبھی ناتراشیدہ نظر آتا تھا، سچ بولنے والا، کردار میں پاکیزہ، غیر ضروری مشاغل سے بیزار، وقت کی قدر کرنے والا، بے حد محنتی اور منتظم، نئے خیالات کو قبول کرنے والا لیکن متوازن اور عملی، مکروہات سے اجتناب کرنے والا "Teatoler

"with a Capital" T

کیا جرنیل کو اپنے شاگردوں پر فخر تھا؟ اور وہ ایک استاد کے طور پر اپنے کردار سے اتنا ہی مطمئن تھا، جتنا کہ دوسرے؟ کوئی ایسا راوی نہیں ہے، جو اس باب میں اس کے محسوسات کو تفصیل سے بیان کر سکے، لیکن یہ تو ریکارڈ کی بات ہے کہ بعد میں اس

کے شاگردوں کا معیار ہمیشہ دوسروں سے بہتر رہا۔ اس کی شہادت کے ڈیڑھ سال بعد 1990ء میں میجر جنرل کا جلیل منصب سنبھالنے والوں میں سے اکثریت اس کے شاگردوں کی تھی۔

کیا ایسا آدمی میدان جنگ کے لئے پیدا نہیں ہوا تھا۔ آخر کار ایک میدان نے اسے بلا لیا، دسمبر 1964ء میں 24 فیلڈ رجمنٹ کے سیکنڈ ان کمانڈ ہو کر وہ لاہور پہنچ گئے، جسے ستمبر 1965ء کی جنگ میں لاہور کا دفاع کرنا تھا۔

مئی 1965ء میں جب دسویں ڈویژن کے دستے برکی کی سرحد پر متعین کئے گئے تو میجر کا خیمہ بی آر بی نہر سے ادھر بنگالی گاؤں میں تھا، جہاں اب تک حصار سے پاکستان آنے والے سخت جان میو آباد ہیں۔ سب لوگ جانتے تھے کہ میجر کا جی اپنے خیمے اور دفتر میں نہیں لگتا۔ وہ ایک جنون کے ساتھ توپوں کے لئے موزوں مقامات کا انتخاب کرنے کے لئے کھیتوں میں گھومتا دکھائی دیتا۔ وہ ایک ایک باغ، نیلے، جھنڈ اور نہر کے دونوں اطراف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پھیلے ہوئے گرد آلود دیہات کا جائزہ لیتا۔ اگلے چار ماہ میں، وہ اس علاقے سے اتنا آشنا ہو چکا تھا کہ جب وہ عشروں سے ان دیہات میں آباد کسانوں سے گفتگو کرتا تو وہ حیرت زدہ رہ جاتے۔

وہ ایک اعلیٰ افسر نہیں تھا اور جنگ میں اسے محدود ذمہ داریاں انجام دینا تھیں، لیکن وہ اس طرح متحرک دکھائی دیتا گویا ذمہ داری کا سارا بوجھ اسی پر ہے۔ وہ اپنے پرتو بچوں کو بتاتا کہ جنگ وہ جیتتا ہے، جو دوسروں سے زیادہ مستعد، چست اور اہل ہو۔ اس کے افسر اور جوان دیکھتے تھے کہ جب وہ جنگ، مقابلے اور سرحد پار والوں کی بات کرتا ہے تو اس کا لہجہ مچان پر بیٹھے شکاری کی طرح سخت ہو جاتا ہے۔ وہ انہیں بھارتی اور ہندوستانی نہیں کافر اور ہندو کہتا تھا۔ 1947ء کے فسادات اور ہجرت کا سفر اس کے دل میں بالکل گزرے ہوئے کل کی طرح تازہ دکھائی دیتا تھا۔

اس کے لئے جنگ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو اچانک آپڑنے والے ایک امتحان کی

طرح نمودار ہوتی ہے، اس کے لئے تو یہ مستقل دشمنی، اور مستقل معرکہ آرائی تھی، وہ مقابلہ جو ہزار برس سے جاری تھا اور معلوم نہیں کب تک جاری رہنا تھا۔ جب کبھی وہ گفتگو پر آمادہ ہوتا اور اپنے جوانوں میں احساس کی آگ کو زیادہ روشن کرنا چاہتا تو اس موضوع پر اختصار لیکن روانی اور کسی قدر جوش کے ساتھ گفتگو کرتا۔ وہ اپنی رجمنٹ کی توپوں اور جوانوں کو ادھر ادھر حرکت دیتا رہتا۔ جیسے مستقل طور پر ان کا امتحان لے رہا ہو۔ وہ ہمیشہ اس سوال پر بحث کرتا رہتا کہ کسی کام کو زیادہ سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ، کم از کم وقت میں انجام دینے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔

اس کے قریبی لوگ جانتے تھے کہ وہ خود کتنا سخت جان اور کس قدر مرتب آدمی ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ صحت کے معاملے میں بے پناہ حساس واقع ہوا ہے اور ایک ہمیشہ قائم رہنے والی ضد کے ساتھ ایسے کسی بھی مشغلے اور مصروفیت سے گریز کرتا ہے، جس سے اس کی تندرستی متاثر ہو۔ اور یہ تو سب کو معلوم تھا کہ وہ جنگی مہارت کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔ اس کے لئے وہی لوگ پسندیدہ تھے جو اپنے ہنر کو بہتر بنانے اور ہمیشہ سیکھنے میں لگے رہتے ہیں۔ غیر متوجہ اور کاہل لوگوں کے لئے اس کے دل میں کوئی عزت نہیں تھی۔ وہ بادہ نوشوں پر کھلاڑیوں کو اور خیالات میں کھوئے رہنے والوں پر مستعد اور بیدار لوگوں کو ترجیح دیتا تھا۔ اس کی شہرت ایک ایسے شخص کی ہوگئی تھی، جو زیادہ سے زیادہ معقول اور متعلق چیزوں سے واسطہ رکھنا چاہتا ہے، جو کام کے دوران دباؤ کا شکار نہیں ہوتا اور خود کو دوسروں سے زیادہ کامیاب دیکھنا چاہتا ہے اور اسی طرح اپنی بیٹری اور کمپنی کو بھی۔ کام میں کوتاہی برتنے والوں پر وہ بعض اوقات برہم ہو جاتا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ زندگی ایک چیلنج ہے، جس کا سامنا مستعدی، محنت اور اخلاص اور نظم ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ سب جانتے تھے کہ وہ بھارت سے نفرت کرتا ہے اور اتنی شدت سے اس سے قرض چکانے کا آرزو مند ہے گویا یہ اس کی ذاتی عزت کا مسئلہ ہو۔ اسے بعض لوگ اس کی کمزوری بھی قرار دیتے

تھے۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ آدمی کو کسی بھی ایسے کام سے گریز کرنا چاہئے، جس سے اس کی عزت پر حرف آئے، جب اس سے سوال کیا جائے تو وہ کہتا تھا کہ زندگی کی راحت معرکہ آرائی اور ان کامیابیوں میں ہے، جو مسلسل محنت سے حاصل کی جاتی ہیں وہ مطالعہ کا شوقین دکھائی نہ دیتا تھا اور نہ ہی فکری بحثوں کا، لیکن اس کے قریبی لوگ دیکھتے تھے کہ ہنگامی حالات میں بھی اپنے معمولات جاری رکھنے والے آدمی کے کمرے میں عسکری تاریخ کی ایک کتاب دکھائی دیتی ہے جس کے چند اوراق کا وہ روزانہ مطالعہ کرتا اور کبھی کبھار اس پر تبادلہ خیال کرتا ہے۔ اس کے لئے زندگی، چند اصولوں کی سختی سے پاسداری، عزم اور وفا کا نام تھا، اور یہ زندگی کھلے میدانوں، جنگ کے محاذ اور ان کھیتوں میں تھی، جہاں وہ بدترین مصروفیت میں بھی انتہائی باقاعدگی کے ساتھ سیر کرنے جاتا۔

وہ مذہبی موضوعات پر زیادہ بات نہیں کرتا تھا، لیکن کبھی کبھار جب آوارگی، بادہ نوشی یا فریب دہی کا کوئی واقعہ اس کے علم میں لایا جاتا یا اسے فیصلہ کرنے کو کہا جاتا تو اس کے چہرے پر تکدر کے آثار ابھرتے، اپنے ٹھہرے ہوئے مضبوط لہجے میں وہ کہتا آدمی کو خدا سے ڈرنا چاہئے وہ لوگوں کی مذمت کرنے میں جلدی سے کام نہیں لیتا تھا اور جب کسی پر بہتان لگایا جاتا تو وہ دوسروں کی طرح غیبت کی بدمزہ جگالی کی بجائے ثبوت طلب کرتا۔ لوگ دیکھتے کہ جمعہ کی دوپہر کو وہ کرتا شلوار پہنتا اور اہتمام سے جمعہ ادا کرنے جاتا، لیکن کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ باقی کی نمازیں بھی ادا کرتا ہے یا نہیں۔

کشمیر میں آپریشن جبرالٹر کے بعد جو ذہنی طور پر مفلس اور مہم پیشہ لوگوں کی مرتب کی گئی ایک مہم تھی، ملک کی سرحدوں پر جنگ کی حرارت محسوس کی جا رہی تھی۔ اگرچہ مسٹر بھٹو کی وزارت خارجہ کو یقین تھا کہ بھارت بین الاقوامی سرحد عبور نہیں کرے گا لیکن کم قامت شاستری پاکستان کو سبق سکھانے اور اپنی پسند کا محاذ کھولنے کی دھمکی

دے رہا تھا۔

6 ستمبر کو جنگ کی پہلی گولی چلی تو میجر اختر عبدالرحمن بنگالی گاؤں کے خیمے سے دو میل جنوب میں لدھشن کی زمنمل ماونڈ پوسٹ میں چلے گئے جو امرودوں کے ایک مختصر سے باغ میں قائم کی گئی تھی۔ جس جنگ کے لئے میجر پچھلے چار پانچ ماہ سے اس قدر مستعد تھا، اس نے ایک کمزور وقت میں اسے آلیا۔ اسے تین روز پہلے پیچش کی تکلیف ہوگئی تھی۔ محاذ جنگ پر موزوں دوائیں دستیاب تھیں اور نہ پھل اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا، بھاگ دوڑ میں کمی کر دی اور وہ دہی سے اپنا علاج کر رہا تھا۔ اپنی علالت نے اسے تھوڑا سا پریشان تو کیا، لیکن وہ اس پہلو سے پوری طرح مطمئن تھا کہ وہ ماتحت بیٹریوں کی نقل و حرکت اور توپوں کی پوزیشنوں کے بارے میں پہلے ہی مکمل جزئیات کے ساتھ پوری تیاری کر چکا تھا۔

6 ستمبر کی صبح جب برکی سے آگے، برکہ کلاں کے پاس سے، جہاں ہڈیارہ سیم نالہ اب بھی پہلی سی بیزار خاموشی کے ساتھ بہتا ہے، میجر شفقت بلوچ نے وائرلیس پر بھارتی ٹینکوں کے حرکت میں آنے اور حملے کے آغاز کی خبر دی تو میجر اپنی بیماری بھول کر چوکس ہوگیا اور اس کے قریبی لوگوں کے سوا کسی کو اندازہ تک نہ ہو سکا کہ وہ تکلیف میں ہے۔ اس وقت وہ ایک دفاعی منصوبے پر کام کر رہا تھا، جس کے تحت جنگ شروع ہوتے ہی اگلے مورچوں پر متعین توپچیوں کو برق رفتاری کے ساتھ بی آر بی نہر کے اس طرف منتقل ہو جانا تھا، جب میجر شفقت بلوچ اپنے جوانوں کو لے کر پیچھے ہٹ رہا تھا میجر اختر نے بھی برکہ کلاں میں متعین اپنی بیٹری کو پہلے سے طے شدہ اس منصوبے کے مطابق نہر پار کرنے کا حکم دیا۔

مشکل یہ آن پڑی کہ توپ کھینچنے والی ایک لاری Tower آخری وقت پر خراب ہوگئی۔ کیپٹن قاضی نے میجر کو مسئلے سے آگاہ کیا تو اس نے دوٹوک انداز میں کہا کہ ہر حال میں تمام توپوں کی واپسی ضروری ہے۔ چنانچہ بھاگ دوڑ کرتے لوگ پہلی پانچ

توپوں کو واپس لے جانے والی لاریوں میں سے ایک کو واپس لائے اس وقت دن کا ایک بج رہا تھا، آسمان سے آگ برس رہی تھی، برکی کا پل بہت دور دکھائی دیتا تھا اور اسے اڑانے کے لئے فلیتے کو آگ لگائی جا چکی تھی۔ جب برکہ کلاں سے آخری 105 ہوئزر توپ اس پر سے گزری تو چند لمحے بعد پل ایک دھماکے سے اڑا اور اس کے ٹکڑے فضا میں بکھر گئے۔ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کیپٹن قاضی نے وائرلیس پر اطلاع دی کہ وہ توپ واپس لے آیا ہے۔

میجر کو یقین تھا کہ دوسری رجمنٹوں کے مقابلے میں اس کے آدمی زیادہ سرعت کے ساتھ حرکت کر سکتے ہیں، لہذا پیچھے ہٹنے اور پھر ضرورت کے مطابق گولہ باری کرنے کے عمل میں اسے گھبراہٹ کا سامنا نہیں تھا پوزیشن نمبر 9 پر چلے جاؤ وہ قطعی اور صاف انداز میں کہتا اور تفصیل بیان نہ کرتا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے لوگ ان جزئیات پر صحت کے ساتھ عمل کریں گے جو وہ انہیں بار بار ازبر کرا چکا ہے اور یہ کہ دشمن وائرلیس پر اس کی بات سن پائے تو اس کے پلے کچھ نہیں پڑے گا۔ اس کے توپچی گولوں پر چاک سے اللہ اکبر لکھتے اور آگ برساتے رہے۔ وہ ان سے بے خطا نشانے کی توقع رکھتا تھا اور وہ خود کو اس کی نگراں آنکھوں کے سائے تلے محسوس کرتے تھے، جیسے وہ ان میں سے ہر ایک کا اعمالنامہ مرتب کر رہا ہو۔

7 ستمبر کی صبح میجر کو اچانک آرٹلری بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں طلب کر لیا گیا۔ اس کا بریگیڈ میجر اچانک بیمار ہو گیا تھا اور اب اسے ڈویژنل ہیڈ کوارٹر میں فرائض انجام دینا تھے۔ اپنے تین ہم منصبوں میں سے بہترین افسر کے طور پر اس کی شہرت اور گزشتہ روز کی غیر معمولی کارکردگی تھی، جو اسے یہاں لے آئی تھی۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ اپنے بریگیڈ میجر کی طرح وہ خود بھی بیماری کا شکار ہے اور اس وقت جب لاہور ابھی خطرے میں تھا اس نے خود بھی کسی کو یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

جیسے ہی وہ آرٹلری کے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں داخل ہوا جو پیچھے لاہور چھاؤنی کی

حدود میں واقع تھا، اسے اطلاع ملی کی بھارتی ٹینک برکی کلاں کے قریب پہنچ گئے ہیں، آبزرور کا کہنا تھا کہ وہ ہڈیارہ ہیم نالہ، بی آر بی سائفن کے نیچے سے گزر کر لاہور کی طرف بڑھ سکتے ہیں۔ اگر ایسا تھا تو یہ ایک بڑی خطرناک صورتحال تھی۔ میجر حیرت کے ساتھ بڑبڑایا کہ بھارتی اتنے طباع اور بہادر کب سے ہو گئے۔ اس وقت میجر کا کوارٹر ماسٹر بھی قریبی علاقے میں موجود تھا۔ میجر نے اس سے وائرلیس پر رابطہ کر کے صورت حال معلوم کرنے کا حکم دیا اور بے تابی کے ساتھ انتظار کرنے لگا۔ کپتان اپنی بے نشان جیپ میں سائفن کے نیچے سے گزر کر قریب جا پہنچا یہاں کوئی ٹینک نہ تھا لیکن اسلحہ اور گولہ بارود سے بھری گاڑیاں ضرور موجود تھیں۔ اس نے میجر کو ان کی پوزیشنوں سے آگاہ کیا اور فائر کرنے کو کہا۔ ان بھارتی ٹرکوں کے قریب سے گزرتے ہوئے جن پر پاکستانیوں سے ملتے جلتے رنگ کی وردیوں والے بھارتی فوجی سوار تھے، کپتان کچھ دیر میں واپس چلا آیا۔

8 ستمبر کی رات آ گئی اور اگرچہ دشمن کی پیش قدمی رکی ہوئی تھی لیکن اس کا دباؤ ختم نہ ہوا تھا۔ لاہور چھاؤنی سے سیالکوٹ کی طرف بھیجے جانے والی کچھ توپیں، ہوائی حملے کے اندیشے سے ادھر ادھر پھیلا دی گئی تھیں، میجر کو ان کے بارے میں معلوم ہوا تو اس نے آرٹلری کمانڈر بریگیڈیئر جمیل اختر عزیز سے رابطہ قائم کیا اور کہا کہ سیالکوٹ روانہ کرنے سے پہلے یہ توپیں برکی پر دشمن کا دباؤ ختم کرنے کے لئے استعمال کی جائیں، چنانچہ ڈویژنل کمانڈر میجر جنرل سرفراز کے مشورے سے جنہوں نے بعد میں سینے پر ہاتھ مار کر کہا تھا کہ انہوں نے لاہور کے خوبصورت چہرے پر ایک خراش تک نہیں آنے دی، ایسا ہی کیا گیا۔

جنگ کے میدان میں اور بہت سے نازک مرحلے بھی آئے۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ توپوں کے لئے گولوں کی فراہمی کے عمل میں گاڑیوں کی کمی کا مسئلہ درپیش ہو گیا۔ 24 فیلڈ رجمنٹ کا اسلحہ ڈپو ہوائی اڈے کے قریب واقع تھا۔ جنگ جاری تھی

اور شہر سے ٹرک تلاش کرنے میں وقت ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا، چنانچہ ہوائی اڈے کے ساؤنڈ سسٹم سے اعلان کرایا گیا کہ محاذ جنگ پر گولے لے جانے کے لئے گاڑیوں کی ضرورت ہے۔ کچھ ہی دیر میں اعلان کردہ مقام پر چمکدار مرسڈیزوں سمیت ہر طرح کی گاڑیوں کی ایک لمبی قطار دکھائی دینے لگی۔ جنگی تاریخ میں شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہوگا کہ کاروں میں گولہ بارود ڈھویا گیا ہو اس قوم اور اس سپاہ کو جو اس انداز سے جنگ کا سامنا کرتی تھی، کون شکست دے سکتا تھا۔

بھارتیوں نے دوسرا حملہ واہگہ کے محاذ پر کیا تھا، جو لاہور کی فتح کے بارے میں اس قدر پر یقین تھے کہ ان کے ایماء پر بی بی سی نے پہلے ہی فتح کی خبر جاری کر دی تھی۔ 24 فیلڈ رجمنٹ کی طرح یہاں 21 فیلڈ رجمنٹ کے توپچیوں نے انفنٹری کے ان بہادروں کے ساتھ مل کر دشمن کا مقابلہ کیا، جن کے کارنامے تاریخ کا حصہ ہیں۔

9 ستمبر کی رات حملے کا زور ٹوٹ گیا اور دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ اب بھارت کا مذاق اڑا رہے تھے، جو اپنے سے تعداد میں کم فوج کا سامنا نہ کر سکا، جو ایک طرف تو اس قدر پر امید تھا کہ اس نے لاہور کے لئے (اشونی مار نام کے) ایک شخص کو پہلے سے سول ایڈمنسٹریٹر مقرر کر رکھا تھا اور اس کے افسر لاہور کے جمخانہ کلب میں جام لنڈھانے کے منصوبے بنا رہے تھے اور دوسری طرف ان کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک پوری کور کے حملے سے بی آر بی نہر عبور نہ کر سکے۔

آرٹلری مانڈ پوسٹ سے میجر کا گھر صرف چار سو گز کے فاصلے پر تھا، جہاں اس کی بیوی اور کم عمر بچے جنگ کی بے یقینی کا شکار تھے، اولین دنوں میں تو ایک آدھ بار اس نے ٹیلی فون پر ان کی خیریت معلوم کی لیکن پھر اس کے خاندان والوں کو پتہ نہ چل سکا کہ وہ کہاں ہے۔ شاید وہ اپنے کام میں اس قدر مگن تھا کہ اس نے رابطہ کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی یا شاید اسے اس احساس نے آلیا تھا کہ اپنی ذمہ داریوں کو

پورا کرنے کے لئے اسے ہر چیز سے رابطہ منقطع کر لینا چاہئے۔ گھر میں اس کی بیوی، اپنے سرتاج کی سلامتی کی دعائیں مانگتے ہوئے نفلی روزوں کی منتیں مان رہی تھی۔ ایک ماہ، دو ماہ، چار ماہ، چھ ماہ اور وہ وائرلیس سیٹ پر جھکا ہدایت دینے میں محو تھا۔ اب اس پر ایک سے زیادہ رجمنٹوں کی ذمہ داری تھی اور وہ ہمیشہ سے زیادہ انہماک اور احساس ذمہ داری کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ دشمن کی تعداد تین گنا سے زیادہ تھی اور پیچھے لاہور شہر اپنے لاکھوں مکینوں کے ساتھ پھیلا ہوا تھا۔

اس وقت 84 گھنٹے گزر چکے تھے جب جنگ میں قرار کا لمحہ آیا۔ لاہور پر قبضے کی خبر دینے والی بی بی سی کی وضاحتیں جاری کر رہی تھی اور غیر ملکی اخبار نویسوں نے بے عیب استری والی وردیوں میں ملبوس افسروں کو مسکراتے اور جوانوں کو اللہ اکبر کے نعرے لگاتے دیکھا۔ 9 ستمبر کی رات وہ پہلی بار چند گھنٹے کے لئے آرام کی نیند سویا۔ اسے سب سے زیادہ اطمینان اس بات پر تھا کہ اس کے توپچی اس کے تربیت کردہ معیار پر پورے اترے تھے۔ انہوں نے 60,65 گولوں کی بجائے جو ایک عام اوسط ہے، گھنٹے بھر میں 120 گولے برسائے حتیٰ کہ توپوں کے دہانے سرخ ہو گئے تھے۔ اس نے سچ کر دکھایا تھا کہ نشانہ توپ نہیں توپچی لگاتا ہے۔ لاہور کے محاذ پر پھیلی ہوئی سپاہ نے شجاعت کی تاریخ میں ایک باب کا اضافہ کیا تھا اور اس میں میجر کے ساتھی دوسروں سے بہتر رہے تھے۔

لاہور شاداں و فرحاں تھا اور جوش و جذبے سے ابلتا ہوا، وقت سے پہلے ہی اپنی فتح کا جشن منا رہا تھا، چند روز میں جنگ بند ہو گئی لیکن دوسروں کے لئے میجر اختر عبدالرحمن کے لئے نہیں، اسے ایک دوسرے محاذ سے بلاوا آ گیا اور اس وقت جب لوگ کہہ رہے تھے کہ لاہور کو اللہ، آرٹلری اور ایئر فورس نے بچا لیا، وہ ایک دوسرے میدان جنگ کی طرف کوچ کر رہا تھا۔ جنگ بند ہو گئی لیکن راجستھان میں، جہاں پاکستانی فوج نے دشمن کے سب سے زیادہ علاقے پر قبضہ کیا تھا، صحرا کی خاموشی بار

بارود تی رہی۔ ستمبر کے آخری ہفتے اور اکتوبر کے اوائل میں مسلسل خبریں آتی رہیں کہ بھارتی دستے چھنا ہوا علاقہ واپس لینے کی سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں شاید وہ چاہتے تھے کہ مذاکرات کی میز پر جنگی قیدیوں کے تبادلے اور علاقوں کی واپسی کا مرحلہ آئے تو بہتر پوزیشن میں ہوں اور اپنی پسند کی شرائط منوا سکیں۔

اب جی ایچ کیو میں سوال یہ تھا کہ کیا راجستھان میں کچھ اور فوج بھجوائی جا سکتی ہے، جہاں دو پاکستانی ڈویژن دو کور بھارتی فوج کے مدمقابل ہیں۔ واضح طور پر اس سوال کا جواب نفی میں تھا کہ اگرچہ جنگ بندی ہو چکی تھی، لیکن دونوں طرف کے فوجی اب بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بیٹھے ہوئے تھے اور گاہے بگاہے جھڑپیں اب بھی ہوتی تھیں اور خطرات ابھی ٹلے نہیں تھے۔

اکتوبر کے آخر میں بریگیڈ میجر کے فرائض انجام دینے والے اختر عبدالرحمن اب لیفٹیننٹ کرنل ہو گئے تھے، ایک روز اچانک حکم ہوا کہ وہ توپخانے کے عسکری مرکز نوشہرہ چھاؤنی روانہ ہو جائیں، جہاں ان کو ایک نئی رجمنٹ تشکیل دینی ہے۔ انہیں تیاری کے لئے تھوڑا سا وقت ہی دیا گیا، لیکن انہیں درحقیقت کوئی تیاری کرنا ہی نہ تھی۔ میجر نے اپنے گھر کا چکر لگایا، بیوی بچوں کو نئی ذمہ داری سے آگاہ کیا، سامان سمیٹا اور لاہور کے ریلوے سٹیشن سے پہلی گاڑی پکڑی اور نوشہرہ کے لئے روانہ ہو گیا۔

اگلے دو روز میں سارے میجر، کپتان، لیفٹیننٹ اور جوان نوشہرہ چھاؤنی پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے ایک چھوٹی سی میز کے سامنے بیٹھ کر ایک گورے چٹے افسر کو دیکھا جو مال مستعدی لیکن اس اعتماد کے ساتھ کام کر رہا تھا، گویا ہفتوں سے اسی پر مامور ہو۔ یہ فوج کے عام ماحول کے برعکس تھا، ساز و سامان، کروفر اور نہ شان و شوکت، ایک میز، چند کرسیاں اور تھوڑے سے کاغذ۔

اس نے زیادہ صلاح مشورہ نہیں کیا۔ نوواردوں کی فہرستیں بنائیں، افسروں سے

مختصر سی گفتگو کر کے ان کے پس منظر اور مزاج کو سمجھنے کی کوشش کی، جوانوں کو ان کے سپرد کیا اور تیزی سے ذمہ داریوں کی تقسیم کرنے لگا۔ ہمیں جلد میدان جنگ میں پہنچنا اور جنگ میں شریک ہونا ہے اس نے اپنے افسروں اور جوانوں کو بتایا۔ چار دن میں نئی رجمنٹ تشکیل پا چکی تھی۔

سات سو سے زیادہ جوان اور افسر گاڑیوں میں سوار ہوئے اور میدان جنگ کی طرف روانہ ہو گئے۔ انہیں نوشہرہ سے حیدر آباد اور پھر وہاں سے راجستھان کے صحرا میں پہنچنا تھا، جہاں راتیں سرد تھیں اور دنوں میں درجہ حرارت اب بھی 120 تک جا پہنچتا تھا۔ ہنگامی طور پر تشکیل پانے والی یہ رجمنٹ کئی اعتبار سے مختلف تھی۔ اس میں داڑھیوں اور عینکوں والے وہ بڈھے شامل تھے جنہیں ریٹائرمنٹ کی زندگی گزارتے کئی سال گزر چکے تھے۔ ان میں وہ غیر فوجی ڈرائیور بھی تھے جو چرس پیتے تھے اور دوسری طرف وہ لوگ تھے جو فراغت کی زندگی میں زیادہ سختی کے ساتھ عبادات کی پابندی کرنے لگے تھے۔

لیفٹیننٹ کرنل نے بڑی پھرتی کے ساتھ آبزرویشن، کمیونی کیشن، ایڈمنسٹریشن اور گنرز کی ٹیمیں تشکیل دیں، لیکن وہ آدمی جس نے ساری سپاہیانہ زندگی میں افسروں اور جوانوں کی ٹریننگ پر سب سے زیادہ زور دیا تھا۔ اس خیال سے مسلسل مضطرب تھا کہ یہ ڈھیلی ڈھالی یونٹ موزوں کارکردگی کا مظاہرہ کیسے کرے گی؟ وہ دوسروں سے بڑھ کر جانتا تھا کہ اگر ایک رجمنٹ ایک ٹیم کی طرح بروئے کار نہیں آسکتی تو اس سے کسی نتیجے کی توقع نہیں کرنی چاہئے۔

چنانچہ اس نے ریل کے سفر کے دوران تربیت کا عمل جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ گاڑی کی کھلی بوگیوں میں توپیں نصب تھیں، جب اس کی طرف سے دی جانے والی ہدایات کی روشنی میں افسروں نے جنگی درس کا سلسلہ جاری رکھا تا کہ لوگ باہم گھل مل جائیں، وہ تیزی سے بروئے کار آسکیں، ایک دوسرے کو خوب سمجھ لیں اور جب

وہ جنگ کے میدان میں اتریں تو تماشائیوں کی طرح الٹی سیدھی حرکتیں نہ کرنے لگیں۔ 48 گھنٹے کے بعد جب ریل گاڑی حیدرآباد کے ریلوے سٹیشن پر پہنچی تو وہ کتنا کچھ سیکھ چکے تھے؟ یہ اصل سوال نہیں تھا۔ بات تو بس اتنی تھی کہ ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا جائے اور بہترین طور پر جو تدبیر کی جاسکتی ہے، اس میں کمی نہ کی جائے۔

انہوں نے حیدرآباد سے آگے چوہر ریلوے سٹیشن تک اسی گاڑی میں سفر کیا، لیکن اب یہ گاڑی انہیں موناباؤ سے آگے واسرباہ ریلوے سٹیشن تک نہیں لے جاسکتی تھی جہاں ریل کی پٹڑی یکایک مختصر ہو جاتی ہے۔ یہاں کمانڈنگ افسر نے سامان اتارنے کے عمل کی نگرانی کی اور اپنی رجمنٹ کو بتایا کہ اب انہیں زمینی راستے سے سفر کرنا ہے۔ اس نوتشکیل رجمنٹ کے ایک کپتان کو زمینی قافلے کی ذمہ داری سونپی اور خود چھوٹی لائن پر چلنے والی مخصوص ریل گاڑی میں سوار ہو کر واسرباہ روانہ ہو گیا۔

سڑک سے جانے والا قافلہ جو دوپہر کا کھانا ساتھ لے کر چلا تھا، ڈوبتے سورج کی شفق میں چوہر نامی ریلوے سٹیشن کے قریب رکا تاکہ شام کا کھانا کھا لیا جائے، دھول میں اٹی گاڑیوں کا جائزہ لیا جائے، صحرا کے سفر کے لئے چھاگلیں بھر لی جائیں اور جوان صبح کاذب تک آرام کے چند گھنٹے گزار لیں۔

خیمے گاڑے ابھی کچھ دیر گزری تھی کہ ایک بنگالی افسر کانوائے کے نگران کیپٹن ترمذی کی تلاش میں نکلا۔ اس نے کپتان کو بتایا کہ سی او (سی او) وائرلیس پر ان سے بات کرنا چاہتا ہے سی او صاحب واسرباہ پہنچ چکے تھے اور بے تابی کے ساتھ اپنی یونٹ کے منتظر تھے۔ جب انہیں بتایا گیا کہ جوان آرام کرنے کے لئے رک گئے ہیں اور صبح سویرے ازسرنو سفر کا آغاز کریں تو تو کمانڈنگ افسر نے کپتان کو بیچ ہی میں ٹوکتے ہوئے حکم دیا کہ وہ کھانا کھانے کے فوراً بعد خیمے اکھاڑیں اور سفر پر روانہ ہو جائیں۔ وہ جنگ میں شرکت کے لئے بے چین تھا۔

کپتان نے لیفٹیننٹ کرنل کو بتایا کہ خراب ہو جانے والی ایک گاڑی کو وہ پیچھے چھوڑ

آئے ہیں، کئی ٹرکوں کے پہیے پنکچر ہو چکے ہیں اور جیپیں چلانے والے غیر فوجی ڈرائیور بری طرح تھک چکے ہیں، لیکن اس کا حکم اٹل تھا، اکتوبر کے آخری دنوں میں دم بدم سرد ہوتے صحرا کی تازہ ہوا میں رات کا یہ سفر اس کپتان کو آج بھی اچھی طرح سے یاد ہے، جس نے بعد ازاں بریگیڈیئر کے منصب پر ترقی پائی۔

''دشمن کی فضائیہ کے حملے سے بچنے کے لئے ہم نے گاڑیوں کی روشنیاں بجھا رکھی تھیں اور صحرا کی ریت پر ستاروں کی روشنی میں سفر کر رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ تین دن سے محو سفر ڈرائیوروں کی ہڈیاں درد سے چیخ رہی ہیں لیکن ہمیں ہر حال میں سفر جاری رکھنا تھا۔''

صبح کے چار بجے جب صبح کاذب سے صبح صادق کی مدھم اور پر اسرار روشنی پھوٹ رہی تھی، وہ واسر باہ ریلوے سٹیشن کے عقب میں پہنچے تو انہوں نے کرنل کو منتظر پایا۔ صحرا کی نرم ہوا میں وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے، انتظار میں کھڑا تھا۔

اس نے انہیں تھوڑی دیر ستا کر ناشتہ کرنے کو کہا اور بتایا کہ وہ مختلف بیٹریوں کے لئے ان مقامات کا تعین کر چکا ہے، جہاں سے انہیں صحرا کی جنگ میں شریک ہونا ہے اس وقت 14،12 میل کے فاصلے پر واقع جنگ کا میدان جاگ رہا تھا۔

رجمنٹ کے افسروں کو جنہوں نے پہلے ہی دن ایک کامران معرکے میں شرکت کی اور اگلے کئی ہفتے بلند مورال کے ساتھ صحرا میں گزارے، اپنے کمانڈنگ افسر کا پہلا حکم آج تک یاد ہے میری یونٹ کا کوئی آدمی شراب نہیں پئے گا اس وقت جب بادہ نوشی برٹش آرمی کی جانشیں فوج کے معمولات میں سے ایک تھی، یہ قدرے حیران کر دینے والا ایک حکم تھا لیکن یہ کسی ابہام کے بغیر جاری کیا گیا تھا، لہٰذا زراب کی بوتلیں یونٹ کے سامان سے الگ کر دی گئیں۔

نئی یونٹ کو جنگ کے لئے انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اسی رات دشمن نے پاکستانی دستوں پر حملہ کر دیا، جو تعداد میں ایک چوتھائی سے بھی کم تھے۔ کرنل نے جو معرکے

کے لئے ذہنی طور پر یوں تیار دکھائی دیا، جیسے وہ ہفتوں سے اسی ادھیڑ بن میں ہو، اپنے توپچیوں سے کہا کہ وہ بے قراری کا مظاہرہ نہ کریں اور دشمن کو آگے آنے دیں۔ جب وہ قریب آ چکے اور پوری طرح ان کے گولوں کی زد میں آ گئے تو ایک شکاری کی طرح جو اپنے شکار کو ڈھونڈتا پھرا ہو، اس نے ان پر گولے برسانے کا حکم دیا۔ جال میں آئی ہوئی مچھلی کی طرح اب وہ مچھیروں کے ہاتھ میں تھے۔ کچھ ہی دیر میں سینکڑوں لاشیں آخر شب کی ٹھنڈی ریت پر تڑپ رہی تھیں۔ چند گھنٹوں میں ایک معرکہ اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ پاکستانی فوج کا ایک بھی سپاہی ہلاک تو کیا زخمی تک نہیں ہوا تھا۔ یہ تھا ایک ماندار معرکوں میں جینے اور فتح میں آسودگی حاصل کرنے والا ایک آدمی، جس کی ساری عمر کمال ہنر کی تلاش میں بیت گئی اور جو اپنی آدھی سے زیادہ جنگ، جنگ شروع ہونے سے پہلے کی تیاریوں اور تدبر میں لڑتا تھا۔ بھارتی خوفزدہ ہو کر بھاگے اور اپنے مرنے والوں کی لاشیں اٹھانے کے لئے نہیں آئے۔ جب رجمنٹ کے جوانوں اور افسروں نے کرنل سے اس بارے میں بات کرنا چاہی کہ صحرا میں سڑتی لاشوں کا کیا کیا جائے تو اس نے بے نیازی اور کس قدر سرد مہری سے کہا تمہیں اس کی کیا فکر ہے وہ خود ہی اگلی رات کی تاریکی میں انہیں اٹھا لے جائیں گے۔

پاکستانی فوج کے مقدر میں اب کچھ زیادہ معرکے نہیں تھے، اپنی محدود تعداد کے ساتھ، وہ پہلے ہی بہت سے علاقے پر قبضہ کر چکے تھے اور اگلے دنوں میں انہوں نے کچھ اور علاقہ ہتھیا لیا۔ بھارتیوں کا مورال ٹوٹ چکا تھا اور وہ ہوا میں زرد پتوں کی طرح اڑتے چلے جا رہے تھے۔ بعد میں اس جنگ میں شریک ایک کپتان نے کہا ہم ان سے کہتے تھے جانم! ذرا ٹھہرو تو سہی، چہرہ تو کراؤ، لیکن وہ تو بھاگتے ہی چلے جاتے تھے اب پاکستانی دستوں کو مزید آگے نہیں بڑھنا تھا کیونکہ زیادہ وسیع علاقے میں اگلے دستوں کے ساتھ موثر رابطہ (لائن آف کمیونی کیشن) ممکن نہ تھا، چنانچہ اگر

جنگ کی حالت باقی رہی لیکن اب خال خال ہی کوئی جھڑپ ہوتی۔ پاکستانیوں کے لئے اب یہ لڑائی سے زیادہ تفریح تھی۔ کبھی کبھار تو وہ کسی کتے کی دم کے ساتھ ٹین باندھ کر اسے بھارتیوں کی طرف بھگاتے اور فائرنگ کا تماشا دیکھتے۔ صحرا کی بیزار کن خاموشی ان لوگوں کو الجھن میں مبتلا کر رہی تھی جو دشمن کو فنا کرنے یا خود قتل ہونے کے لئے آئے تھے۔ ان میں سے جو اگلے مورچوں میں تھے، وہ زیادہ بیزار تھے۔ سارا دن آنکھوں سے دوربین لگائے رکھنا یا تاخیر سے موصول ہونے والے اخبار کی ایک ایک سطر پڑھ ڈالنا ایسے مشاغل نہیں تھے، جو بے چین لوگوں کی ساری توجہ جذب کر لیتے چنانچہ آبزرویشن کے بوریت کا شکار ایک کپتان کو اس وقت قدرے مسرت کا احساس ہوا جب اسے بتایا گیا کہ اسے کمانڈنگ افسر کے ایجوٹنٹ کی جگہ کام کرنا ہے، جو چند روز کی رخصت پر چلا گیا ہے۔

کمانڈر نے جو دوسروں کی طرح بیزاری اور بوریت کا شکار نہ تھا اور ہمیشہ کوئی مصروفیت ڈھونڈ نکالتا تھا، کپتان کو ایک تجزیہ لکھنے کا حکم دیا اور بتایا کہ جب وہ اپنا کام ختم کر چکے تو اسے نیند سے بیدار کر کے کاغذات اس کے حوالے کر دے۔ آدھی رات کو اس نے جھجکتے ہوئے کرنل کے خیمے پر دستک دی۔ پہلی آواز پر وہ اٹھ بیٹھا، اس نے سپرنگ سے حرکت کرنے والا پلنگ کا سرہانہ اوپر اٹھایا، لالٹین کی بتی بلند کی اور سرخ پنسل ہاتھ میں لے کر مسودہ پڑھنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اس پر درجنوں سرخ نشانات بنا چکا تھا۔

ہمیشہ بہترین کا مطالبہ کرنے والے آدمی کے ساتھ کام کرنا آسان نہیں تھا اور کبھی کبھار تو اس میں بڑے تلخ لمحے آتے۔ ایک روز کپتان نے کمانڈر کے حکم پر ایک عبارت لکھی اور اس کے خیمے میں داخل ہوا۔ اس نے چند پیراگراف پڑھے اور پھر مخصوص وضع کا فوجی پیڈ بیزاری کے ساتھ ہوا میں اچھال دیا۔ یہ کیا ہے؟ اس نے سختی اور ناراضی کے ساتھ اس سے کہا۔ لاہور میں پیدا ہونے اور پروان چڑھنے والے

حساس کپتان کے لئے یہ نا قابل برداشت ساعت تھی۔ اس نے ایڑیاں جما کر سلیوٹ کے اور کاغذ اٹھائے بغیر باہر نکل آیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ استعفے کے ساتھ ایک بار پھر کمانڈر کے سامنے پیش ہوا اور اس کے استفسار پر اس نے جواب دیا۔ Sir, i can not serve under you

توانا اور چست کرنل یہ جملہ سن کر اپنی کرسی سے اٹھا تو کپتان خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا، لیکن کرنل نے اسے جالیا پھر اس نے کافی کی دو پیالیاں طلب کیں، اسے اپنے سامنے بٹھالیا اور بتایا کہ آخر کار وہ ایک آدمی ہی تو ہے، جس پر بعض اوقات تلخی غالب آجاتی ہے۔ احساس توہین کا شکار کپتان کافی پیتا ہوا رو پڑا تو کرنل نے اٹھ کر اسے سینے سے لگالیا۔

کپتان کو یاد ہے کہ جب کچھ دنوں میں کمانڈر کا شیدائی ایجوٹنٹ لوٹ آیا، جسے اس کے فربہی مائل جسم کی وجہ سے بشیر موٹا کہا جاتا تھا تو ہمیشہ مصروف رہنے والے آدمی سے نجات کی نوید میں، وہ سکول کے بچے کی طرح خوشی سے اچھلا، اس نے اپنا بستر باندھ کر ٹرک پر پھینکا اور خود اس پر سوار ہونے والا تھا، جب اسے عقب سے کرنل کی آواز سنائی دی۔ CAPTAIN WHERE ARE YOU GOING (کپتان! تم کہاں جا رہے ہو) اس نے بتایا کہ کرنل کا ایجوٹنٹ چھٹی سے واپس آ گیا ہے تو کیا؟ اس نے کہا YOU ARE MY ADJOTENT AS LONG AS YOUR TWO LEGS CARRY YOU

یہ ایک رفاقت کا آغاز تھا، جو آنے والے سالوں میں پھلتی پھولتی رہی۔ کپتان نے پاکستان آرمی میں بریگیڈیر کا عہدہ پایا اور وہ ملک کے موثر ترین ادارے آئی ایس آئی میں ایک اہم منصب تک پہنچا، حتیٰ کہ ریٹائرمنٹ کا دن آ پہنچا لیکن یہ رفاقت کا اختتام نہیں تھا۔

اس روز وہ آدمی ملک سے باہر تھا جواب قلم و قرطاس میں جی لگانے کی کوشش کر رہا ہے، جب اس نے ہوٹل کے کمرے میں ٹیلی ویژن پر 17 اگست کے سانحہ کی خبر سنی۔ سکیورٹی کے نازک اسرار و رموز سے آشنا افسر بے ساختہ رو پڑا اور اس نے سوال کیا کہ ملک کا صدر، فوج کا سربراہ اور جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کا چیئرمین ایک ہی جہاز میں کیسے سوار ہو گئے؟ وہ آدمی، جس نے برسوں ہر شام سیر پر نکلنے والے آدمی کی نگہداشت کی تھی، جو گھر اور راستے کے درمیان کار کے روٹ کا تعین کرنے کے لئے اپنے باس کی ناراضگی مول لے سکتا تھا، سوچتا اور حیران ہوتا رہا۔ اب بھی وہ سوال کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وہ اس روز ڈیوٹی پر ہوتا تو جنرل کو کبھی اس سی 130 طیارے میں سوار نہ ہونے دیتا اور وہ بارہ گر سوال کرتا ہے کہ آخر یہ ہوا کیسے؟ کس نے اس کا اہتمام کیا، کس نے اس کی اجازت دی، اس کا منصوبہ کس نے بنایا؟

1965ء کے چھ سال بعد سپاہی ایک بار پھر جنگ کے میدان میں تھا، جواب بریگیڈیئر بن چکا تھا۔ قصور شہر سے ادھر حسینی والا کی کھاڑی میں اس نے دوسروں کے ساتھ ایک معرکے میں شرکت کی جو ملک کی عسکری تاریخ میں سنہری حروف سے رقم ہے اور دمکتے لفظوں میں یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن جب وہ فتح حاصل کر چکے تھے تو وہ ایک جنگلی مورچے میں روتے ہوا دیکھا گیا۔

یہ فیلڈ مارشل ایوب خان کے فوجی جانشین یحییٰ خان کا پاکستان تھا، جس میں انتخابات ہو چکے تھے اور فوجی صدر کی خواہشات اور اندازوں کے برعکس مشرقی پاکستان کی عوامی لیگ نے نصف سے زیادہ نشستیں حاصل کر کے حکومت بنانے کا حق جیت لیا تھا۔ یحییٰ خان جس سے سورج غروب ہونے کے بعد رابطہ کرنا مشکل ہوتا، عوامی لیگ کو اقتدار منتقل کرنے پر آمادہ نہ تھا، مغربی پاکستان کا سیاسی فاتح

ذوالفقار علی بھٹو اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لئے ڈھاکہ جانے والے ارکان کی ٹانگیں توڑ دینے کی دھمکی کے بعد ادھر ہم ادھر تم کا نعرہ لگا چکا تھا۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اقتدار چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا اور بھٹو اسمبلی کی مخالف بنچوں پر بیٹھنے کو تیار نہ تھا۔ انہوں نے عوامی لیگ کے خلاف ایکا کر لیا۔ نہ صرف پاکستان بلکہ بنگالیوں کی تاریخ میں پہلی بار تھا کہ انہیں حقیقی طور پر اقتدار حاصل ہونے والا تھا کہ سازشیوں نے ان کی راہ میں دیوار اٹھا دی۔ بھارت نے اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھایا۔ ہندوؤں، روس نواز بائیں بازو والوں اور انتہاپسندوں کی مدد سے انہوں نے نہ صرف عوامی لیگ کو فوج کے خلاف صف آرا کر دیا، بلکہ مارچ 1971ء میں جب قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی ہونے کے بعد ناراض بنگالی میدان میں نکلے اور فوج نے ان کے خلاف کارروائی کر کے حکومت کے معطل اور لرزتے اقتدار کو بحال کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے فوجی کارروائی سے خوفزدہ اور ناراض ہو کر سرحد پار کرنے والوں میں سے تخریب کار چنے، مکتی باہنی کے نام سے ان کی تنظیم قائم کی اور انہیں پاکستانی فوج کے خلاف میدان میں اتار دیا۔

مقامی آبادی کی ناراضگی اور شیخ مجیب الرحمٰن کی گرفتاری کے باوجود شاید تخریب کاری سے فوج کا شکست دینے کی کوشش ناکام رہتی کہ دوسری طرف ملک کو ہر حال میں متحد رکھنے کے آرزومند نوجوان البدر اور الشمس کے نام سے میدان میں نکل آئے تھے اور محب وطن قوتیں مشکل حالات میں بھی فوج سے تعاون پر آمادہ ہو گئی تھیں، لیکن پھر بھارت نے روس سے دوستی کا 25 سالہ معاہدہ کیا اور مشرقی سرحدوں پر جنگ چھیڑ دی۔ مشرقی پاکستان کے مانند ٹکا خان نے بے شعور سفاکی کے ساتھ ظلم و ستم کا ایک باب رقم کیا اور اب نعرہ باز جنرل نیازی ان کے جانشین تھے۔ اپنی ہی سرزمین پر انہوں نے اپنی ہی قوم کی عورتوں کے ساتھ زیادتی کے واقعات سے آنکھیں بند کر لیں۔

اس صورت حال میں جبکہ دس لاکھ سے زیادہ مہاجر بھارت جا چکے تھے، امریکہ اور مغربی یورپ، چین اور ایران سمیت ساری دنیا پاکستان سے سیاسی تصفیے کا مطالبہ کر رہی تھی، فوج کو اپنے ملک کا دفاع کرنا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھارتی فضائیہ نے مشرقی پاکستان میں موجود بیشتر پاکستانی طیاروں کو تباہ کر دیا، ہوائی اڈوں کو ادھیڑ ڈالا اور قدم بہ قدم آگے بڑھنے لگی۔ ایک کور پر مشتمل پیدل دستوں نے، جس کے جوان برسات زدہ موسم میں مہینوں سے مورچوں میں پڑے تھے، کمال شجاعت سے دشمن کا سامنا کیا۔ ان کی تعداد اور ساز و سامان محدود تھا، انہیں مقامی آبادی کی حمایت حاصل نہ تھی، ایک ہزار میل دور سے ان تک کمک پہنچنا آسان نہ تھا اور ان کی قیادت آوارگی اور ذہنی افلاس کا شکار تھی۔

ہمیشہ یہ بتایا گیا تھا کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی سرحدوں سے کیا جائے گا، لیکن اب مغربی سرحدوں پر پھیلے ہوئے دستوں کو کسی معجزے کا انتظار کرنے والے فوجی حکمرانوں نے کسی اقدام سے روک رکھا تھا تا آنکہ دسمبر کا پہلا ہفتہ شروع ہو گیا اور مشرقی پاکستان میں مشکل حالات میں فوج سے تعاون کرنے والی سیاسی قوتوں کے دباؤ کی وجہ سے اس کی اجازت دینے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا۔

حسینی والا سیکٹر میں بریگیڈیئر اختر عبدالرحمن دوسروں کی طرح معرکے کے منتظر تھے۔ اگرچہ یہ ایک بڑی ہی تکلیف دہ صورت حال تھی، فوجی دستوں میں بنگالیوں کی موجودگی، جن کے اجداد کبھی ایک الگ وطن کا مطالبہ کرنے والی مسلم لیگ کا سب سے سرگرم حصہ تھے، اب شکوک و شبہات پیدا کرنے والا ایک عنصر بن گئی تھی۔ فوج کی مرکزی قیادت، احتیاط کے تقاضوں کی بناء پر انہیں فوجی رازداری میں شریک نہ کرنے کا حکم صادر کر چکی تھی۔ حسینی والا سیکٹر میں خدمات انجام دینے والے ایک فوجی افسر کے بقول یہ اس طرح تھا، جیسے مقابلے کے میدان میں اترنے سے پہلے ایک باکسر کو بتایا جائے کہ وہ کینسر کا شکار ہو گیا ہے۔ جی ایچ کیو نے ہدایت جاری کی تھی

کہ ڈیفنس پلان کے تحت، جو جنگ کی صورت حال میں تک سک سے درست، مکمل طور پر تیار رکھا جاتا ہے، نیچے ہدایات جاری نہ کی جائیں اور اس سلسلے میں انتہائی راز داری سے کام لیا جائے۔

بریگیڈیئر اختر بار بار اپنی ڈویژن کے سربراہ میجر جنرل مجید ملک کے ساتھ اگلے مورچوں کے دورے پر گئے تھے۔ وہ ایک ایک یونٹ اور اگلے مورچوں میں جاتے رہے۔ 1965ء کی طرح انہوں نے گزشتہ ہفتوں میں اپر باری دوآب سے بی آر بی تک اور بی آر بی سے سرحد تک ایک، ایک کونہ چھان مارا تھا۔ ایک جارح تکنیکی جرنیل کی قربت میں، جو خود بھی آگے بڑھ کر لڑنے کا آرزومند تھا، انہوں نے دشمن سے نمٹنے کے لئے ایک جارحانہ منصوبہ بنایا تھا۔ انہوں نے اپنی توپیں اگلے سرحدی دیہات تک پھیلا دی تھیں، جس پر بعض افسر حیرت کا اظہار کرتے تھے کہ کیا حملے کی صورت میں ہم اپنی توپیں دشمن کے حوالے کرنے کی حماقت کے مرتکب نہیں ہوں گے، لیکن جنرل مجید ملک اور بریگیڈیئر اختر عبدالرحمن دشمن کو حملے کا موقعہ دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔

حملے کا وقت آیا تو صورت حال یہ تھی کہ صرف اڑھائی گھنٹے میں توپچیوں کو ٹاسک ٹیبل (توپوں کے استعمال کی تفصیلات) سے آگاہ کرنا تھا۔ عام حالات میں یہ توپخانے کے آپریٹر ہوتے ہیں جو وائرلیس کی مدد سے، پہلے سے مرتب کئے گئے خاکے کے مطابق توپچیوں کو تکنیکی زبان میں تفصیلی ہدایات جاری کرتے ہیں، لیکن اب اس کا وقت نہ تھا، چیتے کی طرح چوکنا بریگیڈیئر خود وائرلیس سیٹ پر آ بیٹھا اور اس نے تین میجروں کی مدد سے سرعت کے ساتھ یہ کام مکمل کیا۔

3 دسمبر کو شام سوا چھ بجے شروع ہونے والی یہ جنگ سرحد کے دونوں طرف بنائے گئے میلوں پر پھیلے ہوئے، آٹھ سے دس فٹ اونچے مٹی کے بندوں، قدرتی رکاوٹوں، جان پر کھیل کر فتح حاصل کرنے کے آرزومند پیدل دستوں اور توپچیوں کی جنگ

تھی۔ برصغیر کی عسکری تاریخ میں بہت کم ایسا ہوا ہوگا کہ حملے کا آغاز دن کی روشنی میں توپوں کی بے پناہ گولہ باری سے ہوا ہو پندرہ منٹ تک 13 آرٹلری یونٹوں کی توپیں دھاڑتی رہیں حتیٰ کہ پیدل دستے حرکت میں آگئے۔ سرحد کے اس پار دریائے ستلج بہہ رہا تھا اور اس سے نکلنے والی نہروں نے قدرتی رکاوٹیں کھڑی کر رکھی تھیں، جو 300 سے 600 فٹ تک چوڑی تھیں اور جن میں 15 فٹ تک گہرا پانی تھا۔ سرحد کے دونوں طرف قد آدم ہاتھی گھاس تھی، ان میں گڑھے کھود دیئے گئے تھے اور بارودی سرنگیں بچھی ہوئی تھیں۔ سرحد کے اس پار دشمن کے دومنزلہ مورچے تھے، جن سے ٹکرانے والے گولے بعض اوقات معمولی نقصان ہی پہنچا سکتے۔

لیکن پھر 3 پنجاب، 9 پنجاب، 19 پنجاب، 15 پنجاب اور 41 بلوچ کی بٹالین حرکت میں آئیں تو ایسا لگا کہ جیسے کسی نے مدتوں سے پنجروں میں بند بھوکے شیروں کو اذن عمل دے دیا ہے۔ مغربی سرحدوں کا دفاع کے بھارتی مصنف کے بقول پاکستانی فوجی ان سرکنڈوں سے گزر کر جس میں پھٹنے والی بارودی سرنگوں نے آگ دہکا دی تھی، مورچہ مورچہ لڑتے ہوئے آگے بڑھتے گئے تا آنکہ وہ سلیمانکی ہیڈورکس تک جا پہنچے، جس کی حفاظت کے لئے دشمن نے پختہ مورچوں، اور دفاعی تنصیبات کا ایک جال بچھا رکھا تھا۔

3 پنجاب کی بی کمپنی کے کیپٹن عارف سعید سب سے پہلے شہید ہونے والوں سے ایک تھے، جو دشمن کے مورچے کے قریب پہنچ کر مشین گن کی زد میں آگئے، لیکن شہادت سے قبل انہوں نے ایک دستی بم پھینک کر اس مورچے کو خاموش کر دیا۔ انہوں نے ساتھیوں کو چیخ کر آگے بڑھنے کے لئے کہا اور اپنے لہو میں نہا کر دم توڑ گئے۔ بی کمپنی کے کمانڈنگ افسر کرنل غلام حسین کو جو پیچھے کر پوسٹ میں تھے، صورت حال کا ادراک ہوا تو وہ شہید کپتان کی سٹین گن اٹھا کر آگے بڑھے اور اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے دشمن کی طرف لپکے، انہوں نے کم از کم دو مورچے صاف کر

ڈالے، جب وہ خود بھی شہید ہو گئے۔

کمانڈنگ افسر کے وائرلیس آپریٹر لانس حوالدار شاہراہ خان نے زخمی ہونے کے باوجود اپنے فرائض کی انجام دہی جاری رکھی اور کسی کو خبر نہ دی کہ کمانڈر شہادت پا چکا تھا تا آنکہ زخموں سے بے پناہ خون بہہ جانے کی وجہ سے خود اس کا آخری وقت آ پہنچا۔

اب رات کی سیاہی غالب آ رہی تھی اور پہلے مرحلے میں تحیر کے شکار دشمن نے جوابی حملے کا آغاز کر دیا تھا، اس مرحلے میں آرٹلری سے فائر کرنے کو کہا گیا، دشمن کا ایک ٹینک سلیمانکی ہیڈ ورکس کا پل عبور کر کے آگے بڑھ آیا تھا، لیکن توپوں نے اس قدر گولے برسائے کہ اسے واپس جانا پڑا۔ رات تاریک تر ہوتی چلی گئی اور مقابلے میں شدت آتی گئی۔ ایک بھارتی جرنیل کے بقول پاکستانی فوجی پاگلوں کی طرح آگ، گولہ باری اور بارودی سرنگوں کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے گئے تا آنکہ وہ پل کے قریب جا پہنچے۔ رات کے آخر پہر ایک دھماکے کی آواز سنائی دی، جیسا کہ اگلی صبح معلوم ہوا کہ پسپا ہوتے ہوئے دشمن نے پل کے پرلی طرف کے تین حصے اڑا دیئے تھے۔ اگلی صبح ادھر کچھ فاصلے پر واقع بھگت سنگھ کی سمادھی سے متصل قیصر ہند کے مختصر سے قلعہ پر بھی قبضہ کر لیا گیا، جہاں بھارتی پنجاب رجمنٹ کا ایک سیکشن آخری وقت تک مقابلے پر ڈٹا رہا تا آنکہ ٹینک کے ایک فائر نے آخری سکھ سپاہی کو خاموش کر ڈالا۔ اس مختصر سی جنگ میں جس کے غازی کھلے آسمانوں تلے نیم پختہ مورچوں میں اس حال میں پڑے تھے کہ ان کی توپوں کے دہانے صاف دکھائی دیتے تھے بریگیڈیئر اختر کی مان میں بروئے کار توپخانے کا کردار کیا تھا؟ راولپنڈی کے جی ایچ کیو میں فوجی ریکارڈ کے مطابق اس روز توپچیوں نے کمال کر دکھایا۔ 13 یونٹوں کی گولہ باری نے دشمن کو بے بس کر کے رکھ دیا۔ انہوں نے اسے اتنا شدید نقصان پہنچایا کہ وہ سنبھل ہی نہ سکا۔ بہت سی توپوں کو ایک جگہ جمع کرنے کی بجائے انہیں

دور تک ادھر ادھر پھیلا دیا گیا تھا، یہ حکمت عملی پوری طرح کامیاب رہی۔ توپخانے نے دشمن کا مورال تباہ کر دیا اور پاکستانی فوجیوں کے مورال کو بلند تر کرنے میں مدد دی۔

ایک مشکل لڑائی جیت لی گئی۔ قصور شہر کو بچا لیا گیا اور لاہور پر اس رخ سے پڑنے والے دباؤ کا راستہ روک دیا گیا۔ اگر جنرل مجید ملک اور بریگیڈیئر اختر عبدالرحمن کی تجویز مان کر انہیں کمک مہیا کی جاتی اور آگے بڑھنے کی اجازت دی جاتی تو وہ فیروز پور اور امرتسر کی طرف لپکتے، لیکن وہ احکامات کا انتظار کرتے رہے اور اس کی اجازت موصول نہ ہو سکی، تا آنکہ 17 دسمبر کا دن آ پہنچا۔

یہ شام کا وقت تھا، جب بریگیڈیئر ایک پختہ مورچے میں بیٹھے اپنے ایک معتمد میجر کے پاس گئے اور اسے بتایا کہ ابھی محاذ پر موصول ہونے والی اطلاع کے مطابق ڈھاکہ میں پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے 47 سالہ بریگیڈیئر رو دیا۔ بہت دیر تک وہ بے آواز آنسوؤں کے ساتھ روتا رہا، پھر وہ اٹھا اور اس نے کہا یہ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے تھا لیکن یہ صرف دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا معاملہ نہیں تھا۔ اس نے جنگ سے کئی سبق سیکھے۔ جب وہ آئی ایس آئی کا سربراہ بنا اور جب اس نے افغانستان میں ایک جنات کی قیادت کی تو اس نے یہ سبق یاد رکھے۔

ساتواں باب

رکاوٹوں والی دوڑ

وقت اور دوسروں سے ہمیشہ کچھ آگے رہنے کے آرزومند فوجی افسر نے 1970ء تک ترقی کی منزلیں بڑی آسانی اور سہولت سے طے کیں، جب وہ بریگیڈیئر بنا دیئے گئے، لیکن 1974ء میں انہیں فوجی زندگی کے سب سے پہلے صدمے سے واسطہ پڑا، جب ان کی ترقی روک دی گئی۔ اس کے بعد رکاوٹوں والی دوڑ کا ایک سلسلہ شروع ہوا نوجوان کی شہادت سے ایک سال پہلے تک جاری رہا۔

فروری 1947ء میں کمیشن حاصل کرنے والا افسر 1953ء میں میجر بنا، ستمبر 1965ء میں لاہور کے محاذِ جنگ پر انہوں نے لیفٹیننٹ کرنل بننے کی خوشخبری سنی، مارچ 1968ء میں وہ کرنل بنا دیئے گئے اور ایک سال بعد مارچ 1969ء میں بریگیڈیئر 1971ء کی جنگ میں شرکت کے بعد وہ کچھ عرصہ راولپنڈی میں رہے اور پھر جون 1973ء میں وہ باغ آزاد کشمیر میں بھجوا دیئے گئے، جہاں انہیں بری فوج کے بریگیڈ 6 اے کے کی قیادت کرنا تھی۔

قصبے سے الگ ایک خوبصورت وادی میں واقع بریگیڈ ہیڈکوارٹر سپاہی کو بہت بھلا معلوم ہوا، جسے دفتری اور شہری زندگی سے ایک وحشت سی تھی، یہ اس کی صلاحیتوں پر اعتماد کا اظہار تھا کہ کشمیر میں متعین دستے ملک کے دوسرے حصوں کی طرح نہیں ہوتے، جہاں بھارت سے 1948ء کی جنگ کے بعد سے سرحدیں غیر واضح چلی آ رہی ہیں۔ یہاں فوج حالت جنگ میں رہتی ہے، سپاہی دوربینیں لگا کر مورچوں میں بیٹھتے ہیں اور گاہے گاہے فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔

یہ ایک اور طرح کی زندگی تھی۔ سڑکیں ناپختہ تھیں، بریگیڈ ہیڈکوارٹر کے لئے ٹینکر میں پانی لایا جاتا اور جنریٹر سے فراہم کی جانے والی برقی رو جس کا سلسلہ غروب

آفتاب کے بعد شروع ہوتا، رات گیارہ بجے منقطع کر دیا جاتا۔ بریگیڈیئر کے بچے اب بڑے ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک مری میں زیر تعلیم تھا اور باقی لاہور میں۔

اسے بہت کم دفتر میں دیکھا جاتا۔ وہ سارا دن سگنلز، انجینئرز، ملٹری پولیس اور ٹرانسپورٹ والوں سے بات چیت اور بحث مباحثہ کرتا نظر آتا اور اس سے بھی زیادہ دور دور تک پھیلے ہوئے سپاہیوں کے مورچوں میں، جن کے گھر بار دور چکوال، جہلم، گوجر خان یا ساہیوال کے دیہات میں تھے۔ بلندیوں پر برف پگھلتی تو ندی نالوں میں سیلاب آ جاتا اور کسی سپاہی یا عام دیہاتی کے بہہ جانے کی خبر آتی۔ تکلیف دہ تنہائی ایک الگ عذاب تھی۔ ذہنی پراگندگی کی شدت کبھی کبھی کسی بہت ہی افسوسناک واقعہ کی خبر آتی۔ تکلیف دہ تنہائی ایک الگ عذاب تھی۔ ذہنی پراگندگی کی شدت کبھی کبھی کسی بہت ہی افسوسناک واقعہ کو جنم دیتی۔ بریگیڈیئر اب 48 سال کا ہو چکا تھا اور اس کے مزاج میں، وہ پہلی سی شدت نہیں رہی تھی، لیکن وہ اب بھی ڈسپلن کی خلاف ورزی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ تاہم اب وہ کبھی کبھی اس احساس سے مغلوب ہو کر رعایت دینے پر آمادہ ہو جاتا کہ اس کے رزم آرا جوان ایک مشکل زندگی گزار رہے ہیں۔ اسے ہر وقت یہ فکر لاحق رہتی کہ ان جوانوں کا مورال ہر حال میں بلند رہنا چاہئے، لہٰذا جب وہ ان کے ساتھ پر مشقت فوجی مشقوں میں شریک ہوتا یا ان سے کسی دوسری تقریب میں گفتگو کرتا تو ہمیشہ انہیں یاد دلاتا رہتا کہ وہ ایک مقدس فرض ادا کر رہے ہیں۔

بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں اس کی مختصر سی رہائش گاہ کے چاروں طرف چنار کے رنگ بدلتے اور منتظر اشجار ہوا میں جھومتے رہتے اور سارا وقت آبشار کی آواز سنائی دیتی جو راتوں کو زیادہ نمایاں اور رومان انگیز محسوس ہونے لگتی۔ اپنے لوگوں کی تربیت کے بارے میں وہ ہمیشہ کی طرح متفکر تھا۔ اسے گاڑیوں کو بہترین اور چالو حالت میں رکھنے کی فکر رہتی، وہ اگلی چوکیوں میں متعین آبزرور اور انٹیلی جنس والوں کے ساتھ

وقفے وقفے سے صلاح مشورہ کرتا، وہ سگنل والوں، انجینئرز اور میڈیکل یونٹ کے لوگوں سے بھی گفتگو کرتا نظر آتا، لیکن ہمیشہ کی طرح اس کا دل سب سے زیادہ توپچیوں کے ساتھ لگتا تھا۔ انہیں ایک جگہ سے دوسری متبادل جگہ حرکت دینے میں اسے عجیب لطف محسوس ہوتا۔ وہ انہیں بتاتا کہ جنگ میں وقت کی قدر و قیمت کیا ہے اور ہمیشہ اس بات پر زور دیتا رہتا کہ سپاہیوں کے کسی بھی گروپ کو خواہ ان کا تعلق فوج کے کسی بھی شعبے سے ہو حکم اور حملے کے درمیان کم از کم وقت کے تصور کو ملحوظ رکھنا چاہئے، جب وہ ان کے لئے وقت کا کوئی ہدف مقرر کرتا اور وہ اسے پورا کر دکھاتے تو اس کی آنکھیں مسرت سے دمک اٹھتیں اور وہ بار بار ان کی تحسین کرتا لیکن کوتاہی اور کاہلی کے ارتکاب پر وہ اسی شدت سے بگڑ جاتا۔ وہ جلدی خوش ہونے والا یا جلدی برہم ہونے والا آدمی نہیں تھا لیکن وہ کام پر توجہ نہ دینے اور بات نہ سمجھنے والوں کو ناپسند کرتا تھا اور جب وہ کسی ایسے شخص کو دیکھتا جسے اپنے کام سے گہری دلچسپی ہوتو اس کی تعریف میں بخل سے کام نہ لیتا۔ ان میں سے ایک میجر نجیب تھے جو بعد میں بریگیڈیئر بنے اور 17 اگست 1988ء کو دوسرے فوجی افسروں کے ساتھ شہید کر دیئے گئے۔ اس کی ہنرمندی کو سراہتے ہوئے بریگیڈیئر نے کئی بار کہا تھا یہ آدمی ایک دن کور کمانڈر رہے گا۔

باغ کی اس وادی میں بریگیڈیئر نے گہرے غور و فکر کے طویل دن گزارے۔ وہ شام کو گھنٹہ بھر کی سیر کے لئے جاتا تو اس کے چہرے پر تفکر کے گہرے آثار دکھائی دیتے۔ وہ اس بات سے آزردہ دکھائی دیتا کہ علاقے میں ہر طرف غربت نے ڈیرے ڈال رکھے تھے اور عام لوگ ایک پر مشقت اور پھیکی زندگی گزار رہے تھے۔ ایک شام اس نے سکول سے چھٹی پر آئے ہوئے اپنے بیٹے کو ایک کشمیری بوڑھے کی حکایت سنائی جو ہر صبح جلانے کی لکڑیوں کے لئے پہاڑ کی بلندی سے اترتا تھا اور پھر تاسف کے ساتھ کہا کہ ایک عام آدمی کس طرح کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے تاہم

اس طرح کے خیالات بہت دیر تک اس کے ذہن پر مسلط نہیں رہ سکتے تھے، جلد ہی وہ انہیں جھٹک دیتا اور اپنے سپاہیانہ فرائض کے بارے میں سوچنے لگتا۔ اس نے ایک صاف اور واضح ذہن پایا تھا۔ اور اس کے نزدیک آدمی کے لئے کوئی چیز اپنے فرائض سے زیادہ اہم نہیں تھی۔

یہ 1974ء کے موسم گرما کا آغاز تھا، جب بریگیڈیئر کے اہل خانہ نے اسے مضطرب پایا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی کیونکہ وہ آسانی سے پریشان ہونے والا آدمی نہ تھا اور اگر کبھی ایسا ہوتو اضطراب تادیر اس پر مسلط نہ رہ سکتا تھا۔ اس کی زندگی میں مشکلات اور محرومیاں تو آتی تھیں لیکن وہ ان سے نبرد آزما ہونے کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور ملال کو اپنے دل میں گھر بنانے نہیں دیتا تھا لیکن اب کی بار ایسا ہو رہا تھا اور اس کے اہل خاندان اس سے متفکر تھے۔

جیسا کہ اس کا مزاج تھا کہ وہ اپنے اہل خاندان سے، اپنی ذات کے بارے میں کوئی چیز راز نہ رکھتا تھا، آخر ایک روز اس نے انہیں بتایا کہ وہ میجر جنرل کے طور پر ترقی حاصل کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اس نے دوسروں سے بڑھ کر محنت کی تھی اور اسے کبھی شبہ نہ ہوا تھا کہ وہ اگلے زینے پر قدم نہ رکھ سکے گا۔ غیر متوقع طور پر پیش آنے والے حادثے کا ملال بھی کچھ زیادہ ہی تھا۔

میجر جنرل مجید ملک نے جن کے ساتھ بریگیڈیئر نے 1971ء کی جنگ میں حصہ لیا تھا اور جو اب بارہویں ڈویژن کے کمانڈنگ افسر تھے، اسے ترقی دینے کی بہت پرزور سفارش کی تھی، لیکن راولپنڈی کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل آفتاب نے اس سفارش کی توثیق نہیں کی۔ ایسا کیوں ہوا؟ جنرل آفتاب قدرے موڈی آدمی واقع ہوئے تھے، جیسے کہ بعض فوجی افسر ہوتے ہیں، لیکن وہ بریگیڈیئر اختر عبدالرحمن کے مخالف نہیں تھے کہ اس کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ ڈالتے۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ ان کا تعلق انفنٹری سے تھا اور بریگیڈیئر کا آرٹلری سے۔ ایک ایسی فوج میں

جواب بھی اپنے مزاج میں قدامت کا رنگ رکھتی ہے، انفنٹری کے بعض افسر ترقی دینے کے لئے اپنے ہی شعبے کے افسروں کو ترجیح دیتے تھے۔

بریگیڈیئر متشوش تھا کہ وہ اب کیا کرے۔ یہ ایک تکلیف دہ لمحہ تھا۔ جس میں فوجی افسروں کی ساری آن بان جاتی رہتی ہے۔ وہ اپنے ماتحتوں سے جھگڑنے لگتے ہیں، ان میں سے جو لوگ بادہ نوشی کے عادی ہوں (اور اس زمانے میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت تھی) وہ الکحل کی طرف زیادہ شدت سے مائل ہو جاتے ہیں۔ وہ ریٹائر ہو کر گھر بنانے اور نئی زندگی کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں، جو فوجی زندگی کی شان و شوکت اور مردانہ تیوروں سے محروم ہو گی۔

بریگیڈیئر نے اپنے حواس قائم رکھے۔ ابھی اسے آگے بڑھنا اور ملک کی عسکری زندگی میں اپنا کردار ادا کرنا تھا۔ وہ کسی جذباتی فیصلے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا قاعدے کے مطابق اسے اپنے افسروں کے ذریعے نظر ثانی کی درخواست کرنا تھی لیکن کسی بھی ایسے شخص کی طرح جو اپنی توقیر کے معاملے میں حساس واقع ہوا ہو وہ ایسا کرنے سے جھجک رہا تھا۔ خوش قسمتی سے، اس نے پہلے ہی سے کور کمانڈر سے ملاقات کا وقت مانگ رکھا تھا۔ جب وہ ان سے ملاقات کے لئے گیا تو اس نے نظر ثانی کی درخواست نہیں کی مگر انہیں اصرار کے ساتھ اپنے بریگیڈ کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔

جنرل آفتاب 6 اے کے بریگیڈ کا معائنہ کرنے آئے اور فوراً ہی انہیں احساس ہونے لگا کہ ایک اہل آدمی کے ساتھ زیادتی ہو گئی ہے۔ جب وہ لوٹ کر راولپنڈی پہنچے تو وہ اپنی رائے پر نظر ثانی کر چکے تھے، حالانکہ بریگیڈیئر نے ایک بار بھی ان سے اس کی درخواست نہیں کی تھی۔

جولائی 1974ء میں جنرل مجید ملک کا تبادلہ ہوا تو بریگیڈیئر اختر کے لئے میجر جنرل کی جگہ خالی ہو گئی اب نومبر 1974ء میں بورڈ کے اجلاس میں یہ معاملہ دوبارہ

زیر غور آیا تو جنرل آفتاب نے بریگیڈیر کو میجر جنرل بنانے کی پر زور سفارش کی۔ بری فوج کے سربراہ جنرل ٹکا خان پہلے ہی سے اس کے حق میں تھے اور وہ اپریل 1974ء کے اجلاس میں واضح طور پر اپنی رائے دے چکے تھے، چنانچہ جلد ہی ترقی کے احکامات صادر کر دیئے گئے۔

مری کے ڈویژنل ہیڈ کوارٹر میں ملک کے سب سے بڑے ڈویژن کی قیادت کرتے ہوئے، جو چھ انفنٹری اور ایک آرٹلری رجمنٹوں پر مشتمل تھی، میجر جنرل اختر عبدالرحمن اب آسودہ اور آزاد تھے اور اگلی منزلوں کے خواب دیکھ سکتے تھے۔ کبھی کبھار ان کی اہلیہ کے ماموں زاد بھائی کرنل (اب ریٹائرڈ جنرل) زاہد علی اکبر ان سے ملنے آتے اور وی آئی پی میس میں آموں کی دعوت اڑاتے، جنہوں نے بعد ازاں پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے لئے اس وقت خاموشی سے خدمات انجام دیں، جب تعمیر کے عمل میں مسلح افواج سے مدد مانگی گئی۔

میجر جنرل اختر عبدالرحمن ایک گونہ مسرت کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ بری فوج کا اہم ترین ڈویژن ان کی قیادت میں تھا۔ جسے حالت جنگ میں رکھا جاتا اور جس کے کمانڈر سے غیر معمولی مستعدی کی توقع رکھی جاتی تھی۔ بعض اعتبار سے یہ اس آرمی کی زندگی کے سب سے پر مسرت ایام تھے۔ ان کے بیٹے تیزی سے اعلیٰ تعلیم کے مراحل طے کر رہے تھے اور ان میں سے ایک بیرون ملک روانہ ہو چکا تھا۔ ملک کے وزیر اعظم تفریح اور استغراق کی تلاش میں صحت افزا مقام پر آتے تو انہیں بلا بھیجتے اور ان سے کشمیر کی دفاعی صورت حال پر تبادلہ خیال کرتے۔ بظاہر ہر چیز ہموار اور اطمینان دلانے والی تھی تا آنکہ ایک اور صدمہ غیب سے نمودار ہوا۔

1976ء میں جنرل ٹکا خان کی ریٹائرمنٹ کے بعد وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے بری فوج کے سب سے جونیئر کور کمانڈر جنرل محمد ضیاء الحق کو فوج کا سربراہ مقرر

کرنے کا اعلان کر دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو آٹھ سال تک ایک فوجی حکمران کے وزیر رہے تھے، جس نے پہلی بار سول حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کیا تھا۔ ایک عوامی احتجاجی تحریک کے بعد، جس میں ملک کے سارے سیاسی عناصر شریک تھے، انہوں نے چیف آف آرمی سٹاف جنرل یحیٰ کو دوسرا مارشل لاء نافذ کرتے دیکھا تھا اور خود بھی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے طور پر اقتدار کا آغاز کیا تھا۔ وہ ہمیشہ فوج کی طرف سے حکومت کا تختہ الٹنے کے اندیشے کو ملحوظ رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اقتدار سنبھالتے ہی کئی جرنیلوں کو ریٹائر کرنے کا حکم دیا تھا اور اب جب ان کا وفادار، اپنی قسمت پر شاکر اور قوت متخیلہ سے محروم ٹکا خان چیف ریٹائر ہو رہا تھا تو وہ ایک ایسے شخص کا انتخاب کرنا چاہتے تھے جو مکمل طور پر ان کا وفادار ہوتا کہ فوج ان کے قابو میں رہے۔

مسٹر بھٹو کے نزدیک جنرل محمد ضیاء الحق ہی اس تصور پر پورے اترتے تھے، اگرچہ بعد ازاں حقائق سے بے خبر لوگوں نے اس سلسلے میں بہت سی حکایتیں بیان کیں، لیکن دوسرے عوامل کے علاوہ مسٹر بھٹو نے اس لئے اس اہم منصب پر جنرل ضیاء الحق کا تقرر کیا تھا کہ وہ پچاسویں عشرے کے اوائل سے انہیں جانتے تھے۔ 50ویں عشرے میں کیپٹن ضیاء الحق مسٹر بھٹو کے بہنوئی کرنل مصطفیٰ کی رجمنٹ گائیڈز کیولری کے افسر تھے۔ راولپنڈی چھاؤنی میں بھٹو نے بارہا اس مودب، تحمل اور مذہبی آدمی کو دیکھا تھا اور ان سے ملاقاتیں کی تھیں، اگرچہ اگلے دو عشرے ان کے درمیان کبھی ملاقات نہ ہو سکی لیکن بھٹو غیر معمولی یادداشت کے آدمی تھے اور پھر نامور اخبار نویس ابن الحسن کے بقول جو خود بھی اس دور میں آرٹلری سے وابستہ تھے اور جنرل ضیاء الحق کو قریب سے جانتے تھے ضیاء الحق اپنے منفرد چہرے اور کردار کے آدمی کو آسانی سے بھلایا نہ جا سکتا تھا۔

ضیاء الحق چیف آف دی آرمی سٹاف بنائے گئے تو روایت کے مطابق بری فوج

کے سارے سینئر کور کمانڈر ریٹائر ہو گئے۔ اس طرح یکا یک 5 جرنیلوں کی جگہ خالی ہو گئی۔ جنرل اختر عبدالرحمن کو یقین تھا کہ ان میں سے ایک منصب کے لئے وہ چن لئے جائیں گے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ سینیارٹی کے اعتبار سے وہ چوتھے نمبر پر تھے دوسرے یہ کہ ان کی کارکردگی کے بارے میں رپورٹیں نہایت عمدہ تھیں، پھر یہ کہ وزیراعظم ذاتی طور پر انہیں جانتے تھے اور ان کی تحسین کرتے تھے۔

بظاہر صرف ایک ہی عنصر ان کے حق میں نہ تھا کہ 1953ء کے موسم خزاں کے اس مختصر سے عرصے کے سوا جب انہوں نے کوئٹہ سٹاف کالج میں ایک تزویراتی Tatical کورس اکٹھے پاس کیا تھا، نئے چیف آف آرمی سٹاف سے ان کی کبھی ملاقات نہ رہی تھی۔

میجر جنرل اختر عبدالرحمن کو یاد تھا کہ اس مختصر سے کورس کے دوران ان دونوں کے درمیان ذاتی تعلق استوار نہ ہو سکا تھا، اگرچہ جنرل ضیاء الحق کے برعکس جو کثرت سے دوست بنانے والے آدمی تھے، اس کی ایک بڑی وجہ یہی تھی کہ اختر عبدالرحمن کم کم دوست بنانے والے شخص تھے، لیکن اس کا ایک سبب اور بھی تھا اور یہ بڑی ہی حیرت انگیز بات تھی۔

اختر عبدالرحمن کے برعکس جو ایک بڑے گھرانے میں پیدا ہوئے اور جنہوں نے یتیمی میں پرورش پائی اور یوں جوانی ہی سے خود کو ایک سنجیدہ سانچے میں ڈھال لیا، جنرل ضیاء الحق اپنی جوانی میں قدرے شوخ آدمی واقع ہوئے تھے، اگرچہ وہ اس وقت بھی گہرے مذہبی اور شائستہ آدمی تھے لیکن وہ گپ شپ لگانے والے شخص تھے اور بعض اوقات ان کے لباس میں بھی شوخی کی جھلک نظر آتی تھی۔ دونوں آدمیوں کے مزاج کے اس فرق نے انہیں قدرے دور دور ہی رکھا اور وہ کبھی گھل مل نہ سکے۔

لیکن اس سے کیا فرق واقع ہوتا تھا؟ اس چیز کو ان کی ترقی میں کوئی رکاوٹ تو نہیں بننا چاہئے تھا، لیکن میجر جنرل اس وقت بھونچکا رہ گئے جب ان کی امیدوں کا محل

یکایک زمین بوس ہوگیا۔ وہ معمول کے مطابق رات کے نو بجے ٹی وی سے خبرنامہ سن رہے تھے، جب ابتدائی اہم خبروں میں بتایا گیا کہ پانچ میجر جنرلوں کو ترقی دے کر لیفٹیننٹ جنرل بنا دیا گیا ہے جنرل اختر اس پر حیرت زدہ رہ گئے۔ انہوں نے سوچا کہ انہیں پہلے سے اس کی اطلاع کیوں نہیں دی گئی؟ انہیں اندیشہ سا ہوا مگر انہوں نے فوراً ہی اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا یہ درست ہے کہ دو سال پہلے اس طرح کا ایک حادثہ پیش آیا تھا، لیکن اب کی بار ایسا کیوں ہوگا؟

ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھ کر کھانا کھاتا ہوا افسر، جو عسکری زندگی کے اعلیٰ ترین مدارج کا خواب دیکھتا تھا، خیالات کی متضاد لہروں کی زد میں تھا۔ خبریں پڑھنے والے نے ترقی پانے والوں کی فہرست سنانا شروع کی ایک، دو، تین، چار اور پانچ جنرل اقبال، جنرل سوار خان، جنرل جہاں زیب، جنرل چشتی اور جنرل غلام حسین جرنیل نے اپنی 52 سالہ زندگی میں بہت سے امتحان دیکھے تھے۔ وہ یتیمی، مہاجرت اور جنگوں کے عذاب سے گزرا تھا اور کوئی طوفان اس کے قدم نہ اکھاڑ سکا تھا، لیکن اس خبر نے اس سے پیدا ہونے والے توہین اور محرومی کے احساس نے اس کی دنیا زیر و زبر کر دی، یہ شاید اس کے لئے زندگی کا سب سے بڑا صدمہ تھا اور اس لمحے کوئی نہ تھا، جس سے وہ اپنے درد کی حکایت کہہ سکے۔ کھانے کا لقمہ جو وہ منہ میں ڈال چکا تھا، اس سے نگلا نہ جا سکا۔ اس نے غسل خانے کا رخ کیا اور اسے تھوک ڈالا۔ آن واحد میں دنیا اس کے لئے کیا ہو گئی تھی؟

کیا زندگی کی بساط پر اس کا کردار ختم ہوا؟ اسے عسکری روایت کے مطابق ریٹائر ہو کر گھر چلے جانا چاہئے؟ یہ ایک مقدس روایت تھی اور اسے ایک معزز آدمی کی طرح اس کی پاسداری کرنی چاہئے تھی، لیکن اس کے لئے ایک سوال اس سے بھی بڑا تھا۔ کیا وہ اس طرح اپنے گھر لوٹ جائے کہ اس نے اپنے دشمن سے اپنا قرض نہ چکایا ہو اور کوئی کارنامہ انجام نہ دیا ہو، جس پر وہ فخر کر سکے۔ بار بار اس نے اپنے دوستوں

اور بیٹوں سے کہا تھا کہ اس نے آج تک زندگی میں جو کچھ کیا ہے، وہ اس سے زیادہ کا اہل ہے۔ اسے ہمیشہ یقین رہا تھا کہ آخر کار زندگی اس کے لئے ایک معرکے کا انتخاب کرے گی۔ لیکن یہ سب کیا تھا؟ وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آیا، مری کی سرد ہوا میں کھڑے جرنیل کا چہرہ صدمے، محرومی اور توہین کے احساس سے جھلس اٹھا۔ اس کی زندگی میں اس سے پہلے ایسا تکلیف دہ اور مسترد کرنے والا وقت نہیں آیا تھا۔ جرنیل اس وقت طوفان کے تھپیڑے کھا رہا تھا جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ یہ جنرل ضیاء الحق تھے اسی شوخ آواز میں جس سے وہ پہلی بار 1953ء میں آشنا ہوا تھا، انہوں نے کہا۔

AKHTAR I AM SORRY CIRCUMSTANCES WERE SUCH THAT I HAD TO MAKE THIS DECISION WHAT DO YOU THINK. WOULD YOU LIKE TO SERVE OR WOULD YOU OPT FOR RETIREMRNT?

(اختر مجھے افسوس ہے کہ صورت حال ایسی تھی کہ مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا، اب آپ کیا سوچتے ہیں کیا آپ فوج سے وابستگی برقرار رکھیں گے یا ریٹائر ہونا پسند کریں گے)

تب جرنیل نے وہ فیصلہ کیا، جس میں اس کے اگلے برسوں کی تقدیر چھپی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔

SIR THESE THINGS DO NOT MATTER IN LIFE I AM A SOLDIER, I RESPECT YOUR DESICION AND I WILL CONTINUE TO SERVE UNDER YOU WHOLE HEARDLY.

(سر! زندگی میں ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ میں ایک سپاہی ہوں، میں آپ

کے فیصلے کا احترام کرتا ہوں اور پوری دلجمعی سے آپ کے ماتحت خدمات انجام دیتا رہوں گا)

چند لمحے کی خاموشی کے بعد چیف آف آرمی سٹاف کی آواز ابھری، جنہیں بظاہر اپنے ماتحت کے اس فیصلے پر حیرت ہوئی تھی۔

THAT IS THE SPIRIT, THAT IS THE SPIRIT, AKHTAR

جرنیل نے پھر وہی کیا۔ جو اس نے دو سال پہلے بریگیڈئیر کے طور پر اپنے کور کمانڈر کے ساتھ کیا تھا۔ انہوں نے کمانڈر انچیف کو اپنے ڈویژن کا دورہ کرنے کی دعوت دی، جس پر اس نے اس قدر محنت کی تھی اور جس پر اسے اتنا فخر تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا ہنر اپنے منہ سے بولے گا اور فیصلے کرنے والے کو سوچنے پر مجبور کر دے گا

جب راولپنڈی کے جی ایچ کیو میں بارہویں ڈویژن کے میجر جنرل کی طرف سے، چیف آف آرمی سٹاف کے دورے کی تجویز موصول ہوئی تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہ دو ہفتے پر مشتمل تھا، بری فوج کے کسی پاکستانی سربراہ نے کسی ڈویژن کا شاید ہی اتنا طویل دورہ کیا ہو گا، لیکن انہوں نے اسے قبول کر لیا اور اس میں کوئی ترمیم نہیں کی۔

میجر جنرل اختر عبدالرحمن کے لئے یہ بڑے تکلیف دہ ایام تھے۔ ان سے جونیئر میجر جنرل چشتی کو، جنہوں نے بڑی بڑی مونچھیں پال رکھی تھیں، ترقی دے کر ان کا کور کمانڈر مقرر کیا جا چکا تھا۔ بلیک ایسے جونیئر جسے ایک فوجی افسر کسی طرح خوف سے افضل نہ سمجھ سکتا ہو، ایڑیاں جما کر سیلوٹ کرنا ایک توہین آمیز عمل تھا، گویا یہ نااہلی اور ناکامی کے ایک طعنے کی طرح تھا، لیکن میجر جنرل نے خود کو سنبھالے رکھا اور جب دورے کا وقت آیا تو انہوں نے اس کی پوری تیاری کی۔

چیف آف آرمی سٹاف کو جو دوسروں کی بات سننے اور دوسروں کی کارکردگی دیکھنے میں بڑے حوصلہ مند واقع ہوئے تھے اور رات گئے تک جاگتے تھے، مری سے مقبوضہ کشمیر کی سرحدوں تک لے جایا گیا۔ وہ ان توپچیوں سے ملے جو معمولی سے دوگنا رفتار کے ساتھ گولے برسا سکتے تھے اور جنہیں بری فوج کے بہترین توپچی قرار دیا جا سکتا تھا۔ وہ خود بھی آرمڈ کور سے وابستہ رہے تھے اور انہیں توپوں کی کارکردگی سے دلچسپی تھی، جنہیں وہ بہترین حالت میں رکھنے کے قائل تھے، لہٰذا وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے جوانوں کو چین سے درآمد کی گئی، گرنیڈ پھینکنے والی ایک مشین کو نئی طرح سے استعمال کرتے دیکھا۔ دوسری ڈویژنوں میں تو اسے زمین پر رکھ کر استعمال کیا جاتا تھا، لیکن یہاں بارہویں ڈویژن میں جوان اسے کندھوں پر رکھ کر برتتے تھے، جس سے نشانہ بہت بہتر ہو جاتا تھا انہوں نے یہ کہاں سے سیکھا تھا؟ کمانڈر انچیف کو بتایا گیا کہ یہ ڈویژن کے کمانڈر کی اختراع ہے۔ انہوں نے اس پر پسندیدگی کا اظہار کیا، لیکن سب سے زیادہ مرعوب کن نظارہ وہ تھا، جب انہیں مقبوضہ کشمیر کی سرحد کے ساتھ پھیلے ہوئے مورچہ بند جوانوں کی نشیب سے پہاڑیوں کی بلندیوں پر قبضہ کرنے کی مشق دکھائی گئی۔ یہ فوجی مہارت کا نقطہ کمال تھا۔ تحسین میں بخل نہ برتنے والے ضیاء الحق اس پر اپنی مسرت چھپا نہ سکے اور انہوں نے کہا کہ بارہویں ڈویژن کے دورے نے ان کا ایمان تازہ کر دیا ہے۔ راولپنڈی کی طرف واپس جاتے ہوئے، خوش ذوق کمانڈر انچیف نے مری کے وی آئی پی میس میں شیخوپورہ سے خاص طور پر منگوائے گئے، باسمتی چاول کا پلاؤ کھایا۔ فوج کو ایمان، تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ کا نعرہ دینے والے جرنیل کو اس وقت اور بھی مسرت ہوئی، جب انہیں بتایا گیا کہ اس ڈویژن کے میسوں میں شراب پینے پر اس سے بہت پہلے پابندی عائد کی جا چکی ہے، جب نئے کمانڈر انچیف نے اس کا حکم دیا تھا۔

مری کے بارہویں ڈویژن سے جنرل ضیاء الحق نے جلد ہی ایک تعلق خاطر قائم کر

لیا، کچھ دنوں میں، وہ فوجی کھیلوں کے ایک مقابلے میں انعامات تقسیم کرنے کے لئے ایک بار پھر یہاں آئے۔ انعامات میں دوسری چیزوں کے علاوہ کتابیں بھی شامل تھیں اور ان میں سب سے زیادہ نمایاں چیز جماعت اسلامی کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن تھی۔ ضیاءالحق واپس راولپنڈی پہنچے تو چند ہی روز میں انہیں وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی طرف سے ایک خط موصول ہوا، جس میں جوانوں کو تفہیم القرآن کے نسخے دینے پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے وضاحت کرنے کا حکم دیا گیا۔ جیسا کہ جنرل ضیاءالحق نے بعد میں بتایا، انہوں نے سرے سے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا اور خاموش ہو رہے، وزیراعظم ہاؤس نے بھی اس پر خاموشی اختیار کر لی اور یاددہانی کی ضرورت محسوس نہ کی۔ مری کی اس تقریب میں صدر ضیاءالحق نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا، اس پر لاہور کے ماہنامہ اردو ڈائجسٹ اور روزنامہ نوائے وقت نے تحسین کا اظہار کیا۔ جنرل ضیاءالحق اس پر چوکنا ہو گئے۔ انہوں نے اسلام آباد کے ریٹائرڈ میجر مصطفی شاہین کے پاس اپنے ایک معتمد افسر کو روانہ کیا، جن کا تعلق جماعت اسلامی سے تھا اور جنہیں وہ 20 سال سے جانتے تھے۔ اس افسر نے چھوٹتے ہی میجر مصطفی شاہین سے کہا آپ لوگ کسی کو اسلام کی خدمت کرنے دیں گے یا نہیں؟ تعجب کے ساتھ انہوں نے استفسار کیا تو انہیں اردو ڈائجسٹ اور نوائے وقت کے شذروں کے بارے میں بتایا گیا۔ چیف آف آرمی سٹاف نے اپنے پرانے دوست سے فرمائش کی تھی کہ وہ خاموشی سے لاہور جا کر مولانا مودودی سے ملیں اور ان سے کہیں کہ وہ اپنے زیراثر اخبارات کو ان کی حمایت میں لکھنے سے باز رکھیں۔ فوج کے سربراہ کو معلوم نہ تھا کہ نوائے وقت نہ صرف مولانا مودودی کے زیراثر نہیں بلکہ ان سے بغض رکھتا ہے۔ میجر مصطفی شاہین مولانا مودودی سے ملے تو انہوں نے اپنے مداح اور مرید کو مشورہ دیا کہ وہ الطاف حسن قریشی کو ساتھ لے کر مجید نظامی سے بات کر لیں۔

اگلے دنوں جنرل ضیاء الحق جہاں جہاں فوجی دورے پر گئے، انہوں نے بارہویں ڈویژن کی مثال دی اور کہا کہ دوسروں کو اس کی تقلید کرنی چاہئے۔ مارچ 1977ء کے عام انتخابات کے بعد ملک یکایک ہنگاموں کی زد میں آ گیا، جب نوتشکیل پاکستان قومی اتحاد نے مسٹر بھٹو پر بڑے پیمانے پر انتخابی دھاندلی کا الزام عائد کیا۔ یہ ہنگامے سوا تین ماہ جاری رہے۔ حتیٰ کہ 5 جولائی 1977ء کو جنرل ضیاء الحق نے حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار سنبھال لیا اور ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ جنرل چشتی نے اس میں اہم کردار ادا کیا جو راولپنڈی کے کور کمانڈر تھے اور جنرل ضیاء الحق کے برسر اقتدار آنے کے بعد ملک کے دوسرے اہم آدمی سمجھے جانے لگے تھے حتیٰ کہ ایک سازش نے جنرل ضیاء الحق پر ان کی اصلیت منکشف کر دی۔ جنرل اختر عبدالرحمن مارشل لاء لگانے کی اس کارروائی میں شریک نہ تھے۔ حقیقت تو یہ ہے انہوں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ مارشل لاء کے نفاذ سے چند روز پہلے راولپنڈی کے کور کمانڈر جنرل چشتی ایک ہیلی کاپٹر میں سوار ہو کر مری آئے اور انہوں نے جنرل اختر عبدالرحمن سے کہا کہ فوج پر مارشل لاء کے نفاذ کے لئے دباؤ بڑھ رہا ہے۔ انہوں نے سوال کیا کہ اس بارے میں ان کی رائے کیا ہے جنرل اختر عبدالرحمن نے صاف صاف الفاظ میں کہا کہ وہ مارشل لاء نافذ کرنے کے حامی نہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ 5 جولائی کی صبح جب راولپنڈی کے کور کمانڈر نے دوسرے سیاستدانوں کے علاوہ وزیراعظم کی گرفتاری اور انہیں اقتدار سے ہٹانے کے لئے فوجی دستوں کو حرکت دی تو انہوں نے اسلام آباد کے باہر مری روڈ پر بارہ کہو میں بھی فوجی دستے متعین کئے جہاں سے بارہویں ڈویژن کی حدود شروع ہوتی ہیں۔ جنرل چشتی کے چیف آف سٹاف نے جنرل اختر کو صبح چار بجے نیند سے جگا کر مارشل لاء کے نفاذ کی اطلاع دی۔

مارشل لاء کے نفاذ کے چھ ماہ بعد جب فوج میں چند بڑی تبدیلیاں کی گئیں تو

جنرل اختر عبدالرحمن کو جی ایچ کیو میں ایجوٹنٹ جنرل بنا دیا گیا۔ اس وقت کچھ تبدیلیاں اور بھی ہوئیں۔ جنرل رحیم الدین خان جو جی ایچ کیو میں انسپکٹر جنرل ٹریننگ کے فرائض انجام دے رہے تھے، لیفٹیننٹ جنرل بنا کر ملتان بھیج دیئے گئے اور اس کے ساتھ ہی انہیں بلوچستان کا مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا گیا۔ جنرل فضل حق کو لیفٹیننٹ جنرل بنا کر پشاور بھیج دیا گیا اور جنرل سوار کو جو پشاور میں تھے، لاہور بلا کر پنجاب کو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنا دیا گیا۔ پنجاب کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل اقبال کو کراچی بھیجا گیا اور وہ سندھ کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنا دیئے گئے۔ اس سے پہلے صوبہ سرحد کے ممتاز سیاستدان ارباب جہانگیر کے بھائی ارباب جہاں زیب سندھ کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے۔ انہیں سینٹو میں پاکستان کی نمائندگی کرنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ اس وقت تک پاکستان اس وفاقی معاہدے میں شامل تھا اور لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے کا ایک افسر اس میں ملک کی نمائندگی کرتا تھا۔ جنرل ارباب جہاں زیب کا تبادلہ غالباً اس لئے عمل میں لایا گیا تھا کہ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے ان پر بعض سنگین الزامات عائد کئے گئے تھے۔

دو سال گزر چکے تھے اور جنرل اختر عبدالرحمن کی ترقی رکی ہوئی تھی۔ صدر انہیں ترقی دینا چاہتے تھے اور انہوں نے کورکمانڈروں کے ایک اجلاس میں یہ بات کہی بھی لیکن وہ اپنے سب ساتھیوں سے اس کے لئے تائید حاصل نہ کر سکے جو اس وقت تک اہم فیصلوں پر اثر انداز ہوتے تھے اگرچہ بعض جرنیل اس تجویز کے حامی تھے لیکن جنرل فیض علی چشتی اور بعض دوسرے جرنیلوں نے اس کی مخالفت کی۔ صدر جیسا کہ ان کا مزاج تھا، اس پر خاموش ہو رہے۔

مارچ 1979ء میں سپریم کورٹ نے لاہور ہائی کورٹ کے اس فیصلے کی توثیق کر دی، جس کے تحت مسٹر بھٹو کو احمد رضا خان قصوری کے والد نواب محمد احمد خان کے قتل کے الزام میں پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی تاہم سات میں سے تین ججوں نے اس فیصلے

سے اختلاف کیا۔ اختلاف کرنے والوں میں سے ایک جسٹس دراب پٹیل تھے، تاہم بعد ازاں جب سپریم کورٹ میں نظر ثانی کی درخواست دائر کی گئی تو دراب پٹیل نے اسے قبول نہ کیا۔ انہوں نے کہا جو دلائل اس وقت دیئے گئے ہیں، وہ سماعت کے دوران دیئے جانا چاہئیں تھے۔ ملک کے اندر اضطراب تھا اور طویل ہوتے ہوئے مارشل لاء نے سیاست دانوں کو ناراض کر دیا تھا۔ پاکستان قومی اتحاد کی جماعتیں جو 1978ء میں اقتدار میں شامل ہوگئی تھیں، انتخابات کی تاریخ کا اعلان ہونے کے بعد حکومت سے الگ ہو چکی تھیں اور اب صورتحال یہ تھی کہ نوابزادہ نصر اللہ خاں اور سردار عبدالقیوم خان سمیت بعض دوسرے مخالف رہنما بھی بھٹو کو پھانسی دینے کے حق میں نہیں تھے۔ پیپلز پارٹی کے کارکن بھٹو کی جان بچانے کے لئے خود سوزی کر رہے تھے اور ملک ایک غیر یقینی صورتحال سے دوچار تھا۔ اس کے باوجود صدر ضیاء الحق بھٹو کو پھانسی دینے کے فیصلے پر ڈٹے رہے۔ انہوں نے دنیا بھر کے حکمرانوں کی طرف سے بھٹو کی جاں بخشی کی اپیلوں کو حکمرانوں کی ٹریڈ یونین قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا اور 4 اپریل 1979ء کی صبح وہ سنٹرل جیل راولپنڈی میں پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔

اس صورتحال میں راولپنڈی کے کور کمانڈر جنرل فیض علی چشتی، جنہیں صدر ضیاء الحق اپنا دوست سمجھتے اور مرشد کہتے تھے، اپنا ایک الگ کھیل کھیلنے کی تیاری کر رہے تھے۔ مئی 1979ء کی ایک صبح انہوں نے جنرل اختر عبدالرحمن کو جو جی ایچ کیو میں ایجوٹنٹ جنرل کے فرائض سرانجام دے رہے تھے، چکلالہ کے ہیڈ کوارٹرز میں آنے کی دعوت دی۔ واضح اور دوٹوک الفاظ میں انہوں نے جنرل اختر عبدالرحمن سے کہا کہ انہوں نے صدر ضیاء الحق کا تختہ الٹنے کا فیصلہ کیا ہے، جنہوں نے ملک کو تباہی کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ وہ بھٹو کی پھانسی سے پیدا ہونے والی صورت حال سے فائدہ اٹھا کر اقتدار حاصل کرنا چاہتے تھے حالانکہ وہی بھٹو کو پھانسی دینے کے سب سے

سرگرم حامی تھے اور پھانسی کے انتظامات انہی کی نگرانی میں کیے گئے تھے۔ شاید 5 جولائی 1977ء کے تجربے کی وجہ سے وہ پر اعتماد نظر آ رہے تھے اور ان کا خیال غالباً یہ تھا کہ دو سال سے ترقی سے محروم جنرل اختر عبدالرحمن ان کا ساتھ دینے پر آمادہ ہوں گے۔ انہوں نے میجر جنرل سے کہا کہ اس حکومتی تبدیلی کے بعد وہ ان کے اہم ترین ساتھی ہوں گے۔ اختر عبدالرحمن اس پر حیرت زدہ ہو گئے لیکن انہوں نے اپنے ردعمل کو قابو میں رکھا اور راولپنڈی کے کور ہیڈ کوارٹر سے سیدھے بارلے سٹریٹ میں اپنے گھر چلے گئے۔ وہ سخت پریشانی کا شکار تھے۔ پاکستانی فوج میں یہ پہلی بار تھا کہ ایک کور کمانڈر چیف آف آرمی سٹاف کے خلاف بغاوت کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ اختر عبدالرحمن کا خیال تھا کہ یہ ملک اور فوج کی تباہی کا راستہ ہے۔ ان کی رائے یہ بھی تھی کہ ضیاء الحق ایک ایماندار اور مخلص آدمی ہیں اور انہیں راستے سے ہٹانا خطرناک ہو گا۔ انہیں کچھ معلوم نہ تھا کہ فیض علی چشتی کس حد تک فوجی انقلاب کی تیاری کر چکے ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اختر عبدالرحمن سے اس خطرناک گفتگو کے بعد ان کی نگرانی شروع کی گئی ہو۔ انہیں یہ خیال بھی گزرا کہ ممکن ہے، اگلے چند گھنٹوں میں انقلاب برپا ہونے والا ہو کیونکہ وہ کوئی کور کمانڈر تو نہیں تھے جن کی عملی تائید کی ضرورت محسوس کی گئی ہو، بلکہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ تو کارروائی سے پہلے اہم لوگوں کو فوج کے ممکنہ ردعمل کے خیال سے اعتماد میں لینے کی کوششوں کا ایک حصہ ہے۔

اس اضطراب اور پریشانی کے باوجود انہوں نے جلد ہی فیصلہ کر لیا کہ وہ ایسی کسی کارروائی کی حمایت نہیں کریں گے اور فوج کے سربراہ کو صورت حال سے آگاہ کر دیں گے، خواہ اس کوشش میں ان کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ یہ فیصلہ کر لینے کے بعد، اس اندیشے کے باوجود کہ ان کا ٹیلی فون ٹیپ کیا جا رہا ہو گا، انہوں نے صدر ضیاء الحق سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی جو پشاور گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے صدر کے عملے کو ٹیلی فون پر تفصیل تو نہیں بتائی لیکن یہ واضح پیغام دیا کہ ایک ہنگامی

صورت حال درپیش ہے۔ لہٰذا صدر فوری طور پر راولپنڈی پہنچ جائیں۔

اس اندیشے کے ساتھ کہ ممکن ہے ان کی نگرانی کی جا رہی ہو، جنرل اختر عبدالرحمن شام کو چھپتے چھپاتے آرمی ہاؤس پہنچے۔ فوری طور پر انہیں صدر سے ملنے کے لئے لے جایا گیا اور انہوں نے پوری جزئیات کے ساتھ جنرل فیض علی چشتی کے ساتھ اپنی گفتگو سے صدر کو آگاہ کر دیا۔ صدر اس پر حیرت زدہ رہ گئے۔ وہ واضح طور پر صدمے اور پریشانی کا شکار تھے۔ اگر ان کا قریب ترین ساتھی ان کے خلاف بغاوت کا منصوبہ بنا رہا تھا تو اس امر کی کیا ضمانت تھی کہ کچھ دوسرے لوگ اس کے ساتھ نہ مل گئے ہوں، تاہم ایک صاحب یقین آدمی کی طرح انہوں نے جلد ہی اپنے اوسان پر قابو پا لیا اور جنرل فیض علی چشتی کی نگرانی شروع کر دی گئی۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ اگرچہ جنرل فیض علی چشتی پختہ ارادہ تو کر چکے تھے لیکن ابھی انہوں نے کوئی تیاری نہیں کی تھی اور ابتداء ہی میں ایک غلط آدمی سے رابطہ کرنے کی وجہ سے بات سامنے آ گئی۔

جنرل ضیاء الحق نے اپنے اعصاب پر قابو رکھتے ہوئے یہ حیرت انگیز فیصلہ کیا کہ جنرل فیض علی چشتی کو فوج سے علیحدہ نہیں کیا جائے گا۔ وہ فوج میں انتشار سے بچنا چاہتے تھے اور جنرل فیض علی چشتی کو ایک ہیرو بننے کا موقعہ نہیں دینا چاہتے تھے، جبکہ سابق وزیر اعظم کو پھانسی دیئے جانے کی وجہ سے نہ صرف ملک کے اندر بعض سیاسی حلقوں میں وہ سخت نامقبول ہو گئے تھے بلکہ امریکہ اور روس سمیت دنیا کی بہت سی حکومتیں بھی ان سے ناخوش تھیں۔

جب کور کمانڈر کے طور پر چشتی کی مدت ملازمت پوری ہو چکی تو صدر نے ان کی ملازمت میں توسیع نہیں کی۔ انہیں نسبتاً ایک معمولی منصب کی پیشکش کی اور ظاہر ہے کہ یہ اقتدار اور حکومت سے علیحدگی کا اشارہ تھا اور چشتی اتنے کم فہم نہ تھے کہ اسے سمجھ نہ سکتے۔ چشتی کو یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ صدر ان کے ارادے سے آگاہ ہو چکے ہیں لیکن

ان کی نہایت سختی کے ساتھ نگرانی کی جاتی رہی تھی۔ بعد میں وہ بڑبڑاتے ہوئے، صدر پر جھوٹا آدمی ہونے اور وعدے پورے نہ کرنے کے الزامات عائد کرتے رہے، لیکن صدر پر برہمی اور انہیں نقصان پہنچانے کی خواہش کے باوجود وہ قومی زندگی میں کوئی کردار ادا کرنے کا فیصلہ نہ کرسکے اور رفتہ رفتہ پس منظر میں چلے گئے۔ صدر ضیاء الحق اور جنرل اختر عبدالرحمن کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے کسی کو جنرل چشتی کے ارادوں کی ہوا تک نہ لگنے دی، حتیٰ کہ وہ یہ راز لے کر اپنے خدا کے پاس چلے گئے۔ اگلے سالوں میں جنرل اختر عبدالرحمن نے صدر کے خلاف فوجی بغاوت کے ایک اور منصوبے کو نہایت خاموشی کے ساتھ ناکام بنایا۔

جون 1979ء میں جنرل ضیاء الحق نے جنرل اختر کو آرمی ہاؤس میں طلب کیا اور بتایا کہ وہ انہیں آئی ایس آئی کا ڈائریکٹر جنرل بنانا چاہتے ہیں۔ یہ منصب اس ادارے کے سربراہ کی اچانک وفات سے خالی ہو گیا تھا۔ جنرل اختر نے صدر کو یقین دلایا کہ اگر انہیں یہ ذمہ داری سونپی گئی تو وہ اپنے فرائض بہترین طور پر انجام دینے کی کوشش کریں گے، لیکن تین سال پہلے سپر سیڈ ہونے والے جرنیل نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے اب صاف الفاظ میں کہا، وہ توقع رکھتے ہیں کہ ایک نئی اور اہم ذمہ داری سونپتے ہوئے انہیں اس کمتر رینک میں نہیں رہنے دیا جائے گا۔

وہ میجر جنرل کے رینک ہی میں آئی ایس آئی کے سربراہ مقرر کر دیئے گئے۔ ابھی انہیں اپنے فرائض انجام دیتے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ ایک اجلاس کے سلسلے میں آرمی ہاؤس گئے۔ جب وہ واپس جانے لگے تو صدر کے ملٹری سیکرٹری نے انہیں روکا۔ جنرل ضیاء الحق نے آئی ایس آئی کے نئے سربراہ سے تین چار مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کیا، جب وہ واپس جانے کے لئے اٹھے تو صدر نے اچانک ان سے کہا۔

YOU ARE NOT WEARING PROPER RANKS

انہوں نے کہا آپ کل سے نئے رینک پہن لیں۔ جیسا کہ بعد میں جنرل اختر کے علم میں آیا۔ صدر نے یہ فیصلہ چند روز پہلے کیا تھا، جب وہ کور کمانڈروں کے ایک اجلاس میں گئے اور کسی تمہید کے بغیر انہوں نے کہا ''میں اختر کو پروموٹ کر رہا ہوں'' اب صدر کے فیصلے پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔

جنرل اختر عبدالرحمن شاید پاکستانی فوج کے واحد جرنیل تھے، جنہوں نے کبھی انٹیلی جنس کا کوئی کورس نہیں کیا تھا، لیکن جب انہیں نئی ذمہ داری سونپ دی گئی تو انہوں نے کمال سرعت سے اپنی ذمہ داریوں کا ادراک کیا۔ یہی نہیں انہوں نے ادارے کے قدیم اور فرسودہ ڈھانچے کو بدل کر اس میں نئی زندگی پیدا کر دی۔ اگلے سالوں میں آئی ایس آئی نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا جس کی خفیہ اداروں کی تاریخ میں شاید کوئی دوسری مثال تلاش نہیں کی جا سکتی۔ خفیہ اداروں کا کام تو معلومات جمع کرنا اور دشمن کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا ہے، لیکن آئی ایس آئی نے افغانستان میں ایک عالمی طاقت کے خلاف عملاً ایک عشرے کی جنگ لڑی اور اس میں فتح حاصل کی۔

پانچ سال بعد، 1984ء میں جنرل اقبال اور جنرل سوار خان کی ریٹائرمنٹ کے بعد نئے وائس چیف آف آرمی سٹاف اور چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو کیا جنرل اختر عبدالرحمن ان میں کسی ایک منصب کے لئے ایک فطری انتخاب نہ تھے جنہوں نے 1971ء میں ایک توہین آمیز المیے کا شکار ہونے والی قوم کے لئے ایک قابل فخر باب رقم کر دیا تھا، جنرل جیلانی کے بعد جو پنجاب کے گورنر تھے، وہ سب سے زیادہ سینئر بھی تھے۔ صدر نے انہیں بلایا اور کہا کہ انہوں نے جنرل رحیم الدین خان کو چیئرمین اور جنرل عارف کو وائس چیف آف آرمی سٹاف بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ صدر نے واضح طور پر ان سے کہا کہ افغانستان کی صورت حال کے پیش نظر، جہاں نہ صرف افغان عوام بلکہ پاکستان بھی اپنے تحفظ

کی جنگ لڑ رہا ہے، انہیں آئی ایس آئی سے الگ نہیں کیا جا سکتا، تاہم صدر نے وضاحت کی کہ انہیں اسی منصب پر فور سٹار جنرل کی حیثیت سے ترقی دے دی جائے گی۔ اس ملاقات کے دو روز بعد رحیم الدین خان اور جنرل عارف کی ترقی کا اعلان کر دیا گیا لیکن جنرل اختر عبدالرحمن کی ترقی کا کوئی تذکرہ نہ تھا۔

جنرل اختر عبدالرحمن تیسری بار سپر سیڈ ہونے پر خوش نہیں تھے۔ انہیں یہ خیال بھی آیا کہ انہیں اب فوج سے الگ ہو جانا چاہئے۔ ان کے بیٹوں نے جن سے اب وہ ہر معاملے پر مشورہ کرنے لگے تھے انہیں یہی صلاح دی کہ عمر بھر کی لاانتہا مشقت کے بعد اب انہیں اپنا آرام بڑھا لینا چاہئے۔ لیکن انہیں اس وقت تعجب ہوا جب انہوں نے اپنے فرائض کی انجام دہی جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔

تین سال بیت گئے حتیٰ کہ 1987ء آ پہنچا۔ اب یہ جنرل عارف اور جنرل رحیم الدین خان کی مدت ملازمت کے ختم ہونے کا وقت تھا۔ یہ 14 مارچ 1987ء کی بات ہے۔ جنرل رحیم الدین خان نے پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے امریکہ کے چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے اعزاز میں، اپنے ہیڈ کوارٹر میں عشائیے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ تقریب جاری تھی، جب اختر کو بتایا گیا کہ صدر ان سے فون پر بات کرنا چاہتے ہیں اس بے تکلفی کے ساتھ جو صدر کے کردار کا خاصا تھی، انہوں نے کہا ''اختر کدھر ہو؟'' اور پھر ذرا توقف کے بعد انہیں فوری طور پر آرمی ہاؤس آنے کے لئے کہا۔

کھانا کھائے بغیر جنرل اختر صدر کے ہاں پہنچ گئے۔ اس وقت آرمی ہاؤس میں رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ صدر نے ان سے کہا اختر! آپ نے افغانستان میں جو کام کیا ہے، اس کا اجر صرف اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے، لیکن دنیاوی طور پر اللہ تعالیٰ نے جو طاقت مجھے دی ہے، اس کے ذریعے میں آپ کو پروموٹ کر رہا ہوں۔ یہ آپ کے لئے ایک چھوٹا سا انعام ہے کہ میں آپ کو جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی

کا چیئرمین بنا رہا ہوں صدر اپنی بات مکمل نہیں کر پائے تھے کہ جذبات کی شدت سے ان کی آواز رندھ گئی اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ان کے سامنے ایک ایسا شخص بیٹھا ہوا تھا، جس نے اپنی ساری زندگی ملک کے دفاع کو بہتر بنانے میں صرف کر دی تھی۔ وہ 63 سال کا ہو گیا تھا اور اب بھی جوانوں کی طرح محنت کرتا تھا، جس نے ایک کارنامہ انجام دیا تھا اور اس پر فخر کا اظہار نہ کرتا تھا، جس کے صبر کو بار بار آزمایا گیا تھا اور وہ مہر بلب اور بروئے کار رہا تھا۔ اس دنیا میں ایسے لوگ کہاں تھے، ایسے بہادر، اتنے وفادار، ایسے ایثار کیش، صدر رو دیئے اور پھر کچھ دیر کے بعد انہوں نے انگشت شہادت سے پہلے زمین اور پھر آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''اختر آپ نے آئی ایس آئی کو یہاں سے اٹھا کر وہاں پہنچا دیا۔ اب آپ چیئرمین کے منصب کو بھی اسی طرح اوپر لے جائیں'' یہ ایک بالکل واضح اشارہ تھا۔ آج کے بعد وائس چیف آف آرمی سٹاف کی بجائے، جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین کو اصل اختیارات حاصل ہونا تھے۔ صدر نے اس آدمی کو آج اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا، جس سے گیارہ سال پہلے انہوں نے ٹیلی فون پر استفسار کیا تھا کہ وہ ریٹائر ہونا پسند کرے گا یا فوج سے اپنی وابستگی برقرار رکھے گا؟

جیسا کہ جنرل اختر نے بعد میں بیان کیا۔ اپنا آخری جملہ کہنے کے بعد صدر نے ایک طویل سانس لیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئے۔ ایک بوجھ ان کے سر سے اتر گیا تھا۔ رکاوٹوں والی دوڑ ختم ہو چکی تھی، لیکن اب آنے والے دنوں کے لئے پردہ تقدیر میں کیا چھپا ہوا تھا؟

آٹھواں باب

آئی ایس آئی.........پراسرار بندے

انٹر سروسز انٹیلی جنس (آئی ایس آئی) کو افغان جنگ کی نبرد آزمائی میں کئی سال ہو چکے تھے۔ بری فوج کے ایک ممتاز جنرل اپنے دوست اختر عبدالرحمٰن سے ملنے گئے۔ وہ ان سے باتیں کر رہے تھے، جب انہوں نے چوڑی چھاتی والے ایک تنومند پنجابی بریگیڈیئر کو دیکھا۔ قدرے تعجب کے ساتھ انہوں نے سوال کیا کہ بری فوج کا یہ افسر یہاں کیا کر رہا ہے؟ رازداری میں اپنا ثانی نہ رکھنے والے آئی ایس آئی کے سربراہ نے ساتھی جرنیل کے سوال کو بہت زیادہ اہمیت نہ دی اور سرسری سے انداز میں کہا شاید وہ کسی کام سے آیا ہے۔ بری فوج کے جرنیل کو معلوم نہ ہو سکا کہ مرعوب نہ ہونے والا یہ شجاع افسر ہی وہ شخص ہے، جو افغانستان میں جنگی کارروائیوں کی نگرانی کر رہا ہے۔ چیزوں کو خفیہ رکھنا ہی انٹیلی جنس ایجنسیوں کا کام ہے لیکن جون 1979ء کے بعد سے جب اس ادارے کی تنظیم نو کا آغاز ہوا، آئی ایس آئی نے رازداری کے ایسے ریکارڈ قائم کیے کہ عسکری تاریخ جس کی چند مثالیں ہی پیش کر سکتی ہے تا آنکہ مارچ 1988ء میں اوجڑی کیمپ کے سانحہ نے ایک بحث کا دروازہ کھولا جس سے فائدہ اٹھا کر کے جی بی را اور خاد نے کم نظر سیاسی عناصر اور بائیں بازو کے دانشوروں کی مدد سے پروپیگنڈہ کی مہم اٹھائی اور بعد ازاں امریکہ کی افغان پالیسی تبدیل ہونے کے بعد سی آئی اے کی مدد سی مغربی ذرائع ابلاغ اس میں شامل ہو گئے۔ پاک فضائیہ کے پائلٹوں کے بعد جنہوں نے 1965ء میں اپنی کارکردگی سے ایک عالم کو ششدر کر دیا، آئی ایس آئی ہی وہ واحد ادارہ تھی جہاں پاکستانیوں نے اپنے ہنر اور کارکردگی سے دنیا کو حیران کیے رکھا۔ آج یہی وہ ادارہ ہے جو بیک وقت بھارت، امریکہ، روس اور اسلامی بم سے خوفزدہ اسرائیل کی

آنکھوں میں کانٹا بن کر کھٹک رہا ہے اور جسے تباہ کرنے پر پاکستان کے سارے دشمن متفق ہیں۔

ایک عام سے جاسوسی ادارے کی جگہ جسے 1971ء کے مشرقی پاکستان میں نو تخلیق را نے شکست فاش دے دی تھی اور جسے وزیر اعظم بھٹو کے ایک حکم کے تحت 1974ء سے سیاسی جماعتوں اور رہنماؤں کی نگرانی کے لئے بھی استعمال کیا جانے لگا تھا، یہ برتر ادارہ کیونکر وجود میں آیا؟

جون 1978ء آئی ایس آئی کے درویش منش، عبادت گزار سربراہ جنرل ریاض اچانک دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے ریاض ایک بڑے منفرد آدمی تھے۔ وضو کے سلیپر ان کے کمرے میں رکھے رہتے، ان کے گھر میں خواتین بہت سختی سے پردے کا اہتمام کرتیں اور انہوں نے کوئی جائیداد نہیں بنائی تھی۔ مشکلات میں گھرے صدر کو جو آئی ایس آئی کو زیادہ کارگر ادارہ بنانے کے لئے متفکر تھے، جنرل ریاض کی موت سے صدمہ ہوا، لیکن جب ان کے جانشین کا سوال پیدا ہوا تو وہ زیادہ تامل کا شکار نہیں ہوئے، نمایاں اور واضح ان کی نظروں کے بالکل سامنے ایک ایسا شخص موجود تھا جس پر پوری طرح بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ جو جنگجو، محنتی، وفادات، تازہ خیالات کو قبول کرنے والا، چوکنا اور درویش تھا۔ اس وقت سابق وزیر اعظم کو پھانسی پر لٹکائے جانے کے بعد دنیا ان پر برہم تھی، دشمن پر نگاہ رکھنے والے ادارے اور خود ان کی ذات کو اسی شخص کی ضرورت تھی۔

پھانسی کے بعد بھٹو کے خاندان نے جواب تیزی سے بائیں بازو کے زیر اثر آ رہا تھا، بھارت، لیبیا، شام اور روس سے رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ لاہور ہائی کورٹ میں بھٹو کے بیان حلفی میں ترامیم اور اضافوں کے بعد ''اگر مجھے قتل کیا گیا'' کے نام سے جو کتاب مرتب کی گئی، وہ ان کے خاندان کی اجازت سے بھارت میں شائع کی گئی۔ ان کے بیٹے مرتضیٰ بھٹو کابل میں الذوالفقار کا مرکز قائم کر چکے تھے، جہاں ایک سال

پہلے روس نواز کمیونسٹوں نے فوج کی مدد سے حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا، افغانستان میں ناراض پاکستانی نوجوانوں کو تخریب کاری کی تربیت دی جا رہی تھی۔ عرب ممالک جن سے بھٹو نے اپنے دورِ اقتدار میں قریبی مراسم قائم کر رکھے تھے، ضیاء الحق سے ناخوش تھے، امریکہ اور مغربی یورپ کو اعتراض تھا کہ ایک سیاسی جماعت کی جگہ فوج اقتدار میں تھی۔ ملک کے اندر پاکستان قومی اتحاد کی سیاسی جماعتیں جنہوں نے بھٹو کے ہاتھوں زخم کھائے تھے، اب اقتدار سے الگ ہو چکی تھیں وہ مشکلات کا شکار آدمی کا ہاتھ بٹانے پر آمادہ نہ تھیں۔ سردار عبدالقیوم خاں اور نوابزادہ نصر اللہ خاں ایسے سیاستدان جنہوں نے 1979ء میں بھٹو کی جان بخشی کی اپیلیں کی تھیں، ضیاء الحق سے بہت دور چلے گئے تھے۔ صدر اب تک اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ وہ ایسے آزادانہ انتخابات کے متحمل نہیں ہو سکتے جس کے نتیجے میں بھارت، روس، لیبیا، شام، افغانستان اور بھارت سے درپردہ مراسم رکھنے والی پیپلز پارٹی ایک بار پھر اقتدار میں آ کر اپنے مخالفین کو کچل ڈالے۔ یہ صرف فلسفی اے کے بروہی نہ تھے جنہوں نے انہیں یقین دلایا تھا کہ خدا نے انہیں ایک مقدس فریضہ سونپا ہے۔ بہت سے سیاستدان بھی راتوں کی تنہائی میں آ کر انہیں ملتے اور اصرار کرتے تھے کہ وہ اقتدار سے الگ نہ ہوں۔ ضیاء الحق چاہتے بھی تو شاید اب ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ شیر پر سوار تھے اور اس سے نیچے نہیں اتر سکتے تھے۔ اگلے تین ماہ میں صدر پاکستان قومی اتحاد کی جماعتوں کو رجسٹریشن کے تحت پابندیاں قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوششیں کرتے رہے اور ان کی یہ کوششیں ناکامی پر منتج ہوئیں۔ سیکرٹری جنرل پروفیسر غفور احمد اور صدر مولانا مفتی محمود کسی طرح اس پر رضامند نہ تھے۔ ادھر صدر کے ذہن میں شرکتِ اقتدار کا فلسفہ جنم لے چکا تھا۔ وہ بلدیاتی انتخابات کے ذریعے نئی قیادت ابھارنے کے آرزومند تھے اور سیاسی جماعتوں کو حدود و قیود میں رکھنا چاہتے تھے۔ حالات کے دباؤ کا شکار، پاکستان قومی اتحاد اس راہ پر چلنے کے

لئے تیار نہ تھا، جسے نورانی اور 1977ء میں شاہ ایران کے پاس حاضری دینے والے اصغر خاں پہلے ہی خیر باد کہہ چکے تھے۔ بالآخر 16 اکتوبر 1979ء کو صدر نے مکمل مارشل لاء نافذ کرتے ہوئے سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد کر دی اور اخبارات پر سخت سنسر لگا دیا۔ ریڈیو پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے اعلان کیا کہ اب مارشل لاء کو مارشل لاء کی طرح چلایا جائے گا۔ اب ہر طرف ایک لرزا دینے والا سناٹا تھا۔ خوف اور اندیشوں کی فصل اگ رہی تھی، دنیا بھر میں پاکستان کو گالی دی جا رہی تھی، جو ایک سرزمین بے آئین تھا اور اس کا دفاع کرنا مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔

جون 1979ء میں میجر جنرل اختر عبدالرحمن، لیفٹیننٹ جنرل بنا دیئے گئے اور انہیں آئی ایس آئی کا سربراہ مقرر کر دیا گیا۔ صدر نے اس موقع پر ان سے طویل گفتگو نہیں کی اور صرف کہا کہ وہ جنرل ریاض مرحوم کے ہاتھوں اس ادارے کی تنظیم نو چاہتے تھے اور یہ کام اب انہیں کرنا ہو گا جون کے ان گرم دنوں اور حبس زدہ شاموں میں جب بیدار مغز جرنیل نے ملک کی صورتحال پر سوچا ہو گا تو ان کے دل و دماغ پر کیا گزری ہو گی؟ سندھ میں را پہلے سے زیادہ سرگرم تھی۔ افغانستان سے مہاجروں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ایران میں ایک عظیم الشان عوامی انقلاب نے ہر چیز کو درہم برہم کر ڈالا تھا۔ کیا جرنیل ایک لمحے کے لئے ٹھٹک کر نہیں رہ گیا ہو گا؟ کوئی نہیں جانتا کہ جنرل اختر اس وقت کیا سوچ رہے تھے۔ عمر بھر انہوں نے ایسے مناصب سے گریز کیا تھا جن کا سیاست اور عوامی زندگی سے دور کا بھی واسطہ ہو لیکن اب انہیں سرحدوں کے باہر ہی نہیں اندر سے جنم لینے والے خطرات کا جائزہ لینا اور حکومت کو راستہ سمجھانا تھا۔ یہ ان کی ذمہ داری تھی اور وہ اپنی ذمہ داریوں سے انحراف کرنے والے آدمی نہ تھے۔ طوفان کا شکار ہونے والے کسی بحری جہاز کے مسافر کی طرح، جو ٹوٹے ہوئے جہاز کے کسی تختے کو مضبوطی سے پکڑ کر ساحل تک جا پہنچنے کا

عزم کرے، ایک بے پناہ رجائیت کے ساتھ وہ ہمیشہ مصروف عمل رہنے اور ہدف پر نگاہ رکھنے والے شخص تھے، چنانچہ جون 1979ء میں جب وہ آئی ایس آئی کی بلند و بالا مرکزی عمارت میں داخل ہوئے تو ساری مشکلات کے باوجود وہ اپنے ہدف کے بارے میں پوری طرح واضح تھے۔ اپنی زیر کمان بیٹریوں، رجمنٹوں، بریگیڈوں اور ڈویژنوں کی طرح جنہیں وہ 30 سال تک سنوارتے، بہتر بناتے اور مقابلے کا درس دیتے رہے تھے، انہیں ایک روایتی اور معمولی ادارے کو از سرِ نو تعمیر کر کے اپنے مقابل ادارہ سے برتر بنانا تھا۔ ''دوسروں سے بہتر اور برتر'' یہ اس آدمی کے طرز احساس کا سادہ سا اصول تھا جس نے زندگی میں کبھی ہار نہیں مانی تھی، جس نے اپنی زندگی کی سینکڑوں اور ہزاروں شاہین پہاڑوں پر چڑھتے گزاری تھیں اور جسے اپنے آپ پر قابو تھا جیسے ایک جہاندیدہ کاریگر کو مشین پر ہوتا ہے۔

جنرل اختر نے اپنی میز کے گرد افسروں کو جمع کر کے سوال کیا کہ اس تنظیم کو کیونکر بہتر بنایا جا سکتا ہے پھر انہوں نے ان میں سے الگ الگ بات چیت شروع کی۔ ہر شخص کو اندازہ تھا کہ اس کا واسطہ کام کے معاملے میں ایک بڑے ہی سخت آدمی سے ہے اور یہ کہ صرف لائق اور اہل لوگ ہی اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکتے ہیں۔ جنرل کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ گیا اور ان کی باتیں سنتا رہا۔ جب تک کوئی شخص غیر متعلق بات نہ کرے، وہ گھنٹوں تحمل اور توجہ کے ساتھ اس کی بات سنتا اور گاہے گاہے کاغذ پر نوٹس لیتا۔ وہ سوال کرتا اور بات کرنے والے سے توقع رکھتا کہ وہ اس سوال کا صاف، دو ٹوک اور براہ راست جواب دے۔ وہ کہانی سننے پر آمادہ نہ تھا اور تھا وہ مطلب کرتا تھا جس پر عمل کیا جا سکے۔ وہ کئی ہفتے تندہی کے ساتھ اس کام میں جتا رہا، کس شعبے میں کتنے اور کس طرح کے عملے کی ضرورت ہے، کہاں سٹاف زیادہ ہے اور کہاں کم۔ ماضی میں کس نے اپنے فرائض مستعدی سے انجام دیئے اور کس نے محض ماتحتوں کی کارکردگی پر انحصار کرنے کی کوشش کی۔ ادارے کو کہاں کہاں زیادہ

وسائل کی ضرورت ہے اور کس طرح کے نئے افسروں کی۔ جاسوسی کے مشکل کام کے لئے جو نئے حالات میں ایک چیلنج بن گیا تھا، کس طرح کے جدید آلات درکار ہیں۔ پھر اس نے اپنے افسروں سے کہا کہ وہ اسے دنیا میں جاسوسی کے بہترین اداروں کے بارے میں ایسی کتابوں کی فہرست بنا کر دیں، جن کے مطالعہ سے ان کے ڈھانچوں اور طریق کار کو سمجھا جا سکے۔

جنرل کو فائلوں سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ اگر ان کا مطالعہ ضروری ہوتا تو وہ اسے شام کے لئے اٹھا رکھتا۔ جب وہ سہ پہر کی ورزش اور سیر کے بعد گھر پر کام کیا کرتا تھا۔ وہ منصوبہ بندی اور حکمت عملی کا آدمی تھا اور اپنی توانائی غیر ضروری چیزوں پر صرف کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا تھا۔

اس واضح ذہن کے ساتھ جو قدرت نے اسے بخشا تھا اگلے دس بارہ ہفتوں میں اس نے ایک نقشہ مرتب کر لیا۔ تنظیم کو تبدیلیوں، نئے افسروں، احتساب کے نظام، مزید وسائل اور نئے آلات کی ضرورت تھی۔ اس نے کاغذوں پر وزارت دفاع اور صدر کے لئے نوٹس بنائے اور ان سے رجوع کیا۔ آئی ایس آئی کے صدر دفتر میں، جہاں ایک سے ایک کائیاں اور چوکنا افسر موجود تھا، جلد ہی خوشگوار حیرت کے ساتھ محسوس کیا جانے لگا کہ جنرل جب کبھی وزارت دفاع یا صدر سے رجوع کرتا تو ہمیشہ اپنی بات منوا کر لوٹتا۔ اس کے پاس ہمیشہ ٹھوس دلائل ہوتے اور وہ کبھی ایسا مطالبہ کرنے سے گریز کرتا جسے وہ جائز ثابت نہ کر سکے۔ ہفتوں سوچ بچار میں محو رہنے اور دوسروں کی باتیں سننے والا آدمی اب بدلا ہوا شخص تھا۔ تیزی اور اعتماد کے ساتھ اس نے احکامات صادر کئے۔ افسروں کے تبادلے کئے، بری فوج سے لائق اور محنتی آدمی ڈھونڈ کر انہیں ذمہ داریاں سونپیں، دفتر کے لئے سرعت کے ساتھ وہ چیزیں مہیا کی جانے لگیں جن کی واقعی ضرورت تھی یا جن کی مدد سے کام کو بہتر بنایا جا سکتا تھا۔ اپنے افسروں سے صاف صاف اس نے کہہ دیا کہ وہ آئی ایس آئی کو ایک جدید اور

متحرک ادارہ بنانا چاہتا ہے اور یہ کہ اس میں کسی ایسے شخص کے لئے کوئی جگہ نہیں جو کام سے شغف نہیں رکھتا۔ ایک سابق افسر نے کہا جو کچھ کتابوں میں لکھا ہوا ملتا اور کہانیوں میں سنا جاتا ہے وہ ہم اپنے سامنے برپا ہوتا دیکھ رہے تھے۔ ہم اس یقین کے ساتھ محنت کرتے تھے کہ ہماری تحسین کی جائے گی اور اگر کوتاہی کریں تو لازماً سزا ملے گی ایک اور اعلیٰ افسر نے جو کئی سال تک ادارے میں انتظامی ذمہ داریاں انجام دیتا رہا اور جسے کئی جرنیلوں کے ساتھ کام کرنے کا تجربہ تھا ایک واقعہ سناتے ہوئے کہا صبح کے ایک اجلاس کے دوران انہوں نے ایک ریٹائرڈ جنرل سے جن کی خدمات معاہدے کے تحت حاصل کی گئی تھیں، ایک خاص موضوع پر پے در پے سوالات کئے تو گھبرا کر اس نے کہا کہ وہ اس بارے میں زیادہ نہیں جانتا ایک محتسب کی بے رحما آواز میں آئی ایس آئی کے سربراہ نے ریٹائرڈ جنرل سے کہا تو آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ چنانچہ اسے آئندہ کے لئے محتاط ہوتے ہی بنی۔ ایک دوسرے افسر نے ایک خفیہ خط بھیجنے کے لئے اعلیٰ شخصیتوں کی فہرست مرتب کرتے ہوئے ان میں ایک ایسے عہدیدار کا نام شامل کر دیا جس کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ جنرل نے اسے دفتر میں طلب کیا اور جب وہ باہر نکلا تو ہمیشہ کے لئے یہ بات اس کی سمجھ میں آ چکی تھی کہ اس ادارے میں کام کرنے والا کوئی شخص غیر حاضر دماغی یا بے خبری کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

اس آدمی کی شخصیت کا ایک دوسرا رخ بھی تھا۔ کوئی افسر علیل ہو یا کسی کا بچہ بیمار ہو جائے، یا مصیبت میں جا پھنسے یا ناگہانی صدمے سے دوچار ہو جائے تو نہ صرف وہ اس کے لئے ہر ممکن رعایت کا اہتمام کرتا بلکہ ذاتی دلچسپی لے کر اس کی مدد کرنے کی کوشش کرتا۔ نو سال کے عرصے میں اس نے دل کے امراض کا شکار ہونے والے ایک درجن سے زیادہ افسروں کو علاج کے لئے بیرون ملک بھیجا۔ مصیبت زدہ آدمی کی امداد ہی وہ واحد پہلو تھا، جہاں وہ ضابطوں سے انحراف پر آمادہ ہو جاتا یا بعض اوقات صدر سے ذاتی مدد کی درخواست کرتا۔ ان کے معتمد نائب نے کہا وہ سخت

ڈسپلن میں کسا ہوا آدمی تھا اور دوسروں سے بھی نظم کی پابندی کا مطالبہ کرتا تھا۔ اس کے ہاں غلطی کی معافی تھی مستی کی نہیں۔ اگر کوئی شخص پیشہ ورانہ طور پر نا اہل اور اخلاقی اعتبار سے گرا ہوا ہوتو اسے سزا دینے کے لئے وہ آخر حد تک جا سکتا تھا۔ وہ بڑا سخت جان تھا اس کے معیار پر پورا اترنا آسان نہ تھا۔

27 دسمبر 1979ء کو افغانستان میں روس کی فوجی مداخلت کے بعد سرخ خطرہ پاکستان کی سرحدوں تک پہنچا اور صدر نے مزاحمت کرنے کا فیصلہ کیا تو چند مذہبی گروپوں اور جماعت اسلامی کے سوا جو اگرچہ سیاسی عمل کی بحالی کا مطالبہ جاری رکھے ہوئے تھی، افغان حریت پسندوں کی مدد کے لئے کوئی بروئے کار نہ آیا۔ پی این اے اور پیپلز پارٹی پر مشتمل سیاسی جماعتوں نے ایم آر ڈی تشکیل دی اور انتخابات کا مطالبہ کیا۔ پی آئی اے کا جہاز اغواء کر کے پہلے کابل اور پھر دمشق لے جایا گیا۔ بے بسی اور لاچارگی کے عالم میں جب روس کی زیر اثر حکومتیں دہشت گردوں کی مدد کر رہی تھی، الذوالفقار کی فراہم کردہ فہرست کے مطابق 54 قیدیوں کو رہا کر کے ملک سے باہر بھیج دیا گیا۔ ان میں سے زیادہ تر لندن میں جا ٹھہرے، جہاں برطانوی حکومت ان کی مالی مدد کرتی رہی اور اگلے سالوں میں انہوں نے بنیاد پرستوں سے نفرت کرنے والے مغربی پریس اور پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے خلاف سرگرم یہودی، امریکی اور مغربی سیاستدانوں کی مدد سے ضیاء الحق کے خلاف ایک طویل جنگ لڑی۔ ادھر سندھ میں راسر گرم عمل تھی۔ بھارت سے بڑے پیمانے پر لٹریچر چھپ کر آ رہا تھا اور جیئے سندھ کے حامیوں میں بھارتی آزادانہ رقوم بانٹ رہے تھے۔

آئی ایس آئی کوئی صورتحال میں زیادہ سرگرمی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینا تھے۔ جنرل پہلے سے زیادہ سخت گیر اور محتاط ہو گیا۔ افسروں کی تقرری کرتے ہوئے وہ سفارش مانتا اور نہ علاقے، ذات اور برادری کا حوالہ قبول کرتا۔ وہ ایک آدمی کو

ذمہ داری سونپتا اور پھر ہفتوں تک اس پر نگاہ رکھتا پھر یا تو وہ بھاگ جاتا یا معیار کے مطابق کام کرنے لگتا۔ سختی کے ساتھ بار بار اور مسلسل وہ اپنے ساتھیوں کو تلقین کرتا کہ وہ اپنی صحت کا خیال رکھیں۔ ایک افسر نے جب اس سے یہ کہا کہ اسے ورزش کرنے کا وقت نہیں ملتا تو اس نے جواب دیا ورزش اور عبادت کو اس جواز پر ترک نہیں کیا جا سکتا، وقت پر نہیں کر سکتے تو بے وقت کرو۔

زیادہ کام کرنے والوں کے لئے خصوصی مراعات کا اہتمام کیا گیا۔ جوانوں، چپراسیوں اور کلرکوں کے کھانے کا خاص طور سے خیال رکھا جاتا اور اگر اس میں کوتاہی اور بے احتیاطی ہوتی تو وہ سختی سے اس کا محاسبہ کرتا۔ بتدریج آئی ایس آئی محنتی اور پر عزم لوگوں کے لئے ایک جنت اور کام چوروں کے لئے جہنم بنتی گئی۔ یہ احساس عام ہونے لگا کہ اس ادارے سے وابستگی بڑی توقیر کی بات ہے۔ صدر بعض اوقات غیر متوقع طور پر انہیں طلب کر کے کوئی ذمہ داری سونپتے۔ زکوۃ آرڈیننس کے نفاذ کے بعد شیعہ رہنماؤں نے اسلام آباد میں ایک مظاہرہ کرتے ہوئے سیکرٹریٹ کا گھیراؤ کر لیا۔ وہ مذہبی قوانین کے نفاذ کی بنا پر صدر ضیاء الحق اور ان کی پر جوش حمایت کرنے والے سنی علماء اور ان کی جماعتوں کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ حکومت کو زکوۃ دینے پر آمادہ نہ تھے اور ان کے کچھ دوسرے مطالبات بھی تھے۔ سیاسی اعتبار سے شیعہ علماء کے پیروکار پھانسی پر چڑھ جانے والے ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی کے حامی تھے۔ سیکرٹریٹ کا رخ کرتے ہوئے ایک ممتاز اور اپنے فرقے میں محترم عالم دین نے بڑی جذباتی تقریر کی۔ انہوں نے کہا کہ وہ سیدنا امام حسینؓ کی طرح کہتے ہیں کہ روشنیاں گل کر دی جائیں اور جس کو جانا ہے وہ ابھی سے چلا جائے۔ جذبات اور ہیجان کا شکار مظاہرین مرنے مارنے پر تلے ہوئے تھے اپنے مطالبات تسلیم کرائے بغیر ایک قدم پیچھے ہٹنے پر آمادہ نہ تھے۔ ان کے ساتھ مذاکرات کی ساری کوششیں ناکام رہیں اور حکومت عملی طور پر یرغمال بنی بیٹھی تھی۔

تب صدر نے جنرل اختر عبدالرحمن سے کہا کہ وہ ان سے مذاکرات کریں۔ چند گھنٹوں کے اندر ایک معاہدہ طے پا گیا اور خون خرابے کا خطرہ ٹل گیا۔ جنرل اختر کے مزاج کی غیر معمولی لچک اور ہیجان میں اعتدال پر قائم رہتے ہوئے متوازن رویہ اختیار کرنے کی روش نے ہمیشہ ان کی مدد کی۔ وہ تعصب سے بالاتر ہو کر سوچ سکتے تھے اور لوگ ان پر اعتماد کرنے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔

بعد ازاں ایران کے ساتھ مراسم بہتر بنانے میں انہوں نے بڑی مدد کی۔ ہر چند کہ ضیاء الحق امام خمینی کا احترام کرتے تھے اور انہیں ایرانی انقلاب سے کوئی چڑ نہ تھی لیکن افغانستان میں جاری جنگ نے انہیں امریکہ کا قریبی حلیف بنا دیا تھا اور پاکستان امریکی امداد حاصل کرنے والے تین نمایاں ممالک کی فہرست میں شامل ہو چکا تھا۔ بہت سے ممتاز پاکستانی شیعہ صدر کے مخالف تھے اور ایرانی حکومت کو ان کے خلاف اکساتے رہتے تھے۔ عراق کے ساتھ جنگ میں الجھا ہوا ایران پاکستان سے توقع رکھتا تھا کہ وہ اسی طرح اس کی مدد کرے جس طرح 1965ء کی جنگ میں دیوقامت بھارت کی ناراضگی مول لے کر ایران پاکستان کی مدد کو آیا تھا۔ اس وقت جب جہاد افغانستان کے لئے سعودی عرب سب سے زیادہ مالی مدد فراہم کر رہا تھا، یہ کسی طرح ممکن نہ تھا۔ پاکستان میں بائیں بازو کے دانشور، پیپلز پارٹی کے حامی اور صدر سے ناراض سیاسی رہنما یہ تاثر دینے کے لئے سرگرم تھے کہ پاکستانی سرزمین کو ایران کے خلاف جاسوسی کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے اور یہ کہ بلوچستان میں خفیہ طور پر امریکی اڈے قائم ہیں۔ اس وقت جب افغانستان کی وجہ سے آئی ایس آئی اور سی آئی اے میں قریبی تعاون جاری تھا، ایران فطری طور پر اس پروپیگنڈے کا اثر قبول کر رہا تھا۔

صدر ضیاء الحق جنرل اختر سے اس بارے میں مشورہ کرتے رہے۔ وہ دونوں اس بات پر متفق تھے کہ ایران کو ناراض نہیں کیا جانا چاہئے، ہر چند کہ امریکی دباؤ بڑھتا جا

رہا تھا لیکن دونوں جرنیلوں کو یقین تھا کہ پاکستان کا دفاعی مستقبل ایران کے ساتھ قریبی تعلقات کی متقاضی ہے۔ ادھر ایرانی اخبارات ایسے کارٹون شائع کر رہے تھے جن میں صدر ضیاء الحق کو جمی کارٹر کے بوٹ میں بیٹھے دکھایا گیا تھا، تو ایسے میں برف پگھلانے کے لئے کون سی راہ اختیار کی جائے، جبکہ ایرانیوں کے ساتھ اعلیٰ سطح کا رابطہ تقریباً ختم ہو چکا تھا۔

ایک رات دو بجے جنرل اختر نے اپنے ایک معتمد کو نیند سے بیدار کیا۔ انہوں نے بریگیڈیئر کو پیار کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا کیا تم ملک سے باہر جانا پسند کرو گے فوجی افسر ساری رات جاگتا رہا۔ وہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا کہ اسے کس مشن پر کہاں بھیجا جا رہا ہے لیکن وہ خوش دلی کے ساتھ حکم کی تعمیل کے لئے تیار تھا۔ اگلی صبح بتایا گیا کہ اسے ایران میں ملٹری سیکرٹری بنا کر بھیجا جا رہا ہے۔

نیا فوجی اتاشی شیعہ مکتب فکر سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ ایک کشادہ دل، قوت متخیلہ کا حامل اور ملک کا درد رکھنے والا آدمی تھا۔ اسے اپنا کام صفر سے شروع کرنا تھا۔ اس نے فارسی سیکھی اور ممتاز ایرانی شخصیتوں سے ذاتی مراسم قائم کئے۔ وہ جنرل اختر کے اس نظریے کا پرزور حامی تھا کہ پاکستان کو اپنے دفاع کے لئے بھارت کو قابو میں رکھنے اور ترکی اور ایران کے ساتھ قریبی مراسم کی ضرورت ہے اور یہ کہ صرف اسی صورت میں پاکستان اپنے نظریاتی اور جغرافیائی دفاع پر قادر ہو سکتا ہے۔ مستقل مزاجی کے ساتھ وہ اپنے کام میں لگا رہا تا آنکہ ایک روز جنرل اختر کو ایران کا دورہ کرنے کا اشارہ موصول ہوا۔ یہ بڑی حیرت انگیز بات تھی کہ ایرانی پاکستان کی کسی سیاسی شخصیت یا وزارت خارجہ سے نہیں، انٹیلی جنس سروس کے سربراہ سے بات کرنا چاہتے تھے اور اس سے بھی زیادہ تعجب خیز بات یہ تھی کہ امام خمینی جو کسی سربراہ مملکت سے بھی بہت کم ملنے پر آمادہ ہوتے تھے ان سے ملاقات کے لئے تیار تھے۔

تہران سے پاکستانی سفیر کو ساتھ لے کر جنرل اختر قم گئے اور گلیوں سے ہوتے

وہ بے اس مختصر سے مکان پر پہنچے جہاں ہمیشہ اپنی ضد اور رائے پر قائم رہنے والا اونچے قد کا آدمی مقیم تھا۔ یہ جنرل اختر کی زندگی کے ان چند دنوں میں سے ایک تھا جب انہوں نے اچکن اور جناح کیپ پہن رکھی تھی۔

معمولی سے اس مکان میں پاکستانی وفد کو ایک کمرے میں لے جایا گیا جہاں امام خمینی ان کا خیر مقدم کرنے کے لئے اٹھے۔ وہ فرش پر بیٹھتے تھے اور لوگوں کے ساتھ ہاتھ ملانے سے گریز کرتے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں سالہا سال تک ہر روز ہزاروں لوگوں سے ملنا پڑا تھا اور اب وہ اس سے اکتا چکے تھے۔ ایرانیوں کو اس پر حیرت ہوئی کہ امام نے اپنا ہاتھ جنرل اختر کے لئے آگے بڑھایا اور پھر انہیں ساتھ لے کر فرش پر بیٹھ گئے۔ ہلکے نیلے رنگ والے کمرے میں جس کے فرش پر بھی نیلے رنگ کا سستا ایرانی قالین بچھا تھا، وہ ایک دوسرے کے بالکل قریب ہو کر بیٹھ گئے۔ مختصر، سادہ اور واضح الفاظ میں جنرل اختر نے روحانی پیشوا اور ایرانی انقلاب کے بانی کو بتایا کہ پاکستان ایران سے بہتر تعلقات کا آرزومند ہے۔ خمینی خاموشی سے سنتے رہے اور جب جنرل اپنی بات ختم کر چکا تو انہوں نے اتنے ہی مختصر الفاظ اور بے ساختہ انداز میں کہا کہ وہ بھی دونوں ملکوں کے مراسم میں بہتری کے آرزومند ہیں۔ امام کی طرف سے انہیں سونے کی بنی تین آرائشی پلیٹوں کا تحفہ دیا گیا جن پر قرآن مجید کی آیات لکھی تھیں اور وہ واپس جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ خمینی اپنے مہمان کو الوداع کہنے کے لئے دروازے تک آئے۔ ایرانیوں کے لئے یہ بڑا تعجب خیز تھا۔ وہ تو کسی سربراہ مملکت سے بھی اتنی مروت نہیں برتتے تھے۔ انہوں نے سالوں، عشروں تک زمانے کی سختیاں سہی تھیں اور اپنی جنگ تنہا لڑی تھی۔ اس علاقے سے انہوں نے امریکی استعمار اور شہنشاہیت کو اکھاڑ پھینکا تھا، وہ دنیا سے بے نیاز آدمی تھے اور کسی کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ دونوں آدمی مصافحہ کر چکے تو پاکستانی سفیر نے بھی اپنا ہاتھ آگے بڑھایا لیکن روحانی پیشوا نے اس کی طرف دیکھا

تک نہیں۔ اسے شبہ تھا کہ یہ شیطان بزرگ امریکہ سے راہ و رسم رکھتا ہے، بعد میں اس سفیر کو جلد ہی واپس بلا لیا گیا۔

پاکستان کے دفتر خارجہ کو جہاں قدم قدم پر امریکہ کے پر جوش حامی موجود تھے، اس ملاقات کی خبر ملی تو اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا لیکن صدر نے جو ہمیشہ سب کی بات سننے کے لئے تیار رہتے تھے اس کی کوئی پرواہ نہ کی۔ برف پگھل چکی تھی جیسا کہ ایک ممتاز شخصیت کا کہنا ہے کہ جنرل اختر نے ایرانیوں کے لئے جو کچھ کیا وہ اسے کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے (ہر چند کہ اس کی تفصیلات موجود ہیں، تاہم ہر ملک کی اپنی محفوظ معلومات ہوتی ہیں جن کا تحفظ بہر حال ناگزیر ہے) علی اکبر ولایتی نے اگلے دنوں میں پاکستان کے کئی خفیہ دورے کئے اور جنرل اختر سے ملتے رہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ امریکیوں کو ان تعلقات کی سن گن مل گئی ہو اور کیا بعید ہے کہ یہیں سے جنرل اختر اور ان کے لیڈر صدر ضیاء الحق سے ان کی ناراضگی کا آغاز ہوا ہو۔

یہ صرف ایران ہی نہیں تھا جس کا جنرل نے خفیہ دورہ کیا۔ وہ سری لنکا بھی جاتے رہے اور ایک بار تو صدر ضیاء الحق کو ساتھ لے کر افغانستان کے ایک جنگی محاذ پر بھی گئے۔ سری لنکا پاکستان کے لئے بڑا اہم تھا جس سے بہت سے میدانوں میں تعاون جاری تھا۔ بعد میں دوسروں کے علاوہ عساکر پاکستان کی ایک اساطیری شخصیت بریگیڈیئر ٹی ایم کو بھی سری لنکا بھیجا گیا۔ سری لنکا بھارت کے غلبے سے بچنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ گرانڈیل بھارت کی سازشوں سے خوفزدہ یہ ننھا سا ملک آئی ایس آئی کے لئے بھارتی سرگرمیوں کے بارے میں جاننے کا ایک بڑا ذریعہ تھا۔

بظاہر افغانستان ہی سب سے بڑا مسئلہ دکھائی دیتا تھا لیکن یہاں آئی ایس آئی کو سی آئی اے کا تعاون حاصل تھا جو سیٹلائٹ سے حاصل کی جانے والی تصاویر اور دوسرے جاسوسی ذرائع کی مدد سے روسیوں کی سرگرمیوں کے بارے میں بہت قیمتی

اور فراواں معلومات مہیا کرتی تھی۔ دردِ سر تو بھارت تھا، جس کے ایجنٹ پورے ملک بالخصوص سندھ میں سرگرم تھے، جو الذوالفقار کی سرپرستی کر رہا تھا اور پاکستان کی بعض نمایاں شخصیتوں سے اس کے مراسم تھے۔ سوویت یونین کی خفیہ ایجنسی کے جی بی اور افغانستان کی خاد پاکستان میں گڑبڑ پھیلانے کے لئے را سے تعاون کر رہی تھی۔

متفکر ضیاء الحق نے جنرل اختر سے سوال کیا کہ بھارتی دباؤ کا حل کیا ہے؟ جنرل اختر کو یقین تھا کہ بھارتی کبھی شرافت کی زبان نہیں سمجھیں گے۔ وہ پاکستان کے وجود کو دل سے تسلیم نہیں کرتے اور اکھنڈ بھارت اب بھی ان کی منزل ہے۔ انہوں نے صدر کے سامنے ایک منصوبہ پیش کیا۔ یہ حیران کن اور متذبذب کر دینے والا تھا۔ صدر خاموش رہے اور انہوں نے کہا اس پر بہت احتیاط کے ساتھ غور و فکر کی ضرورت ہے لیکن اختر پہلے ہی اس پر کافی سوچ بچار کر چکے تھے۔ مکمل مفاہمت سے پیدا ہونے والے اس یقین کے ساتھ جو ان دونوں کے درمیان کارفرما تھی، انہوں نے اس منصوبے پر عمل درآمد کا آغاز کر دیا۔ آئی ایس آئی نے بھارت میں دور تک اپنی جڑیں پھیلا دیں۔ اندرا گاندھی کے دفتر سے ایک سے زیادہ فائلیں پاکستان پہنچا دی گئیں۔ بھارتی فوج کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھی جانے لگی۔ کشمیر کے حالات کا مطالعہ کیا گیا اور ان لوگوں کی تلاش شروع کر دی گئی جو تحریک آزادی کی قیادت کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی صدر نے امن کے حملے (PEACE OFFENSIVE) کا آغاز کر دیا۔

انہوں نے بھارتی ادیبوں، اخبار نویسوں اور اداکاروں سے ذاتی مراسم قائم کئے اور اس میدان میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھارتی سرزمین پر آئی ایس آئی کا جال اتنا وسیع اور اس قدر گہرا ہو گیا کہ دسمبر 1986ء میں جب بھارت نے براس ٹیک مشقوں کے نام پر پاکستان پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا تو پاکستانی ایجنٹ اس کی ساری تفصیلات لے اڑے۔ جہاں کہیں بھارتی افواج نے

پاکستانی سرحدوں کی طرف حرکت کی، انہوں نے پاکستانی دستوں کو اپنے سامنے پایا۔ سخت کشیدہ ماحول میں صدر نے ملک کو جنگ سے بچانے کی کوششیں جاری رکھیں اور وہ کرکٹ کا ایک میچ دیکھنے بھارت کی سرزمین پر جے پور شہر جا پہنچے۔ اس پر ایک ممتاز بھارتی اخبار نے لکھا جس طرح پاکستان کی کرکٹ ٹیم ہمیشہ بھارتیوں کو ہرا دیتی ہے، صدر ضیاء الحق ہمیشہ ہمارے حکمرانوں کو زچ کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ پاکستان واپس پہنچ کر صدر ضیاء الحق نے فوجی افسروں کے ایک اجلاس کی صدارت کی، جس میں جنرل اختر عبدالرحمن کو خراج تحسین پیش کیا گیا کہ ان کی آئی ایس آئی نے ملک کو جنگ اور تباہی سے بچالیا۔ نہ صرف صدر بلکہ کئی دوسرے جرنیلوں نے کہا اس کا سہرا اس آدمی کے سر ہے جس نے کبھی خود آگے بڑھ کر کریڈٹ لینے کی کوشش نہیں کی۔

جنرل اختر کو بھارتیوں سے اور بھارتیوں کو جنرل اختر سے چڑ تھی۔ ایک صبح بھارت سے ایک ٹیلکس موصول ہوا جس میں بتایا گیا تھا کہ بھارتیوں نے نئی دہلی میں پاکستانی سفارت خانے کے ایک اہلکار کو مارا پیٹا، جنرل اختر نے اپنے ایک ماتحت کو طلب کیا اور یہ ٹیلکس اس کے حوالے کی۔ انہوں نے کوئی تفصیل نہیں بتائی اور اشارے سے کہا کہ بھارتیوں کا قرض چکا دیا جائے۔ یہ افسر اس وقت کمرے سے باہر نکل رہا تھا جب انہوں نے قدرے بلند آواز میں کہا DOnt kill him (اسے قتل نہ کر ڈالنا)

اسی شام آئی ایس آئی کے تربیت یافتہ کارکنوں نے بھارتی سفارت خانے کے ایک اہلکار کو جالیا۔ جس افسر کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی وہ کچھ زیادہ ہی پر جوش نکلا۔ اس نے بھارتی افسر کو دو چار تھپڑ رسید کرنے کی بجائے جی بھر کر اس کی پٹائی کی، اس کا لباس اتروایا اور رات کی تاریکی میں اسے اسلام آباد کی ایک سڑک پر چھوڑ دیا۔ لیکن جب یہ اطلاع صدر دفتر میں پہنچی تو ایک دوسرا گروپ بھیجا گیا۔ انہوں نے اسے

پہننے کے لئے نئے کپڑے دیئے، نئی جرابیں، بوٹ اور گھڑی، نہا دھو کر، کپڑے بدل کر، جب وہ سفارت خانے پہنچا تو اسے اپنے ساتھیوں کو یقین دلانے کے لئے بڑی کوشش کرنا پڑی کہ اس کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے۔ اگلی صبح بھارتی سفیر صدر پاکستان اور اس کا فوجی اتاشی جنرل اختر سے ملاقات کے لئے فون کرتے رہے۔

آئی ایس آئی کے ایک سابق افسر نے اس واقعہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بے نظیر کے دور حکومت میں نئی دہلی میں ایک سینئر پاکستانی افسر کے ساتھ توہین آمیز سلوک کا حوالہ دیا اور کہا اب حالات کس قدر بدل گئے ہیں۔ ہمارے ایک اعلیٰ افسر کی بے عزتی کی جاتی ہے اور ہم خاموش ہو رہتے ہیں۔ دکھ اور رنجیدگی کے ساتھ اس نے کہا ''ہم کتنے بے شرم ہو گئے، اتنے گر گئے''

ایک سے زیادہ بار ایسے بھارتی ایجنٹ پکڑے گئے جنرل اختر کو قتل کرنے کا ہدف دیا گیا تھا۔ آئے روز ایسے بے نام خطوط موصول ہوئے جن میں جنرل اور اس کے اہل خاندان کو ہلاک کرنے کی دھمکیاں ہوتیں۔ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ جنرل کی زندگی میں ان کے چاروں بیٹے **ملک** سے باہر تھے اور خاندان کی حفاظت کے لئے سخت انتظامات کئے جاتے تھے۔ ان کے بیٹوں میں سے کوئی وطن آنا چاہتا تو اسے پہلے سے اپنے والد سے اجازت حاصل کرنا پڑتی اور یہ اجازت ہر بار نہیں ملتی تھی۔ سہ پہر کی جوگنگ کے لئے وہ آرمی ہاؤس کے عقب میں واقع اپنے گھر سے سوار ہو کر آرمی ہاؤس کے سامنے والے دروازے سے گالف کورس میں داخل ہوتے تو جھاڑیوں میں بیٹھے کمانڈوز ان کی حفاظت کر رہے ہوتے۔

جنرل اختر عبدالرحمن نے کشمیر کی تحریک آزادی کے لئے جو منصوبہ بنایا تھا اسے 1991ء میں بروئے کار آنا تھا بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ افغانستان کی آزادی کے ہدف کو ذہن میں رکھ کر بنایا گیا تھا جو ان کی رائے میں 1989ء کے موسم بہار میں حاصل کی جاسکتی تھی۔ تاہم اس کے لئے کام کا آغاز 1984ء میں کر

دیا گیا تھا۔ افغان حریت پسندوں کے برعکس جن کی بڑی تعداد کو آئی ایس آئی کے افسروں نے تربیت دی، کشمیر کے لئے ایک بالکل دوسری حکمت عملی اختیار کی گئی چونکہ بھارت کے مقبوضہ علاقے سے بڑی تعداد میں لوگ آسانی سے پاکستان نہیں آسکتے تھے اور ایسا کرنے کی صورت میں دوسری مشکلات کے علاوہ رازداری ختم ہونے کا احتمال تھا، لہٰذا صرف ایسے لوگوں کو تربیت دی گئی جو بعد میں دوسروں کو سکھا سکیں۔ جیسا کہ بعد ازاں کشمیری چھاپہ مار رہنما شبیر شاہ نے بھارتی جریدے انڈیا ٹوڈے کو ایک انٹرویو میں بتایا جنرل اختر کو اس عمل سے اتنی دلچسپی تھی کہ وہ ذاتی طور پر ان کشمیریوں سے ملے جو اپنے وطن کی آزادی اور پاکستان سے اس کے الحاق کے لئے جانیں ہتھیلیوں پر لے کر نکلے تھے۔ کشمیریوں کے کئی گروپوں کے مجاہدین کے ساتھ افغانستان بھجوایا گیا اور رازداری کا ایسا اہتمام کیا گیا کہ خود مجاہدین کو ان لوگوں کے بارے میں کوئی معلومات نہ تھیں۔ وہ انہیں عام پاکستانی سمجھتے تھے جو اردو بولتے اور جہاد کے جذبے سے ان کے ساتھ جا رہے تھے۔ کشمیریوں کو کچھ اسلحہ بھی دیا گیا جو افغان حریت پسندوں کے استعمال کے لئے موزوں نہ تھا۔ 17 اگست 1988ء کو صدر ضیاء الحق اور ان کے ممکنہ جانشین کی ناگہانی موت نے کشمیریوں کو اپنا منصوبہ وقت سے پہلے اور اپنے طور پر بروئے کار لانے پر مجبور کر دیا اور اب وہ اپنی جنگ پاکستان کی مدد کے بغیر لڑ رہے ہیں۔

مشرقی پنجاب کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے جہاں سکھ آزادی کے لئے بھارتی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے، ایک بریگیڈیئر کی قیادت میں خصوصی ڈیسک بنایا گیا۔ اگرچہ اس علاقے میں را کے ایجنٹوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی لیکن سکھوں نے پورے صوبے میں آگ لگا دی۔ وہ جانتے تھے کہ انہیں کس شخص کو قتل کرنا، کہاں بم رکھنا اور کس دفتر کو ہدف بنانا ہے۔ جلد ہی بھارت کی مرکزی حکومت چیخ اٹھی کہ پاکستان سکھوں کی مدد کر رہا ہے حتیٰ کہ یہاں پاکستان

میں پیپلز پارٹی کی سربراہ محترمہ بےنظیر بھٹو نے کہا کہ پاکستان سکھ کارڈ استعمال نہ کرے ورنہ بھارت سندھ کارڈ استعمال کرے گا۔ نیپال کی سارک سربراہ کانفرنس میں جب وزیراعظم جونیجو سے ملاقات میں راجیو گاندھی نے یہ سوال اٹھایا تو انہوں نے جواب دیا کہ پاکستان سندھ میں بھارتی سرگرمیوں اور سرحد پار تخریب کاروں کی تربیت کے دستاویزی ثبوت مہیا کرسکتا ہے، کیا بھارت مشرقی پنجاب میں پاکستان کے ملوث ہونے کی کوئی شہادت فراہم کرسکتا ہے؟

مارچ 1987ء میں جب جنرل اختر عبدالرحمن آئی ایس آئی سے الگ ہو کر جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین بنائے گئے تو آئی ایس آئی نے بھارتی سفارت خانے سے نئی دہلی کے ساتھ کی جانے والی ایک گفتگو ریکارڈ کی جس میں اس واقعہ پر مسرت کا اظہار کیا گیا تھا بھگوان کی کرپا ہے کہ اس جرنیل سے ہماری جان چھوٹی۔

بھارت میں پاکستان کی جاسوسی سرگرمیوں نے بھارتیوں کے لئے آگے بڑھ کر وار کرنا مشکل بنا دیا، چنانچہ صدر ضیاء الحق کے دور اقتدار میں جب افغانستان ایک تباہی سے دوچار تھا، سری لنکا میں خانہ جنگی ہو رہی تھی، ایران عراق کے ساتھ جنگ میں الجھا ہوا تھا، پاکستان اس خطے میں استحکام کا واحد جزیرہ تھا۔ افغان جنگ کی وجہ سے امریکہ سے حاصل ہونے والی عسکری امداد کے بل پر پاکستانی افواج کی تعمیر نو کی گئی اور اسے ایف 16 طیاروں سمیت بہترین اسلحہ سے لیس کر دیا گیا۔ جنرل ضیاء الحق نے اپنے دورہ امریکہ میں ایک ٹیلی ویژن انٹرویو میں اپنی حکومت کے کارناموں کا تذکرہ کرتے ہوئے انٹیلی جنس کے شعبے کی کامیابیوں کا حوالہ بھی دیا۔ سانحہ 17 اگست کے چھ ماہ بعد بےنظیر بھٹو کے وزیراعظم بننے پر بھارتی وزیراعظم راجیو گاندھی پاکستان کے دورے پر آتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ حکومت پاکستان کے نام ایک پیغام میں انہوں نے اس اندیشے کا اظہار کیا کہ اسلام آباد میں بھارت سے

نفرت کرنے والے آئی ایس آئی کے ایجنٹ انہیں ہلاک کر سکتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ را کے ایجنٹوں اور محافظوں کی ایک بڑی تعداد لے کر آئے جو راستوں کی نگرانی کرتے رہے وزیراعظم بے نظیر سے علیحدگی کی ملاقات میں انہوں نے جس نکتے پر سب سے زیادہ زور دیا وہ یہ تھا کہ آئی ایس آئی کی قوت کو ختم کر دیا جائے۔ انہوں نے وزیراعظم سے کہا کہ یہ ادارہ ان کے اقتدار کو خطرے میں ڈال سکتا ہے۔

آٹھویں عشرے کے وسط میں خود امریکیوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ آئی ایس آئی تیسری دنیا کی سب سے طاقتور جاسوسی تنظیم بن چکی ہے۔ پاکستانی افسروں کے ساتھ ملاقاتوں میں سی آئی اے کے افسر برملا کہتے تھے کہ اس ادارے نے شہرہ آفاق اسرائیلی تنظیم موساد کو پیچھے چھوڑ دیا ہے جو عربوں کی عسکری شکست میں مرکزی کردار ادا کرتی رہی ہے۔ وہ اعتراف کرتے تھے کہ بعض اعتبار سے یہ ادارہ سی آئی اے سے بھی بہتر ہے مثلاً وہ نکاراگوا اور کیوبا میں امریکی خفیہ ادارے کی جنگی کارروائیوں کا موازنہ افغانستان میں آئی ایس آئی کی کوششوں سے کرتے اور پاکستانی ادارے کو خراج تحسین پیش کرتے۔ ایک بار جب جنرل اختر سے اس موضوع پر تبصرہ کرنے کو کہا گیا تو انہوں نے کہا امریکی اس میدان میں ہمارے ہم پلہ کیسے ہو سکتے ہیں؟ ہمارے لوگ شہادت کو ایک اعزاز سمجھتے ہیں ان کا ایک نظریہ اور عقیدہ ہے اور وہ موت سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔

آئی ایس آئی کے ملازمین کی تعداد بتدریج ایک لاکھ تک جا پہنچی۔ ماضی کی اس ایجنسی کے مقابلے میں جس کے اہلکار بعض اوقات سائیکلوں پر سفر کرتے تھے اب اس کے ملازمین کے پاس موٹر سائیکل، کاریں اور دوسری گاڑیاں تھیں۔ ہر شہر میں اس کے دفاتر قائم تھے۔ ڈاک کی بجائے اب اس کے پیغامات ٹیلی فون کے ذریعے ایک سے دوسرے شہر پہنچائے جاتے اور معلومات تیزی سے صدر دفتر پہنچائی جاتیں۔ ایسے پرانے افسروں کو یک بینی و دو گوش نکال دیا گیا جو اخلاقی کمزوریوں کا

شکار تھے میں انہیں گردن سے پکڑ کر صدر کے حوالے کر دیتا ہوں ایک بار جنرل اختر نے بتایا ان میں سے بعض کو سزا دیتے ہیں اور بعض کو معاف کر دیتے ہیں۔

یہ سب کچھ خاموشی کے ساتھ انجام پا رہا تھا۔ بعض اوقات جنرل کے ماتحت ان سے درخواست کرتے کہ وہ اپنے کارناموں کا کریڈٹ لینے سے اس قدر ہچکچائیں نہیں۔ وہ ریڈیو، ٹی وی، اخبارات اور عالمی پریس سے اس قدر گریز کا راستہ اختیار نہ کریں لیکن وہ اس معاملے میں بے حد واضح تھے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ خفیہ اداروں اور ان سے متعلق افراد کو ہر حال میں نظروں سے اوجھل رہنا چاہئے۔ وہ تقریبات میں جانے سے گریز کرتے اور جب صدر مملکت کی وجہ سے ایسا کرنا ضروری ہو جاتا تو افواج کے شعبہ تعلقات عامہ کے توسط سے ٹیلی ویژن کو ہدایت بھجوائی جاتی کہ جنرل اختر تصویر میں دکھائی نہیں دینے چاہئیں۔ ٹی وی کا کیمرہ حرکت کرتا ہوا آتا اور جرنیل کے قریب آ کر رک جاتا۔ یہی نہیں وہ غیر ممالک کے دورے سے بھی گریز کرتے۔ سی آئی اے کے سربراہ ولیم کیسی نے بارہا انہیں امریکہ کے دورے کی دعوت دی لیکن کام میں مگن رہنے والا آدمی انہیں ٹالتا رہا حتیٰ کہ ایک بار اس نے صدر کی موجودگی میں اس پر آمادہ کرنا چاہا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اس نادر آدمی کو امریکی صدر سے ملوائیں اور غالباً وہ مسٹر ریگن سے اس کا وعدہ بھی کر چکے تھے لیکن جنرل انہیں ٹالتا رہا۔ حتیٰ کہ مسٹر کیسی نے اس پر واضح ناراضگی کا اظہار کیا۔ جنرل کی شہادت کے بعد اس کے جانشین ولیم ویبسٹر تعزیت کے لئے آئے تو ان کے چاروں بیٹوں کو خوبصورت فریموں میں ورڈز ورتھ کی مشہور نظم The happy Warrior (خوش دل جنگجو) کا تحفہ پیش کیا۔ یہ نظم ایک ایسے جانباز کی تصویر بیان کرتی ہے جو اپنے وطن اور قوم کے لئے رزم آرائی میں مگن رہتا ہے اور جس کے لئے زندگی سادگی، توقیر اور بے نیازی کا نام ہے۔

آئی ایس آئی نے حکومت کے خلاف ایک سے زیادہ سازشوں کا سراغ لگا کر

انہیں ناکام بنایا۔ ان میں سے ایک وہ تھی جو لندن میں مقیم مصطفیٰ کھر نے بھارتی خفیہ ایجنسی را کی مدد سے تیار کی تھی اور جس کے لئے کچھ اسلحہ لاہور پہنچا دیا گیا تھا۔ اس سازش کی پس پردہ کہانی بائیں بازو کے وکیل رضا کاظم نے ایک کتاب میں تفصیل سے بیان کی ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ خطرناک سازش وہ تھی جو بری فوج کے ایک میجر جنرل تجمل حسین نے جنرل چشتی کے ناکام منصوبے کے کچھ عرصہ بعد مرتب کی۔ وہ 23 مارچ 1980ء کی تقریب میں صدر کو ہلاک کر دینا چاہتے تھے۔ وہ مذہبی انتہا پسند تھے اور ان کے خیال میں صدر نے تیزی سے اسلامی قوانین نافذ کرنے کی ذمہ داری پوری نہ کی تھی اور یہ کہ وہ اقتدار پر فائز رہنے کے حق دار نہ تھے۔ یہ پرواہ کیے بغیر کہ اس کے نتیجے میں کیا بحران پیدا ہو سکتا ہے، وہ اپنے منصوبے پر عمل درآمد کا تہیہ کیے ہوئے تھے۔ آئی ایس آئی نے وقت سے پہلے ہی انہیں جا لیا جب وہ بعض افسروں سے رابطہ کر کے انہیں اپنے منصوبے میں شرکت پر آمادہ کر رہے تھے۔ کسی شور شرابے اور ہنگامے کے بغیر ان پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلا گیا اور انہیں سزا سنا دی گئی۔ سانحہ 17 اگست کے بعد ان دونوں مصطفیٰ کھر اور میجر جنرل تجمل حسین کو رہا کر دیا گیا۔

ملک کی اندرونی صورتحال کے حوالے سے شخصیتوں، جماعتوں، اداروں اور علاقوں کے بارے میں جنرل اختر کے پاس تازہ ترین معلومات کا ایک انبار پہنچتا رہتا تھا، چنانچہ وہ ہر نئی پیش رفت سے آگاہ رہتے اور حالات کے بہترین تجزیے پر قادر ہو گئے تھے۔ صوبوں کے وزرائے اعلیٰ اور گورنر ان سے مشورہ حاصل کرنے کے لئے فون پر رابطہ کرتے بعض اوقات یہ گفتگوئیں بڑی طویل ہوتیں۔ انہیں امن و امان سے لے کر خارجہ پالیسی تک سے متعلق اجلاسوں میں مدعو کیا جاتا۔ ایک سابق افسر کے بقول جب جنرل اختر بولتے تو ہر شخص خاموش ہو جاتا۔

صدر ضیاء الحق اپنے معتمد اور باخبر ساتھی کے ہر مشورے پر عمل نہیں کرتے تھے۔

ان کے جو مشورے مسترد کر دیئے گئے ان میں سے ایک 1985ء کے انتخاب کے بعد وزیر اعظم کی نامزدگی سے متعلق تھا۔ جنرل اختر جو ایک عرصے سے مصطفیٰ جتوئی کو وزیر اعظم بنانے کی حمایت کر رہے تھے، ان کے کھیل میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے اب سندھ کے الٰہی بخش سومرو کا نام تجویز کر رہے تھے لیکن صدر نے ان پر محمد خان جونیجو کو ترجیح دی جو 1978ء میں جب پاکستان قومی اتحاد کی جماعتیں اقتدار میں شامل ہوئیں، صدر کی کابینہ میں رہ چکے تھے۔ وہ بظاہر ایک مودب اور تعاون کرنے والے آدمی نظر آتے تھے۔ کم گو اور غیر ذہین دکھائی دینے والے جونیجو کو شریف آدمی سمجھا جاتا تھا لیکن ان کا سب سے بڑا اعزاز شاید یہ تھا کہ وہ مسلم لیگ سے تعلق رکھتے تھے اور شاہ مرداں پیر پگاڑا کے قریبی تھے۔

اس بات کی کبھی قابل فہم وضاحت نہیں کی گئی کہ جونیجو، خود کو اقتدار سونپنے والے آدمی کے خلاف کیوں ہو گئے، جس نے بہت سے اختیارات ان کے سپرد کر دیئے تھے، جو مداخلت سے گریز کرتا تھا اور جو دوسروں کی توہین کرنے والا نہ تھا۔ بعض لوگوں کے خیال میں ان کے گردو پیش کے بعض لوگوں نے انہیں گمراہ کیا۔ جب محمد خاں جونیجو کو باور کرا دیا گیا کہ حالات ان کے لئے سازگار ہیں تو انہوں نے آگے بڑھ کر زیادہ سے زیادہ قوت حاصل کرنے کی کوشش کی کیا اس عمل میں انہیں امریکیوں کی تائید حاصل تھی؟ یا پارلیمنٹ اور کابینہ کے بعض ارکان انہیں شہ دے رہے تھے؟ ان رازوں سے خود محمد خاں جونیجو ہی پردہ اٹھا سکتے ہیں اور غالباً وہ کبھی ایسا نہیں کریں گے۔

کچھ بھی ہو اختر عبدالرحمن نے کم از کم ایک موقع پر وزیر اعظم کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ غلط راہ پر چل نکلے ہیں۔ وہ اس وقت ایک عرب ملک کے دورے پر تھے اور جونیجو جو اعلیٰ سرکاری شخصیتوں کو صدر سے برگشتہ کر کے اپنے قریب لانے کی کوشش میں لگتے رہتے تھے، جنرل اختر کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ عرب سربراہ

کے ساتھ جونیجو کی گفتگو جنرل اختر کو پسند نہیں آئی اور انہوں نے ان سے ہمیشہ کی طرح سادہ اور دوٹوک انداز میں کہہ دیا کہ وہ وزیراعظم کے مرتبے سے فروتر انداز اختیار کیے ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد جونیجو ان سے مایوس ہو گئے اور غالباً ناراض بھی کہ انہوں نے اوجڑی کیمپ کے سانحہ کے بعد انہیں الگ کرنے کا منصوبہ بنایا۔

صدر نے محمد خاں جونیجو کو غیر جماعتی انتخابات کے بعد پارٹی کے بعد پارٹی بنانے کی اجازت کیوں دی؟ اس سوال کا کبھی کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا گیا۔ یہ صدر کے اصل منصوبے کے بالکل برعکس تھا۔ پیپلز پارٹی سے الگ ہو کر 1985ء کے انتخابات میں حصہ لینے والے نسیم آہیر کے خیال میں یہ صدر کی مفاہمت پسندی اور حد سے زیادہ نرم مزاجی کی وجہ سے ہوا۔ اب جبکہ وہ انتخابات کرا چکے تھے، وہ اس نظام کو کامیاب ہوتا دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ سوال پھر بھی اپنی جگہ باقی رہتا ہے کہ جونیجو جن کی اپنی کوئی قوت نہ تھی، یکایک اتنے طباع اور دلیر کیسے ہو گئے تھے اور اپنی رائے پر اس قدر اصرار کیوں کرنے لگے تھے؟

صدر کا اصل منصوبہ کیا تھا؟ نسیم آہیر کی داستان سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ یہ داستان اس سوال کا جواب بھی فراہم کرتی ہے کہ جنرل اختر سیاسی طور پر کس طرح صدر ضیاء الحق کی مدد کر رہے تھے۔ نسیم آہیر الذوالفقار کی طرف سے 1981ء میں پی آئی اے کا طیارہ اغوا کرنے کے بعد سے، پیپلز پارٹی کی قیادت کے بارے میں مسلسل مایوسی کا شکار تھے اور اس کے طرز عمل کو حب الوطنی کے تقاضوں کے منافی سمجھنے لگے تھے۔ یہ بات خفیہ ایجنسی کے علم میں بھی تھی۔ ایم آر ڈی نے 14 اگست 1983ء سے صدر کے خلاف تحریک چلانے کا فیصلہ کیا تو آہیر اس کے حق میں نہ تھے۔ پارٹی کے ایک اجلاس میں انہوں نے دلائل دیئے اور جیسا کہ ان کا مزاج ہے، انہوں نے بہت کھل کر اپنا موقف پیش کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ تحریک

سے نفرت اور تصادم کی آگ تو بھڑک اٹھے گی لیکن حاصل کچھ بھی نہ ہوگا۔ کچھ دن بعد آئی ایس آئی کے ایک افسر جو آہیر کے ہم جماعت رہے تھے اور اب تک ان کے دوست چلے آتے تھے ان سے ملنے آئے۔ انہوں نے آہیر سے کہا کہ وہ جنرل اختر کے ساتھ ان کی ملاقات کرانا چاہتے تھے، کسی قدر تامل اور ردوکد کے بعد وہ اس پر آمادہ ہو گئے۔ ان کی آمد و رفت کا سرکاری طور پر انتظام کیا گیا اور انہیں اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں ٹھہرانے کا بندوبست کیا گیا، لیکن آہیر نے سرکاری میزبانی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ایک وبنگ آدمی کی طرح انہوں نے کہا کہ وہ تبادلہ خیال کرنے آئے ہیں اور انہیں کسی مہربانی کی ضرورت نہیں ہے۔ دو اڑھائی گھنٹے کی ملاقات میں آہیر نے صدر ضیاء الحق کی شخصیت، اندرونی پالیسیوں اور خاص طور پر ان کی افغان حکمت عملی پر بہت سخت نکتہ چینی کی۔ جنرل اختر خاموشی اور توجہ سے سنتے رہے اور جب وہ اپنی بات ختم کر چکے تو جنرل نے حکومتی پالیسیوں بالخصوص افغانستان کے بارے میں اپنے تجزیے اور معلومات سے انہیں آگاہ کیا۔ جیسا کہ بعد میں انہوں نے بتایا جنرل نے بڑی خوبصورت سے اپنا کیس پیش کیا تھا اور ان کے دل و دماغ پر اس کا گہرا اثر ہوا۔ انہوں نے پیپلز پارٹی کے رہنما سے یہ نہیں کہا کہ وہ حکومت کی مدد یا حمایت کریں، بلکہ اس کے برعکس انہوں نے صاف طور پر کہا کہ وہ ہی کریں جو اخلاقی طور پر درست سمجھتے ہیں۔ اس ملاقات میں پیپلز پارٹی کے دو اور رہنما بھی موجود تھے جو ان دنوں اعلیٰ سرکاری مناصب پر فائز ہیں، اگر ان کے نام فاش کر دیئے جائیں تو ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہو۔

ان چاروں آدمیوں کی دوسری ملاقات ٹھیک ایک سال بعد ستمبر 1984ء میں جنرل اختر کے گھر پر عمل ہوئی، جہاں انہوں نے تینوں سیاستدانوں کو کھانے پر مدعو کیا تھا۔ اس اثناء میں وہ متنازعہ صدارتی ریفرنڈم ہو چکا تھا جس کے ذریعے صدر نے مزید پانچ سال تک اقتدار میں رہنے کی راہ ہموار کر لی تھی۔ آہیر اس کھیل سے یکسر

الگ رہے۔ بلکہ صدر کچھ دن بعد سرگودھا گئے اور آہیر کو ان سے ملنے کی دعوت دی گئی تو انہوں نے اس سے انکار کر دیا تھا۔

ان کے بقول 1985ء کے انتخابات میں انہوں نے مقامی دباؤ کی وجہ سے شرکت کی۔ انہیں اندیشہ تھا کہ اگر وہ الگ تھلگ رہے تو ان کا سیاسی گروپ تحلیل ہو جائے گا۔ وہ انتخابات جیت چکے تو صدر نے ٹیلیفون پر انہیں مبارک دی اور کہا کہ وہ اپوزیشن میں رہیں یا حکومت کا ساتھ دیں لیکن ان کی کامیابی پر انہیں خوشی ہوئی ہے کیونکہ انہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ایک محب وطن آدمی ہیں۔

محمد خاں جونیجو کو وزیر اعظم نامزد کرنے کے بعد ان کے لئے حمایت حاصل کرنے کی غرض سے صدر نے ارکان اسمبلی سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا تو سرگودھا ڈویژن کے 9 دوسرے ارکان کے ساتھ نسیم آہیر بھی ایوان صدر راولپنڈی مدعو کئے گئے، جہاں گورنر جیلانی بھی موجود تھے۔ باقی لوگوں نے تو جونیجو کی حمایت میں ایک تحریر پر دستخط کر دیئے لیکن نسیم آہیر نے صاف جواب دے دیا۔ انہوں نے سپیکر کے لئے صدر کے امیدوار خواجہ صفدر کی بجائے فخر امام کی حمایت کی۔

راولپنڈی اور اسلام آباد میں جہاں آہیر قومی اسمبلی کے اجلاسوں میں شرکت کے لئے جاتے تھے، اب جنرل اختر سے ان کی مزید ملاقاتیں ہوئیں۔ اب ان کے اندر مشترک نکات ابھر رہے تھے۔ جنرل اختر انہیں قائل کرتے رہے اور ہر بار وہ کہتے اگر آپ اخلاقی طور پر قائل ہیں تو اس پالیسی کی تائید کریں آہیر کبھی ان کی بات مان لیتے کبھی خاموش رہتے اور کبھی انکار کر دیتے۔ مئی 1985ء کے وسط میں صدر نے انہیں بلایا اور بہت تفصیل کے ساتھ گفتگو کی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ملک کے لئے نئی، محب وطن قیادت ابھارنے کے آرزو مند ہیں اور غیر جماعتی انتخابات کا انعقاد اسی سمت میں ایک قدم ہے۔ جنرل ضیاء الحق نے گفتگو کے آغاز میں ان سے کہا کہ وہ ملک کے صدر، فوج کے سربراہ اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ہیں اور انہیں ایک رکن

اسمبلی کی بہت زیادہ پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن چونکہ وہ انہیں ایک مخلص اور محب وطن آدمی سمجھتے ہیں لہٰذا ان کے سامنے بعض حقائق پیش کرنے کے آرزومند ہیں۔ انہوں نے افغان پالیسی سمیت، بہت سے اہم امور کی وضاحت کی اور کہا کہ وہ ان سے مستقبل کے لئے بہت سی توقعات رکھتے ہیں۔ بے تکلفی کے ساتھ انہوں نے کہا کہ اس کے لئے ان کا (نظریاتی طور پر) راہ راست پر آنا ضروری ہے۔ آہیر نے ان کے ساتھ بحث کی اور بہت سے سوالات اٹھائے لیکن جب وہ ایوان صدر سے نکلے تو وہ انہیں اپنا لیڈر تسلیم کر چکے تھے۔

جونیجو ونگ نسیم آہیر کو مسلسل پیغامات بھیج رہے تھے۔ وہ انہیں اپنی پسند کی کوئی بھی وزارت دینے کو تیار تھے۔ وہ جونیجو سے ملنے نہیں گئے، انہوں نے مسلم لیگ کا حصہ بننے سے انکار کر دیا اور پارٹی کے کنونشن میں شرکت سے گریز کیا۔ مارشل لاء اٹھنے کے تین ہفتے بعد 21 جنوری 1986ء کی رات کو وزیراعظم نے انہیں (موجودہ وزیر خزانہ) سینیٹر احسان الحق پراچہ کے ہاتھ واضح طور پر پیغام بھیجا کہ وہ انہیں اپنی کابینہ میں شامل کرنے کے خواہش مند ہیں۔ اسی روز صدر کے ملٹری سیکرٹری انہیں اگلے روز ساڑھے دس بجے ملاقات کے لئے کہہ چکے تھے۔ آہیر وزیراعظم کی بجائے، جو با اختیار تھے اور مناصب بانٹ رہے تھے، پہلے صدر سے ملنے گئے، انہوں نے صدر سے گلہ کیا کہ وہ نئی سیاسی قیادت ابھارنے اور 1990ء میں نئے انتخابات کرنے کے منصوبے سے گریز کی راہ پر چل نکلے ہیں اور یہ کہ اب سب کچھ ان کی طے کردہ پالیسی کے خلاف ہو رہا ہے۔ صدر نے کہا ان کی خواہش تو یہی ہے کہ جونیجو پارٹی نہ بنائیں، اگلے چار سال نئی قیادت کو شناخت کر کے اس کی تربیت کی جائے 1990ء میں جماعتی انتخابات ہوں اور اقتدار نئے لیڈروں کے سپرد کر دیا جائے۔ صدر نے کہا مشکل یہ ہے کہ وزیراعظم جماعت بنانے پر بضد ہیں اب اگر میں رکاوٹ ڈالتا ہوں یا ان کو ہٹا دیتا ہوں تو لوگ یہ تاثر لیں گے کہ ہم کسی کو کام

کرنے دینا نہیں چاہتے۔ اب یہی ایک راستہ باقی ہے کہ وزیر اعظم کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں۔ ان کے گرد ایسے لوگ ہوں جو ان کی مدد کریں اور انہیں غلط لوگوں سے بچایا جائے۔ انہوں نے دو وزراء کے نام لئے جن میں سے ایک نے بعد ازاں صدر اور وزیر اعظم کے مراسم بگاڑنے اور فوج کے ساتھ جونیجو کے تصادم کو یقینی بنانے کے لئے کام کیا۔ نسیم آہیر نے صدر کو بتایا کہ جونیجو انہیں وفاقی وزیر اور پارٹی کا سیکرٹری جنرل بنانا چاہتے ہیں۔ صدر نے کہا وزیر اعظم آپ کو کابینہ میں ضرور شامل کرلیں گے، لیکن میں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ آپ کو پارٹی کا سیکرٹری جنرل ہرگز نہیں بنائیں گے۔ صدر کے مشورے پر آہیر اگلے روز وزیر اعظم سے ملے۔ صدر کا اندازہ درست تھا، آہیر کو وزارت تعلیم کی پیشکش کی گئی لیکن اپنے پیغام کو برعکس وزیر اعظم نے پارٹی کے عہدے کا ذکر تک نہ کیا۔ 22 جنوری کو انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان کردیا اور 26 جنوری کو انہوں نے مارشل لاء کے بعد بننے والی نئی کابینہ کے دوسرے ارکان کے ساتھ حلف اٹھالیا۔ نسیم آہیر جونیجو کے وزیر تو بن گئے۔ لیکن جونیجو ان کے لیڈر نہ بن سکے۔ پیپلز پارٹی کی غیر ذمہ دارانہ پالیسیوں سے بیزار ہو کر بغاوت کرنے والے آدمی کا لیڈر ضیاء الحق تھا یا اختر عبدالرحمن۔

اختر عبدالرحمن میں وہ کونسی چیز تھی جس نے ان کا دل موہ لیا تھا اور وہ بار بار ان سے رجوع کرتے تھے؟ نسیم آہیر اس سوال کا جواب دیتے ہوئے قدرے جذباتی ہو جاتے ہیں۔ ان کے بقول اس آدمی کا پیکر ایک خواب سے روشن تھا۔ اس کے سامنے مستقبل کا ایک نقشہ تھا، جس کے لئے وہ اپنا سب کچھ قربان کرسکتا تھا۔ افغانستان کی آزادی اس عظیم خواب کا ایک چھوٹا سا حصہ تھا، جو اس نے دیکھا اور اس کی جان میں ایک چراغ کی طرح جلتا رہا۔ اسلام کی محبت سے اس کا دل روشن تھا لیکن وہ انقلابی نہیں ارتقائی راستے کا مسافر تھا اور اسے یقین تھا کہ یہی راستہ بہترین ہے وہ اس مکتب فکر کا نمائندہ تھا۔ جس نے سرسید سے آغاز کیا اور جس نے قائد اعظم

ایسا لیڈر جنا۔ وہ اس خطہ ارض میں ایک نئی سیاسی قیادت اور ایک عظیم عسکری قوت پیدا کرنے کا آرزو مند تھا، ایک مضبوط اور مستحکم پاکستان جو ایک اسلامی بلاک کا مرکز محور بن سکے۔

صرف افغان پالیسی پر روس کی حمایت کرنے اور غیر ملکیوں سے تعلقات رکھنے والے سیاستدان ہی آئی ایس آئی کا ہدف نہیں تھے۔ کچھ اور لوگ بھی اس کا شکار ہوئے اور ان میں نامور جرنیل بھی شامل تھے، جن کی خواہشات پوری نہ ہوسکیں اور جن کا محاسبہ کیا گیا اور جو ترقیوں سے محروم رہے۔

ایک ممتاز ریٹائرڈ جنرل جو بظاہر اچھی شہرت کے مالک تھے، بعض ناگوار مشاغل رکھتے تھے، اگرچہ بظاہر کوئی شخص یہ گمان نہ کرسکتا تھا۔ صدر کے دل میں ان کے لئے بڑا احترام تھا وہ پنجاب کی گورنری کے خواہش مند تھے اور صدر انہیں یہ منصب سونپنے پر آمادہ تھے لیکن جب جنرل اختر سے مشورہ مانگا گیا تو انہوں نے اس کی مخالفت کی۔ صدر کی خواہش پر انہیں حقائق سے آگاہ کردیا گیا۔

1984ء میں جب بلوچستان کے گورنر جنرل رحیم الدین خان کو ترقی دے کر چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی بنایا گیا تو سندھ کے گورنر جنرل عباسی بھی ریٹائر کردیئے گئے۔ اب نئے گورنر کے انتخاب کا مرحلہ درپیش تھا۔ صدر ایک ریٹائرڈ جنرل کو گورنر مقرر کرنے کا فیصلہ کرچکے تھے جو ان کی کابینہ میں شامل رہے تھے لیکن جنرل اختر نے انہیں آگاہ کیا کہ وہ بدعنوانی کے مرتکب ہوتے رہے ہیں۔ ان کے پاس تفصیلات موجود تھیں اور ثبوت بھی صدر کی خواہش پر انہوں نے راولپنڈی کے کور کمانڈر جنرل جہانداد کا نام تجویز کیا جو ایک سیدھے سادے سپاہی تھے، لیکن ایک اچھے منتظم بھی۔

مارچ 1987ء میں جنرل اختر عبدالرحمن کو فور سٹار جنرل بنانے کے بعد آئی ایس آئی سے الگ کر کے جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کا چیئرمین بنا دیا

گیا۔ 1982ء میں جنرل غلام جیلانی خاں کو دل کا دورہ پڑنے پر انہیں پنجاب کی گورنری کی پیشکش کی گئی تو انہوں نے یہ کہتے ہوئے صدر سے معذرت کرلی تھی کہ وہ افغانستان کی جنگ کو درمیان میں چھوڑنا نہیں چاہتے 1984ء میں بلوچستان کے گورنر جنرل سردار ایف ایس لودھی کے طیارے کو حادثہ پیش آیا تو صدر نے انہیں اس صوبے کی گورنری کی پیشکش کی۔ جنرل اختر نے ابھی وضاحت سے اپنا ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا کہ صدر خود ہی تامل کا شکار ہوگئے اور بلند آواز سے سوچنے کے انداز میں کہا ہاں ٹھیک ہے آپ افغانستان کو نہیں چھوڑ سکتے۔

جنرل اختر چار ستاروں والے جرنیل کا مرتبہ پانے پر تو خوش تھے، لیکن وہ افغانستان کو اب بھی چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ صدر نے 1984ء میں ان سے کہا تھا کہ وہ ان کے مرتبے میں اضافے کے باوجود ان کی ذمہ داریاں برقرار رہیں گے۔

اب روسی افغانستان سے واپسی پر آمادہ دکھائی دیتے تھے اور مسلسل اس طرح کے اشارے دے رہے تھے۔ شاید صدر یہ محسوس کرتے تھے کہ اب آئی ایس آئی کو جس نے 9 سال تک روسی اور بھارتی سازشوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا تھا، نئے ہاتھوں میں منتقل کرنے کا وقت آپہنچا ہے۔ ادارے نشوونما پاتے اور پروان چڑھتے ہیں تو انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ہوتا ہے، کسی آدمی کو ان کے لئے ناگزیر نہیں بنایا جا سکتا۔ پھر بھی اپنی تخلیق سے جدا ہونے کا وقت آیا تو جنرل کو اپنا دل سینے میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا، اسے کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ اس کا جانشین کون ہوگا، عمر بھر اس نے اپنے آپ پر قابو رکھا تھا۔ وہ ڈسپلن کی پابندی کرنے والا آدمی تھا اور وفاداری اس کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ضیاء الحق اس کا لیڈر اور سردار تھا جو ہنگاموں، مشکلات اور طوفانوں میں اس کی پشت پر پہاڑ کی طرح کھڑا رہا تھا۔ آزردگی اور دل گرفتگی کے ساتھ اس نے کہا ضرور اس میں کوئی مصلحت ہوگی۔ شاید بری فوج کو میری ضرورت ہو، شاید کچھ اور سبب ہو لیکن کیا آئی ایس آئی مستقبل میں

ایسا ہی ایک ادارہ رہے گی، کیا وہ افغانستان کی آزادی کے آخری مرحلے میں اپنا کردار اسی کمال سے ادا کر سکے گی؟ اس سوال کا جواب تو مستقبل کو دینا تھا۔ ملال کے ساتھ اس نے صرف یہ کہا ایک سال تو کام چلتا رہے گا، اس کے بعد اللہ جانے۔

ٹھیک ایک سال کے بعد اوجڑی کیمپ کا سانحہ پیش آیا، جب جڑواں شہروں اور جنرل کے دل پر قیامت گزر گئی اور اس کے ایک دوست نے اسے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا، لیکن وہ کیا کر سکتا تھا، چیخ و پکار سے بھری آبادیوں پر لوہا برس رہا تھا، آئی ایس آئی کے سابق سربراہ جنرل ریاض کے سمدھی خاقان عباسی سمیت ایک سو سے زیادہ انسان دیکھتے ہی دیکھتے موت کی آغوش میں جا سوئے۔ سینکڑوں گھر برباد اور ہزاروں لوگ زخمی ہوئے۔ یہ اس کی ذمہ داری نہیں تھی، لیکن صدر اور وزیر اعظم ملک سے باہر تھے۔ آہنی عزم کے ساتھ وہ آگے بڑھا اور اس نے معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ بحران کا آدمی تھا، قیامت کی گھڑی میں وہ قوم کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ وہ اس وقت حیرت زدہ رہ گیا جب بعض لوگ اسی کو مورد الزام قرار دینے لگے، جبکہ آئی ایس آئی اور اوجڑی کیمپ سے اس کا تعلق منقطع ہوئے ایک سال گزر چکا تھا۔ یہ کیسے لوگ تھے اور کیا چاہتے تھے؟

نواں باب

افغانستان، افغانستان

جون 1979ء میں ٹھیک ان دنوں جب جنرل اختر عبدالرحمن کو آئی ایس آئی کا سربراہ مقرر کیا گیا، صدر ضیاءالحق نے امریکہ کے صدر جمی کارٹر کو 12 صفحے کا ایک خط لکھا، جس میں افغانستان کی صورتحال اور تیزی سے پھیلتی ہوئی عوامی بغاوت پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کے بعد یہ پیش گوئی کی گئی تھی کہ سوویت یونین اپنی کٹھ پتلی حکومت کو بچانے کے لئے افغانستان میں مسلح مداخلت کرسکتا ہے۔ صدر جمی کارٹر نے اس خط کا سرے سے کوئی جواب نہ دیا۔ امریکی صدر ضیاءالحق سے ناراض تھے اور اس کی تصدیق اس وقت ہوگئی جب آئی ایس آئی نے اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے کے نام بھیجے جانے والے ایک پیغام کا سراغ لگایا، جس میں صدر کی مخالف طاقتوں کی مدد کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ اس شخص کو جس نے اپنی انتخابی مہم کی بنیاد دنیا میں بنیادی حقوق کی حفاظت کے نعرے پر اٹھائی تھی، افغانستان میں انسانوں کے قتل عام پر تو کوئی تشویش نہیں تھی لیکن پاکستان میں سیاسی پابندیوں پر وہ بہت پریشان تھا۔ اس کی انتظامیہ اور لمبے بازوؤں والی سی آئی اے کو کچھ معلوم نہ تھا کہ افغانستان میں کیا ہونے والا ہے۔ جہاں نیم پاگل حفیظ اللہ امین کی سپاہ انسانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہی تھی اور ان گنت لوگوں کو عقوبت خانوں میں بند کردیا گیا تھا۔

27 دسمبر 1979ء کو روسی افغانستان میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے حفیظ اللہ امین کو قتل کرڈالا جو ان کے خیال میں حکمران کمیونسٹ پارٹی کو تباہ کررہا تھا اور بغاوت کو کچلنے کا اہل نہ تھا۔ ان کے دیوہیکل ٹرانسپورٹ طیارے اسلحہ لے کر کابل کے ہوائی اڈے پر اترنے لگے، شہر پر بمبار جہاز پرواز کرنے لگے اور شاہراہ سالانگ کے

راستے سرخ فوج کے دستے کابل کی طرف بڑھنے لگے۔ ببرک کارمل نے جو شاہی محلات میں پروان چڑھا تھا، روس کے پنج شنبہ ریڈیو سٹیشن سے پہلی بار اپنی قوم سے خطاب کیا۔ اسے غیر ملکیوں نے اپنی قوم کا آقا بنا دیا تھا۔ اب ایک نیا اور زیادہ بھیانک خطرہ پاکستان کی سرحدوں پر دستک دے رہا تھا۔

بنگلہ دیش کے صدر، ضیاء الرحمن کے ساتھ مشورے کے بعد، صدر ضیاء الحق نے دفتر خارجہ کو اسلام آباد میں اسلامی سربراہی کانفرنس کے وزرائے خارجہ کا اجلاس بلانے کو کہا۔ کانفرنس کی تیاریوں کے دوران دارالحکومت میں بلائے گئے اخبار نویسوں میں سے ایک نے جو صدر سے کسی قدر بے تکلفی رکھتا تھا، سوال کیا کہ دنیا پاکستان کی مدد کو آئے گی۔ اس یقین کے ساتھ جو کبھی اس آدمی سے جدا نہیں ہوا تھا اور جس نے بدترین حالات میں اسے سنبھالے رکھا، انہوں نے کہا دنیا کمزور اور تنہا لوگوں کی مدد نہیں کرتی لیکن ہمیں حالات کا مقابلہ کرنا ہے اور جب ہم کچھ کر دکھائیں گے تو دنیا والے بھی آ پہنچیں گے۔

پاکستان کے لئے سرخ خطرے کی حقیقی نوعیت کیا تھی اور افغانستان کے شہروں، پہاڑوں اور وادیوں میں داخل ہو جانے والی 80 ہزار روسی فوج کا سامنے کیسے کیا جا سکتا تھا؟ صدر نے اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی ذمہ داری بری فوج کے کسی جرنیل کو نہیں سونپی۔ ان میں سے بعض لائق کمانڈر ہو سکتے تھے۔ لیکن آندھیوں اور طوفانوں میں ہر شخص کھڑا نہیں رہ سکتا اور خوف زدہ کر دینے والی تاریکی میں ہر ایک کو راستہ سجھائی نہیں دیتا۔

''کسی طرح پاکستان کے لئے دو سال حاصل کر لو'' صدر ضیاء الحق نے جنرل اختر سے اس طرح کہا جیسے ایک بیمار بچے کا باپ ڈاکٹر سے کہے، وہ سمجھتے تھے کہ وہ اس اثنا میں دنیا سے مدد حاصل کرنے میں جلد کامیاب ہو جائیں گے۔ انہوں نے آئی ایس آئی کے سربراہ کو افغانستان کی صورتحال پر جلد از جلد رپورٹ پیش کرنے کو کہا۔

جنرل اختر چھ ماہ سے افغانستان کا جائزہ ہی تو لے رہے تھے، جہاں سے مہاجروں کا سیلاب امڈا چلا آتا تھا اور جہاں وہ کچھ عرصے سے محدود سی مدد پہنچا رہے تھے۔

جنرل اختر نے اپنی رپورٹ صدر کو پیش کی تو وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ یہ روسیوں کو افغانستان میں الجھائے رکھنے کا نہیں، آمو دریا کے اس پار دھکیلنے کا منصوبہ تھا۔ یہ ایک مکمل دستاویز تھی۔ افغانستان کے جغرافیائی حقائق، پہاڑ، شہر، وادیاں اور راستے اور سب سے بڑھ کر آزادی کے لئے زندگیاں نچھاور کرنے پر آمادہ افغان، دنیا میں ان جیسی کوئی دوسری قوم نہ تھی۔ سخت جان اور جنگجو، انتقام پسند، غیر ملکیوں سے دور رہنے اور انہیں شک کی نظر سے دیکھنے والی، انفرادیت پسند حریت کش اور موت ان کے لئے لمحہ گزراں تھی، جس سے وہ کبھی خوفزدہ نہیں ہوسکتے کہ جانکنی کی ایک ساعت کے بعد بہشت بریں کی وادیاں اور جنت گم گشتہ کے جاں افروز نظارے تھے۔

دو آدمی تاریخ کے ایک نئے دور کی دہلیز پر کھڑے تھے اور ان سے اتفاق کرنے والا کوئی نہ تھا۔ سیاسی عناصر کی حمایت کا تو سوال ہی نہ تھا لیکن فوج کے مفکرین اور جرنیل بھی اپنے لیڈر سے متفق نہ تھے، لیکن اب جبکہ صدر جانتے تھے کہ یہ ایک روایتی جنگ نہیں ہوگی اور افغان گوریلا لڑائی کے اہل ہیں تو انہوں نے یہ کھیل کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ انہیں معلوم تھا کہ اس کے نتیجے میں

ملک کے اندر ان کی پوزیشن بالآخر مضبوط ہوگی، سیاسی رہنما نہ ہی لیکن اپنے خدا پر یقین اور جہاد پر ایمان رکھنے والے عوام ان کا ساتھ دیں گے۔

اسلامی دنیا کے بعض ممالک کی ہمدردیاں بھی بالآخر انہیں حاصل ہو کر رہیں گی

کمیونزم کی پیش قدمی سے خوفزدہ، جمہوری اور آزاد دنیا ان کا ساتھ دے گی۔

منصوبہ ساز جنرل اختر کو اس کا کوئی گمان نہ تھا کہ یہ ذمہ داری، اتنی بڑی ذمہ داری ان کو سونپ دی جائے گی لیکن صدر نے ان سے کہا کہ وہ خود ہی اپنے منصوبے پر عمل درآمد کا آغاز کریں کہ وہی اس کے خالق اور اس پر سب سے زیادہ یقین رکھنے

والے آدمی ہیں۔ صدر نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ اس منصوبے پر کس طرح کام کا آغاز کریں۔ وسائل کہاں سے آئیں گے۔ اسلحہ کہاں سے ملے گا اور کس کے سپرد کیا جائے گا؟ جنرل اختر کے ایک نائب کے مطابق سب کچھ صفر سے شروع کرنا تھا۔ جنرل اپنے دفتر پہنچے اور انہوں نے افغانستان کا نقشہ طلب کیا تو معلوم ہوا کہ ایسا کوئی نقشہ ان کے دفتر میں موجود نہیں۔ جرنیل کے ہاتھ خالی تھے لیکن دل امید سے آباد تھا۔ اس کا سب تجربہ، سارا وقار، سب کچھ داؤ پر تھا، وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔

انہوں نے صدر سے رابطہ کیا اور کہا کہ فوج کے اسلحہ ڈپوؤں میں جو متروک 303 رائفلیں پڑی ہیں وہ انہیں دے دی جائیں۔ یہ رائفلیں افغان حریت پسندوں کو دے دی گئیں۔ نہایت سختی کے ساتھ انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسروں کو حکم دیا گیا کہ اس عمل میں انتہا درجے کی رازداری برتی جائے تاکہ روسیوں پر یہ کھیل منکشف نہ ہو سکے۔ آئی ایس آئی کے افسروں کو اس رازداری کے لئے قلیوں کا کام بھی کرنا پڑا اور بعض اوقات وہ ضروری ساز و سامان خود اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے جاتے۔ جن افغان رہنماؤں سے رابطہ کیا گیا ان سے بھی کہہ دیا گیا کہ وہ کسی دوسرے کو کچھ نہیں بتائیں گے انہیں خوب سمجھا دیا گیا کہ اس معاملے میں پردہ پوشی کی اہمیت کیا ہے، چنانچہ ایک طویل عرصے تک مختلف گروپ ایک دوسرے کی کارروائیوں سے ناآشنا رہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے افغانستان کے طول و عرض میں ایک قومی بغاوت پھوٹ پڑی لیکن روسیوں کا ردعمل بھی جو چند ہفتوں میں بغاوت کچلنے کا منصوبہ لے کر آئے تھے، اتنا ہی سخت تھا۔ انہوں نے راستوں پر پہرے بٹھا دیئے اور آبادیوں کو ادھیڑنے پر تل گئے۔ قتل و غارت کے اس سیلاب کا مقابلہ کرنے کے لئے اسلحہ کی ضرورت تھی اور یہ کہاں سے آتا؟

امداد کی پہلی کھیپ چین سے آئی۔ یہ وہ اسلحہ تھا جو مدتوں پہلے انہوں نے روسیوں سے خریدا تھا یا چین کی ان اسلحہ ساز فیکٹریوں میں ڈھالا گیا جو چین سوویت دوستی

کے دور میں روسیوں کی مدد سے بنائی گئی تھیں اور جن کی مصنوعات الگ سے شناخت نہیں کی جاسکتی تھیں۔ کچھ اسلحہ مصریوں سے ملا جو جمال عبدالناصر نے اپنے اشتراکی سرپرست سے حاصل کیا تھا اور اب اسی کے خلاف برتا جانے والا تھا۔

رفتہ رفتہ امریکیوں کو جن کے اخبارات آزادی کی جنگ لڑنے والوں کو باغی (Rebel) کہتے تھے اور جن کا خیال تھا کہ مزاحمت جلد دم توڑ دے گی، اندازہ ہونے لگا تھا کہ روسی ایک دلدل میں آ پھنسے ہیں اور انہیں اس میں مزید الجھایا جاسکتا ہے۔ ویت نام کے زخم کچھ زیادہ پرانے نہیں تھے اور ابھی تک ان سے لہو رس رہا تھا۔ دنیا میں کمیونزم کے پے در پے کامیابیوں نے امریکیوں کو آزردہ کر رکھا تھا۔ ادھر ایران سے پسپائی ایک تازہ زخم تھا۔ امریکی اخبارات، رائے عامہ اور پھر نئے انتخابات کی تیاریوں کے غلغلے میں، کارٹر کی ناکامیوں کا چرچا کرنے والے صدارتی امیدوار رونالڈ ریگن نے دباؤ بڑھانا شروع کیا اب ان کے لئے شیطانی سلطنت (Evil Empire) سے قرض چکانے کا وقت آ پہنچا تھا۔

امریکی سینیٹرز، ارکان کانگرس اور سی آئی اے کے افسر اسلام آباد پہنچنے لگے۔ صدر ان سے ملے لیکن تفصیلات جاننے کے لئے ان میں سے ہر ایک کو جنرل اختر سے ملاقات کا مشورہ دیا گیا۔ انہیں یقین تھا کہ وہی شخص انہیں بہتر طور پر قائل کرسکتا ہے، جس نے خود انہیں قائل کرلیا تھا۔ جنرل اختر اپنے مہمانوں کے ساتھ سادہ اور بے ساختہ انداز میں بات کرتے تھے۔ افغانستان کی جغرافیائی، سیاسی اور فوجی حقائق اب انہیں ازبر ہوگئے تھے۔ افغانستان کی ماضی قریب کی تاریخ پر ان کی نظر تھی اور اب تو اس لئے بھی وہ یقین کے ساتھ بات کرسکتے تھے کہ حریت پسندوں نے توقع سے کہیں بڑھ کر کامیابیاں حاصل کی تھیں، ایسے سرفروش اور اتنے سخت جان لوگ، دنیا میں کہیں اور نہیں پائے جاتے، وہ مغرب سے آنے والوں کو بتاتے اور مبالغہ کئے بغیر ان سے صاف صاف انداز میں بات کرتے۔ قدرت نے انہیں غیر معمولی طور

پر واضح ذہن عطا کیا تھا۔ وہ کسی سے مرعوب ہونے والے نہ تھے اور کسی جھجک کے بغیر بات کرتے تھے۔ انہیں تصنع سے نفرت تھی۔ وہ اعداد و شمار کا جال نہیں پھیلاتے تھے اور نہ ہی غیر متعلق گفتگو کرتے تھے۔ کم سے کم لفظوں میں وہ مدعا بیان کرتے، عاجزہ نہ رعونت، خوشامد نہ بے دلی، غیر ضروری جوش و خروش نہ غیر معمولی توقعات، ان کا مخاطب ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔

امریکی اب مدد کرنے پر آمادہ تھے لیکن ان کی اپنی شرائط تھیں۔ وہ پاکستان کے حکومتی نظام سے نامطمئن تھے، اسلحہ براہ راست افغان کمانڈروں کو دینا چاہتے تھے اور ان کا مطالبہ تھا کہ پاکستان اپنے ایٹمی پروگرام سے دستبردار ہو جائے۔ صدر کا جواب یہ تھا کہ پاکستان ایٹم بم نہیں بنا رہا اور جب تک بھارت اپنی ایٹمی تنصیبات عالمی معائنے کے لئے نہیں کھول دیتا، پاکستان ایسا نہیں کرسکتا۔ جہاں تک پاکستان کے سیاسی نظام کا تعلق ہے، یہ اس کا اندرونی معاملہ ہے اور امریکیوں کو اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ کیا امریکی امداد براہ راست افغان کمانڈروں تک پہنچائی جاسکتی ہے تو یہ پاکستان کی آزادی اور خودمختاری کو مجروح کرنے کے مترادف تھا، لیکن امریکیوں کو کیسے مطمئن کیا جائے؟

شروع میں کچھ عرصہ امریکیوں نے براہ راست کمانڈروں کو مدد پہنچائی لیکن پھر جنرل اختر عبدالرحمن نے اسلحہ کی تقسیم کا ایک فارمولا وضع کیا جس کے تحت پاکستان نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بنیادی اصول یہ تھا کہ حریت پسندوں کے کسی بھی گروپ کو اتنی ہی رائفلیں، راکٹ اور گولے ملیں گے جتنی کہ وہ کارکردگی دکھائے گا۔ پورے انصاف کے ساتھ، کسی رعایت کے بغیر۔

جنرل ضیاء الحق نے ہمیشہ سخت سودے بازی کرنے والے امریکیوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ ان کی شرائط ماننے پر آمادہ نہیں۔ پورے دو سال رد و قدح میں گزر گئے بالآخر 1982ء کے آغاز میں امریکی سپر انداز ہو گئے اور اس لئے ہو گئے

کہ یہ ان کے اپنے مفاد اور اپنی ضرورت میں تھا۔ سات سال بعد فروری 1988ء میں راولپنڈی کے ایوان صدر میں، جب امریکی ارکان کانگرس اور سینیٹرز کا ایک گروپ صدر کو جنیوا معاہدے کی حمایت میں ہموار کرنے کے لئے ملا اور انہیں افغانستان کے لئے امریکی امداد کا حوالہ دیا تو صدر نے انہیں یاد دلایا کہ پاکستان نے کس مشکل وقت سے گزر کر یہ سب کچھ حاصل کیا تھا اور اس عرصے میں امریکیوں کا طرز عمل کیا تھا، ہمارے لوگوں نے اپنی جنگ، ڈنڈوں اور پتھروں سے شروع کی تھی صدر نے ان سے کہا۔

اس وقت ببرک کارمل سے براہ راست مذاکرات کی حامی پیپلز پارٹی اور بائیں بازو کے شور مچانے اور تکرار کرتے رہنے والے دانشور ضیاء الحق کو امریکی ایجنٹ قرار دے رہے تھے لیکن مجاہدین، امریکہ اور پاکستان کی مشترکہ مہم میں بہتر شرائط کون منوا رہا تھا۔ کس کا ہاتھ اوپر تھا؟ کون قیادت کے اوصاف سے بہرور تھا؟ اگر نپولین ٹیپو سلطان کی مدد کے لئے برصغیر پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا تو شرائط کیا ہوتیں؟ کیا پاکستان اور افغان مجاہدین نے اس سے کم تر شرائط قبول کیں؟ کیا انہوں نے اپنی خودداری کا سودا کیا؟ جب وقت آیا تو کیا ضیاء الحق نے ان کی بات ماننے سے انکار نہیں کر دیا اور کیا مجاہدین نے اسلحہ کی بھیک ٹھکرا کر اپنا راستہ الگ نہیں کر لیا؟

ضیاء الحق کے سیاسی مخالفین ہی نہیں، آغا شاہی سمیت پاکستان کا دفتر خارجہ بھی روس سے نبرد آزما ہونے کے حق میں نہیں تھا۔ خارجہ دفتر والوں کا کہنا یہ تھا کہ پاکستان فلسطینیوں کی حمایت کرنے والے عرب ممالک کے سے انجام سے دوچار ہو سکتا ہے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ مہاجرت کے اس سیلاب سے جس کا پاکستان کو سامنا ہے، طوائفوں، بھکاریوں اور مجرموں کے گروہ پیدا ہوں گے۔ وہ افغانیوں کو نہیں جانتے تھے اور ان کے مزاج سے یکسر ناآشنا تھے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ افغانی تو اپنے یتیم ہو جانے والے بچوں کو بھی کسی دوسرے کو سونپنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ دفتر خارجہ

کے افسر کہتے تھے کہ روسی جب کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں تو پھر وہاں سے کوئی ان کو نکال نہیں سکتا۔ جنرل اختر کا جواب یہ تھا کہ افغانیوں کی تاریخ بھی یہی ہے کہ ان کے ملک میں آج تک کوئی ٹھہر نہیں سکا۔ دفتر خارجہ والے ہی کیا، بری فوج کے جرنیل بھی اس تصور کا مضحکہ اڑاتے تھے کہ روسیوں کو افغانستان سے فوجی دباؤ کے ذریعے پسپا کیا جا سکتا ہے اور ان میں صدر کے وہ معتمد فوجی جرنیل شامل تھے، جو بعد ازاں افغان حریت پسندوں کی حمایت میں پر جوش تقریریں کرتے پائے گئے۔ ان میں سے ایک جرنیل نے روسیوں کی حمایت میں سرگرم خان عبدالولی خاں سے کہا کہ ضیاء الحق حماقت میں مبتلا ہیں اور روسی چاہیں تو ٹینکوں میں نہیں مرسڈیز کاروں میں سوار ہو کر تین دن میں کراچی کے ساحل تک جا سکتے ہیں۔ جنرل اختر افغان حریت پسندوں کی کامیابیوں کے اعداد و شمار پیش کرتے اور جب وہ یہ بتاتے کہ اتنے ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں تباہ کر دی گئیں اتنے روسی فوجی مار ڈالے گئے اور اتنے جہاز گرائے تو ان کا مضحکہ اڑایا جاتا۔ پاکستان کے بہت سے ممتاز اخبار نویس اور رہنما اول اول یہ ماننے ہی سے انکار کرتے کہ افغانستان میں کوئی جنگ ہو رہی ہے۔ کامیابیوں کے دعوؤں کو تو وہ سراسر فریب کاری قرار دیتے۔ بعض جرنیلوں تک کا عالم یہ تھا کہ وہ اسے آئی ایس آئی کے افسروں کی جعل سازی بتلاتے اور جنرل اختر پر آوازے کستے کہ انہوں نے کریڈٹ حاصل کرنے کے لئے ایک ڈھونگ رچا رکھا ہے یہ صرف امریکی تھے جو جانتے تھے کہ آئی ایس آئی کی فراہم کردہ سب رپورٹیں سچی ہیں۔ ان کے سیارے (سیٹلائٹ) افغانستان کے چپے چپے کی تصاویر بنا رہے تھے۔ ان کے پاس تباہ ہونے والے ایک ایک ٹینک، ٹرک اور جیپ کی تصویر موجود تھی۔

صوبہ سرحد میں آبادی کا تناسب بدل رہا تھا۔ مثلاً وادی کرم میں جہاں ایک مذہبی گروہ کا غلبہ تھا، اس تناسب کی تبدیلی سے بعض رہنما خاص طور سے پریشان تھے۔

وہ بھارت اور روس کے ہمنوا سیاسی رہنماؤں سے مل کر شور و غوغا کر رہے تھے۔ آئی ایس آئی کی خفیہ رپورٹوں کی وجہ سے جن جرنیلوں کی ترقیاں رک جاتیں، وہ ان لیڈروں کی طرح شور و غل تو نہیں مچا سکتے تھے لیکن در پردہ مخالفت میں وہ بھی کوئی کسر نہ چھوڑتے۔ جنرل اختر کے مخالفین کی تعداد مسلسل بڑھتی جا رہی تھی۔

دفتر خارجہ مسلسل زور دے رہا تھا کہ روس اور کابل میں اس کی کٹھ پتلی حکومت سے براہ راست بات چیت کر کے مسئلہ حل کر لیا جائے۔ بعض اوقات وہ زور دے کر کہتے کہ اگر موقع ہاتھ سے نکل گیا تو پاکستان کو پچھتانا پڑے گا۔ جنرل اختر اور ان کے ساتھیوں کی رائے یہ تھی کہ روس اب کبھی پاکستان کو معاف نہیں کرے گا اور یہ کہ آزاد افغانستان ہی پاکستان کے تحفظ کا بہترین راستہ ہے، جہاں پاکستان کی دوست حکومت موجود ہو۔ فلپائن سے لے کر مغربی جرمنی اور فرانس سے لے کر امریکہ اور برطانیہ تک، ساری دنیا کے آزاد اخبارات مجاہدین کی شاندار مزاحمت کے تذکروں سے بھرتے ہوتے، لیکن پاکستانی اخبارات اور رہنما جن کا سب سے بڑا مسئلہ صدر ضیاء الحق تھے، ملک میں ہر خرابی کے لئے افغان مجاہدین کو ذمہ دار قرار دیتے۔ ملک میں جہاں کہیں کوئی خرابی واقع ہوتی، کوئی حادثہ ہوتا اسے افغان مجاہدین پر چسپاں کر دیا جاتا۔ 1981ء میں ہتھوڑا گروپ کی وارداتیں ہوئیں اور آئی ایس آئی نے جلد ہی معلوم کر لیا کہ اس کے پیچھے ایک افریقی ملک کا ہاتھ ہے۔ اس کے ایک سفارت کار کا ثبوت سمیت پکڑ لیا گیا۔ حکومت نے محسوس کیا کہ اس کا چرچا کرنا ملک کے مفاد میں نہیں، لہٰذا اسے جانے دیا گیا۔ ادھر بے شمار سیاسی رہنما، کارکن اور اخبار نویس اس کے لئے افغانیوں کو ذمہ دار ٹھہرا رہے تھے، جس سرزمین نے جنگ زدہ ملک سے آنے والوں کو پناہ دی تھی، وہ اسے عدم استحکام کا شکار کرنے کی سازش کیوں کرتے؟ لیکن سیاسی بزرجمہر معقولیت کی بات سے زیادہ کے جی بی اور خاد کے افواہ سازوں پر یقین کرنے کے لئے تیار تھے۔ بائیں بازو کے دانشوروں کا روگ

اس سے سوا تھا۔ ان کا نظریاتی سرپرست ایک کمزور اور غریب ملک کی بے بس آبادی پر چڑھ دوڑا تھا اب ساری دنیا اس پر نفرین بھیج رہی تھی۔ سوشلزم ایک نظریے کے طور پر رسوا ہو رہا تھا اور اب سفاکانہ توسیع پسندی اس کی شناخت بن گئی تھی۔ وہ اس کا انتقام اپنے ہی وطن سے لینا چاہتے تھے۔ وہ ہیروئن کی وبا کے لئے بھی مجاہدین کو ذمہ دار قرار دیتے تھے، حالانکہ 1987ء تک ہیروئن کی ایک فیکٹری بھی افغانستان میں نہیں تھی۔ ہیروئن سازی کا عمل پاکستان کے قبائلی علاقے میں ہو رہا تھا اور اس کا اہتمام کرنے والے مغربی ممالک کے وہ سمگلر تھے جو اس ہنر سے آشنا تھے اور جن کے پاس ہیروئن بنانے اور اسے سمگل کرنے کے وسائل اور قرینے موجود تھے۔

عام تاثر یہ تھا کہ ساری کی ساری مدد امریکہ سے آ رہی ہے، جہاں سے اسلحہ کے بھرے ہوئے جہاز پاکستان پہنچتے ہیں۔ اس کے بالکل برعکس جتنی امداد امریکہ دے رہا تھا، کم وبیش اتنی ہی سعودی عرب سے آ رہی تھی، جہاں سے سینکڑوں لوگ ذاتی طور پر جہاد میں حصہ لینے کے لئے پاکستان اور پھر افغانستان پہنچتے تھے۔ اگر سعودی عرب سمیت کویت اور خلیجی ممالک کے ذاتی طور پر عطیات دینے والوں کی امداد شامل کر لی جائے تو عربوں کی مدد بحیثیت مجموعی امریکہ سے بڑھ جاتی تھی۔ سعودی عرب کی سیکرٹ سروس کے سربراہ شہزادہ ترکی باقاعدگی سے پاکستان کے خفیہ دورے کرتے اور آئی ایس آئی کے صدر دفتر میں جنرل اختر عبدالرحمن سے تفصیلی ملاقاتیں کرتے رہتے تھے۔ جہاں ان کی خواہش پر ان کے لئے کریلے کا سالن پکایا جاتا اور انار کے جوس سے ان کی تواضع کی جاتی۔ بہت سے عرب زکوٰۃ کی رقم مجاہدین کے لئے بھجواتے۔ آئی ایس آئی کے اعلیٰ افسروں کے بقول اگر سعودی امداد نہ ہوتی تو افغانستان سے روسی فوج کی واپسی کا ہدف کبھی حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

طے شدہ نظام یہ تھا کہ آئی ایس آئی جنگ کے لئے درکار اسلحہ اور دوسری ضروری

اشیاء (مثلاً ندیوں والے علاقوں کے لئے ہلکی کشتیاں) کی فہرست مرتب کرتی اور یہ فہرست سی آئی اے کے سپرد کر دی جاتی۔ سعودی مالی امداد بھی امریکیوں کو دی جاتی اور پاکستان کو اس سے مطلع کر دیا جاتا۔ اسلحہ کی خریداری امریکی کرتے تھے اور اس میں آئی ایس آئی کا قطعاً کوئی دخل نہ تھا۔ کلاشن کوف، ہلکی مشین گنیں اور دوسرا چھوٹا اسلحہ سب کا سب چین سے خریدا جاتا۔ شروع میں تو سارے اسلحہ کا 80,90 فیصد چینیوں سے خریدا گیا جنہوں نے کچھ اسلحہ تحفے کے طور پر بھی دیا۔ بعد میں کچھ مصر سے لیا گیا اور یہ بھی ایک بڑا انبار تھا۔ کچھ اسلحہ مغربی ملکوں نے سی آئی اے کو بیچا۔ جس میں ٹینک شکن بارودی سرنگیں اور راکٹ لانچر شامل تھے۔

مجاہدین کو تین طرح کے اسلحہ کی ضرورت ہوتی۔

انسانوں کے خلاف جیسے رائفلیں اور ہلکی مشین گنیں

گاڑیاں تباہ کرنے کے لئے

جہاز گرانے کے لئے

سی آئی اے اسلحہ کی خریداری کے بعد اسے پاکستان پہنچانے کی ذمہ دار تھی۔ پاکستان پہنچتے ہی یہ آئی ایس آئی کے سپرد کر دیا جاتا جس کے تربیت یافتہ اہلکار اور آفیسر رات کی تاریکی میں اسے خاص طور پر بنائے گئے اسلحہ ڈپوؤں میں منتقل کر دیتے اس عمل میں رازداری کا بڑا غیر معمولی اہتمام تھا اور ہر کڑی بڑی احتیاط سے دوسری سے الگ کر دی جاتی تا کہ دشمن اس تک رسائی حاصل نہ کر سکے مثلاً ہوائی اڈوں سے ایک گروپ اسلحہ ٹرکوں میں لادتا اور اس وقت ڈرائیور موجود نہ ہوتے۔ ٹرک لاد لئے جاتے تو ڈرائیوروں کو بلایا جاتا جو اسے متعلقہ مقامات پر پہنچانے کے بعد چابیاں گاڑیوں میں چھوڑ کر چلے جاتے۔ ایک مقررہ وقت کے بعد وہ واپس آتے اور خالی گاڑیاں ان کے حوالے کر دی جاتیں۔ اسی طرح اسلحہ ڈپوؤں سے گاڑیوں کی دوسری کھیپ میں نئے ڈرائیور اس اسلحہ کو سرحدوں کے قریب لے جاتے

اور گاڑیاں کھڑی کر کے رخصت ہو جاتے۔ یہاں سے اسلحہ مجاہدین کے سپرد کر دیا جاتا جو ٹرکوں اور چھوٹی گاڑیاں یا خچروں میں اسے افغانستان کے اندر پھیلے ایک ہزار سے زیادہ جنگی محاذوں پر لے جاتے۔ تیسرے دن خالی ٹرک ڈرائیوروں کو واپس کر دیئے جاتے۔

آئی ایس آئی بنیادی طور پر اسلحہ تقسیم کرنے، حکمت عملی بنانے اور تربیت دینے اور حریت پسندوں کو معلومات مہیا کرنے والا ادارہ تھا۔ جنرل اختر نے بالکل شروع ہی میں واضح کر دیا تھا کہ وہ اپنے ادارے کو ایسے ہر کام سے الگ رکھنا چاہتے ہیں جس میں روپے کا عمل دخل ہو۔ اس لئے آئی ایس آئی نے اسلحہ کی خریداری کبھی نہیں کی۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ جب اسلحہ سٹور کرنے اور دوسری ضرورتوں کے لئے تعمیرات کا مرحلہ درپیش آیا تو یہ کام تعمیرات سے متعلق فوج کے متعلقہ محکمے کے سپرد کر دیا گیا۔ جنرل اختر نے اپنے ادارے میں بہترین لوگوں کو جمع کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ بددیانتی کے کسی بھی واقعہ کا سختی سے نوٹس لیتے تھے۔ انہوں نے اخلاقی خرابی کے شکار افسروں کو آئی ایس آئی سے نکال پھینکا تھا۔ وہ اس معاملے میں ہمیشہ سے بہت سخت رہے تھے اور اب جبکہ وہ ایک جنگ لڑ رہے تھے تو وہ کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھے۔ کوئٹہ میں چند رائفلیں فروخت کرنے کا ایک واقعہ ہوا تو وہ ذاتی طور پر وہاں پہنچے، حالانکہ وہ عام طور پر سفر سے گریز کرتے تھے اور یہ کوئی بہت سنگین واقعہ بھی نہ تھا لیکن انہوں نے نہ صرف متعلقہ افراد بلکہ ان کے نگرانی فوجی افسر کو بھی برطرف کر ڈالا۔ وہ بہت چیخا چلایا اور اس نے کہا کہ وہ ذاتی طور پر تو اس کے لئے ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن اس معاملے میں جنرل بڑا ہی بے لچک آدمی واقع ہوا تھا۔ بددیانتی، غبن اور فریب کے ذرا سے واقعہ پر وہ مشتعل ہو جاتا تھا اور وہ کسی صورت معاف کرنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا۔

بعد ازاں اس مرحلے پر جب روسی فوج کی واپسی یقینی ہو گئی، مغربی ذرائع ابلاغ

نے افغانستان پہنچنے والے اسلحہ میں گڑبڑ کے بہت سے قصے چھاپنا شروع کیے۔ وہ یہ تاثر دے رہے تھے کہ گویا امریکی جو کچھ فیاضی سے دے رہے ہیں، وہ لوٹ مار کرنے والے پاکستانی افسر بے دردی سے بیچ کھاتے ہیں۔ اس کے برعکس حقیقت یہ تھی کہ اگر کوئی اسلحہ بیچتا تھا تو وہ امریکیوں کے پسندیدہ بعض مغرب نواز گروپ تھے۔ جن کی تنظیمیں کمزور تھیں۔ بسا اوقات تو محتاجی کے مارے ضرورت مند لوگ بھی ایسا کرتے، جب انہیں کچھ دوسری چیزوں کی ضرورت ہوتی اور اس کے لئے روپیہ فراہم نہ کیا جا سکتا کہ جنگ ہزار طرح کے مطالبات لے کر آتی ہے لیکن یہ کہنا کہ آئی ایس آئی کے افسر اسلحہ فروخت کر رہے تھے، محض خانہ ساز کہانی تھی یا مغربی ذرائع ابلاغ پاکستان اور ان افغان مجاہدین کو بدنام کرنے کے لئے یہ داستانیں تراش رہے تھے جو بعد ازاں روس سے امریکی مفاہمت کے بعد یکایک حریت پسندوں کی بجائے بنیاد پرست بن گئے تھے۔ اگر اسلحہ کی فراہمی میں آئی ایس آئی کے افسر فریب دہی کر رہے ہوتے تو اس کا سب سے زیادہ علم سی آئی اے کو ہونا چاہئے تھا اور اسی کو سب سے زیادہ تشویش کا اظہار کرنا چاہئے تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ سی آئی اے نے اس موضوع پر کبھی آئی ایس آئی سے کوئی باضابطہ شکایت نہیں کی۔ آئی ایس آئی کے ایک اعلیٰ افسر سے جب اس سلسلے میں کرید کرید کر سوالات کیے گئے تو اس نے برہمی سے کہا میں آپ سے کہتا ہوں کہ ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا۔ آخر وہ کیوں شکایت کرتے۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ جنرل اختر خود اس بارے میں کس درجہ حساس ہیں۔

جنرل اختر کا ایک اور کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے چالیس سے زیادہ بے نظم گروپوں کو سات جماعتوں اور پھر ان سات جماعتوں کو ایک متحدہ محاذ کی شکل دے دی۔ یہ آسان نہیں تھا۔ افغان رہنما اور جنگجو ایک قبائلی معاشرے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ایک دوسرے پر آسانی سے اعتماد کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ ان میں

شخصیتوں کا تصادم آسانی سے راہ پا لیتا تھا، جیسا کہ پنج شیر کے کمانڈر احمد شاہ مسعود اور حزب اسلامی کے سربراہ گلبدین حکمت یار کے اختلافات کی صورت میں ہوا۔ وہ دونوں اکٹھے رہے تھے اور انہوں نے مل جل کر روسیوں کے خلاف منصوبے بنائے لیکن پھر معمولی غلط فہمیوں کے تصادم کی بنیاد رکھ دی اور اس سے افغان جہاد کو بہت نقصان پہنچا۔ وہ دونوں بڑے لیڈر تھے اور اپنے احکامات کی پابندی چاہتے تھے۔ دونوں لیڈروں کو قریب سے جاننے والی ایک ممتاز پاکستانی شخصیت کے بقول وہ برگد کے درختوں کی طرح تھے، جن کے نیچے کوئی فصل نہیں اگ سکتی تھی۔ افغان جہاد میں ان دونوں نے قابل قدر کارنامے سرانجام دیئے لیکن پھر ایک وقت آیا کہ 1983ء میں مسعود نے روسی دباؤ کا شکار ہو کر جنگ بندی کر لی۔ اس سے روسیوں نے فائدہ اٹھایا۔ انہیں علاقے میں اپنی چوکیاں مستحکم کرنے کا وقت مل گیا

احمد شاہ مسعود جو سلاتا جک ہے، فرانسیسی زبان جانتا تھا، لہذا اس کے ساتھ فرانسیسیوں کا گہرا رابطہ رہا، جنہوں نے جنگ میں تو کوئی خاص مدد نہ دی لیکن جنگ زدہ ملک میں ان کے ڈاکٹر اور اخبار نویس بڑی تعداد میں آتے رہے، یا جاسوس، انہوں نے افغانستان کی جنگ آزادی کے لئے اخلاقی مدد فراہم کی اور اپنے رابطے بنائے۔ مغربیوں نے احمد شاہ مسعود کو ایک عظیم کمانڈر بنا کر پیش کیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہرات کے اسمٰعیل شاہ کی طرح، وہ ایک ایسا کمانڈر تھا جس نے گوریلا جنگ کو باقاعدہ طور پر سیکھنے اور سکھانے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں ماہرین کی مرتب کردہ کتابوں کا مطالعہ بھی کیا لیکن اس جیسے کچھ اور کمانڈر بھی ملک میں موجود تھے، لیکن مغربی اخبارات اپنے خاص مقاصد پورے کرنے کے لئے ان میں سے بعض کو دوسروں پر ترجیح دیتے اور ان کے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے تھے جبکہ کچھ دوسرے لوگوں کی کردار کشی کے درپے رہتے تھے۔

انہوں نے سب سے بڑھ کر گلبدین حکمت یار کے خلاف مہم چلائی، جس کی ذات

میں انہیں مستقبل کا امام خمینی دکھائی دیتا تھا۔ حکمت یار ایک بہت سخت جان اور ڈسپلن کی انتہائی پابندی کا مطالبہ کرنے والے لیڈر ہیں۔ ان کی جماعت اس سلسلے میں ایک مثال ہے۔ وہ ظاہر شاہ کے سخت مخالف ہیں اور اس شخص کو افغانستان کے مصائب کا ذمہ دار سمجھتے ہیں، جس نے روسیوں کے ساتھ راہ و رسم بڑھائی اور جہاز کے تکلیف دہ سالوں میں روم کے ایک محل میں مقیم رہا۔ وہ نظریاتی ترجیحات پر زور دیتے ہیں۔ لیکن ان کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ جب وہ امریکہ گئے تو امریکی صدر ریگن کی خواہش کے باوجود انہوں نے اس کے ساتھ ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ پہلی بار امریکی دفتر خارجہ کے لوگ دعوت لے کر آئے تھے دوسری مرتبہ ریگن نے اپنی 50 سالہ بیٹی کو ان کے پاس بھیجا، لیکن وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوئے۔ ان کی پختہ رائے یہ تھی اور امتحان کا وقت آنے پر یہ پوری طرح درست ثابت ہوئی کہ امریکیوں کو مظلوم افغانوں سے کوئی ہمدردی نہیں اور وہ سب کچھ اپنے مفادات کے لئے کر رہے ہیں۔ اس کے بعد امریکی ان کے خلاف ہوتے گئے۔ یہودی اخبار نویس اور امریکی کانگریس کے رکن سٹیفن سولارز جیسے پاکستان دشمن یہودی سیاستدان خاص طور پر ان کے خلاف تھے۔ ادھر بھارتی بھی سب سے زیادہ انہی پر نکتہ چینی کرتے تھے اور اس کی دو بڑی وجوہات تھیں۔ ایک وجہ یہ کہ حکمت یار افغانستان کی آزادی کے بعد پاکستان سے بہت قریبی تعلقات اور اگر ممکن ہو تو دونوں ملکوں کی کنفڈریشن کے حامی تھے، ثانیاً یہ کہ وہ ظاہر شاہ کے مخالف تھے اور سابق بادشاہ کے لئے بھارتیوں کے دل میں نرم گوشہ موجود ہے۔

1987ء سے مغربی اور بھارتی اخبارات نے ایک کورس کی شکل میں گانا شروع کیا کہ اسلحی امداد کا سب سے بڑا حصہ حکمت یار کو دیا جا رہا ہے۔ اس میں ذرہ برابر صداقت نہیں تھی۔ جنرل اختر عبدالرحمن کے لئے افغان لیڈروں میں سے کوئی پسندیدہ اور کوئی ناپسندیدہ نہیں تھا۔ اپنے مزاج کے مطابق وہ اصولوں کی سختی سے

پاسداری کرنے والے آدمی تھے اور جانتے تھے کہ جب آپ ناانصافی اور من مانی سے کام لینے لگتے ہیں تو کبھی بہترین نتائج حاصل نہیں کر سکتے۔ انہوں نے ہر تین ماہ کے بعد مرتب کی جانے والی رپورٹوں کے مطابق اسلحہ جاری کرنے کا نظام رائج کیا اور کبھی کسی کو اس سے انحراف کرنے کی اجازت نہ دی۔ ایسا نہیں تھا کہ جس پارٹی کے ممبر زیادہ ہوں اسے زیادہ اسلحہ دے دیا جائے۔ دیکھا یہ جاتا تھا کہ کس جماعت کی ضرب لگانے کی قوت کتنی ہے۔ مثال کے طور پر ایک گروپ کو کابل شہر میں ویسی ہی کارکردگی دکھانے پر، جس کا مظاہرہ کسی دوسری پارٹی نے پاکستان سے متصل قندھار یا پکتیا صوبے میں کیا ہو، زیادہ اسلحہ دیا جاتا، کیونکہ دارالحکومت میں کارروائی سے زیادہ نتائج حاصل کیے جا سکتے تھے۔ اس طرح حساس اور مشکل تنصیبات اور ہوائی اڈوں پر حملہ کرنے والوں سے بہترین سلوک کیا جاتا۔ 1987ء تک مختلف جماعتوں کو پچھلے آٹھ سال، میں مختلف سہ ماہیوں میں ملنے والے اسلحہ کا تناسب یہ تھا۔

1 حزب اسلامی (حکمت یار) 18 سے 20 فیصد

2 جمعیت اسلامی (استاذ برہان الدین ربانی) 18 سے 19 فیصد

3 اتحاد اسلامی افغانستان (عبدالرب رسول سیاف) 17 سے 18 فیصد

4 حزب اسلامی (یونس خالص گروپ) 12 سے 13 فیصد

5 حرکت انقلاب اسلامی (مولوی محمد نبی محمدی) 12 سے 13 فیصد

6 محاذ ملی اسلامی افغانستان (سید احمد گیلانی) 8 سے 10 فیصد

7 جبہ نجات ملی (پروفیسر صبغۃ اللہ مجددی) 3 سے 5 فیصد

مختلف جماعتوں کو ان کی کارکردگی کے تناسب سے جو کچھ ملتا، اس میں امریکیوں سمیت کوئی مداخلت نہ کر سکتا تھا۔ امریکی سفیر، سی آئی اے کا سربراہ اور نہ صدر ضیاء الحق یا صدر ریگن، البتہ امریکہ کے مختلف محکموں، پنٹاگان، نیشنل سکیورٹی اور سی آئی

اے میں مختلف ترجیحات کے حوالے سے اختلافات تھے۔ ان میں سے ہر ایک امریکی نظام کے اندر کریڈٹ حاصل کرنے اور دوسرے کے کریڈٹ میں کمی کے لئے بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ لیکن اس سے پاکستان یا آئی ایس آئی کو کوئی واسطہ نہ تھا۔ بعض امریکی ادارے، اخبارات یا سیاستدان یہ اعتراض کرتے تھے کہ بنیاد پرستوں کو زیادہ اسلحہ مل رہا ہے اور یہ بات درست بھی تھی کیونکہ اول الذکر چار جماعتوں کو 65 سے 70 فیصد اسلحہ دیا جا رہا تھا، جنہیں بنیاد پرست کہا جاتا تھا، مگر جنگ بھی تو یہی لڑ رہے تھے اور دائرہ عمل بھی انہی کا وسیع تھا۔ بعض امریکیوں کی اس خواہش کے باوجود کہ ظاہر شاہ کی حامی اور مغرب سے بہتر رابطہ رکھنے والی جماعتوں کی زیادہ مدد کی جائے، آئی ایس آئی سے بھرپور رابطہ رکھنے والی سی آئی اے نے کبھی باضابطہ طور پر یہ سوال نہیں اٹھایا۔ وہ ایسا کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ افغانستان کے اندر وہ جاسوسی کا ایک بہترین نظام رکھتے تھے۔ سیٹلائٹ فوٹوگرافی کے علاوہ ان کے پاس جاسوسی کے بہترین الیکٹرانک آلات موجود تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ آئی ایس آئی کی جنگی مہارت سے خوش ہی نہیں مرعوب بھی تھے۔ خود انہوں نے نکاراگوا، کیوبا اور بعض دوسرے مقامات پر جنگی کارروائیوں میں مدد دینے کے جو منصوبے بنائے تھے، وہ بری طرح ناکام رہے تھے۔ وہ اعتراف کرتے تھے کہ اس عمل میں دنیا کا کوئی ادارہ پاکستانی خفیہ ایجنسی کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ اس میں دخل اندازی سے معاملات میں بگاڑ تو پیدا ہو سکتا ہے، بہتری نہیں۔

سی آئی اے کو افغان حریت پسندوں کی تربیت سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ یہ عمل مکمل طور پر آئی ایس آئی انجام دیتی تھی۔ ہر چند کہ روسی و افغانی اور بھارتی ذرائع ابلاغ اور پاکستان میں ان کے بعض کارندے یہ غوغا کرتے رہے کہ اس عمل میں چینی اور امریکی انسٹرکٹر شریک ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کبھی ایک بھی امریکی یا چینی اس

کارروائی میں شریک نہ کیا گیا۔ یہ خاصتاً آئی ایس آئی کا تشکیل کردہ نظام تھا جو افغانستان میں داخل ہونے والی روسی افواج اور ان کے تربیت کردہ افغان دستوں کے طریق کار کو لحوظ رکھتے ہوئے بنایا گیا۔ پھر اس میں مختلف علاقوں کی ضرورتوں کا خیال رکھا جاتا۔ جو لوگ، جس طرح کے علاقوں میں، جس طرح کے کام زیادہ بہتر طور پر انجام دینے کے اہل تھے، انہیں وہی سکھایا جاتا۔ پانی کے اندر بارود لگانے، پل اڑانے، راکٹ برسانے اور سب سے بڑھ کر میزائل فائر کرنے کی تربیت۔

یوں تو روسیوں نے افغانستان میں ایٹم بم کے سوا شاید ہر ہتھیار برت ڈالا، ان ٹینکوں نے سکندر اعظم کے زمانے سے آباد چلے آنے والے گاؤں برباد کر ڈالے، لیکن ان کی اصل برتری فضا میں تھی، جہاں ایم آئی 24 گن شپ ہیلی کاپٹر اور مگ طیارے پرواز کرتے۔ جنرل اختر نے پاکستان کے دورے پر آنے والے امریکی افسروں اور رہنماؤں کو 1982ء ہی میں کہنا شروع کیا کہ میزائلوں کے بغیر روسی برتری ختم نہیں کی جا سکتی، لیکن وہ غیر منظم افغان چھاپہ ماروں کو جدید سٹنگر میزائل فراہم کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ کئی سال کی مسلسل کوششوں کے بعد 1984ء میں حریت پسندوں کو برطانیہ کے بلو پائپ میزائل فراہم کر دیئے گئے جو فاک لینڈ کی جنگ میں بری طرح ناکام رہے تھے۔ جنرل اختر اور ان کے نائب نے اس کی سفارش نہیں کی تھی، لیکن معلوم نہیں کیونکر کروڑوں روپے کے یہ اڑھائی تین ہزار میزائل پاکستان پہنچا دیئے گئے۔ جیسا کہ اہل مغرب کا مزاج ہے۔ انہوں نے اخبارات میں اس کا چرچا تو بہت کیا لیکن جب برتنے کا مرحلہ آیا تو معلوم ہوا کہ اس طرح کی جنگ میں، جو افغانستان میں لڑی جا رہی ہے، بلو پائپ میزائل ہوے کے بے جان ٹکڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ بعض ذرائع اصرار کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان سے ایک بھی جہاز گرایا نہ جا سکا جبکہ بعض دوسروں کا دعویٰ ہے ایک یا دو جہاز تباہ کرنے کی عظیم کامیابی حاصل کر لی گئی۔ پھر لوہے کا یہ انبار ڈپوں میں بند کر کے رکھ

دیا گیا اور جنرل اختر نے امریکیوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر وہ سٹنگر میزائل نہیں دے سکتے تو روسی پسپائی کے خواب کو فراموش کر دیں۔ سالہا سال کی سرمایہ کاری کے بعد، اب جبکہ روسیوں کی ناکامی کی امید پیدا ہو چلی تھی، امریکی آخرکار اس پر آمادہ ہو گئے۔

25 ستمبر 1986 کو جلال آباد کے ہوائی اڈے کی طرف پہلا سٹنگر میزائل فائر کیا گیا اور یہ ٹھیک نشانے پر لگا۔ پہلے ہی دن، پہلے ہی حملے میں پانچ میزائلوں سے تین جہاز گرا لئے گئے۔ ان میں سے ایک رن وے پر تباہ ہوا اور باقی دونوں ایک کلومیٹر کے دائرے میں جا گرے۔ افغانستان کی سات سالہ جنگ میں یہ ایک روز مسرت تھا۔ چند ماہ بعد جب 117 میزائل فائر کیے جا چکے اور حساب لگایا گیا تو 85 جہاز گر چکے تھے۔ امریکی ان نتائج پر حیرت زدہ رہ گئے۔ خود ان کی اپنی فوج میں زمانہ امن میں کامیابی کا تناسب 60 سے 65 فیصد تھا، جو زمانہ جنگ میں آدھا رہ جاتا جبکہ افغان حریت پسند حالت جنگ میں 80 فیصد نتائج حاصل کر رہے تھے۔ حیرت انگیز بات یہ بھی تھی کہ انہوں نے براہ راست میزائل ایجاد کرنے اور سب سے پہلے برتنے والے امریکیوں سے اس کی تربیت نہیں پائی تھی۔ امریکیوں نے تو آئی ایس آئی کے افسروں کو سکھایا تھا جو سی آئی اے کو براہ راست حریت پسندوں تک رسائی دینے پر آمادہ نہ تھی۔ بعد ازاں حریت پسندوں نے ان سے سیکھا۔ اسی طرح آئی ایس آئی کے افسروں نے بعض ہتھیار برتنے کی تربیت چینیوں سے حاصل کی اور پھر افغان مجاہدین کو تربیت دی۔ امریکیوں کو افغان جہاد میں کسی چیز سے اتنی حیرت نہیں ہوئی، جتنی سٹنگر میزائل برتنے میں مجاہدین کی غیر معمولی کامیابی سے۔ جنگ کے آغاز کی طرح وہ اب بھی یہ نہیں سمجھ رہے تھے کہ حریت کیش افغانوں کے لئے جنگ کتنا سنجیدہ معاملہ ہے اور یہ کہ اسی میدان میں ان کی بہترین صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں۔ سٹنگر دنیا کا بہترین میزائل تھا۔ اس نے جنگ کا نقشہ ہی بدل ڈالا۔

دوسرے میزائلوں کے برعکس جو جہاز سے حرارت خارج کرنے کے عمل میں ہدف سے انحراف کرسکتے تھے، سٹنگر ایسا میزائل تھا، ایک بار درست نشانہ لینے کی صورت میں، جا کا وار خطا نہیں ہوتا تھا

ایک دوسرا ہتھیار جس نے جنگ کا پانسہ پلٹنے میں اہم کردار ادا کیا، 107 سنگل بیرل راکٹ لانچر تھے، جن سے عمارتوں اور گاڑیوں کو نشانہ بنایا جاتا اور جن کی رینج 9 کلومیٹر تک تھی۔ چین کا بنایہ ہتھیار 1985ء میں افغانستان پہنچا اور جلد ہی استعمال کیا جانے لگا۔ دو آدمی اسے آسانی سے اٹھا کر لے جاسکتے تھے اور اس وقت جب روسیوں اور کارمل دستوں نے تھوڑے فاصلوں پر چوکیاں بنا دی تھیں اور خچروں پر اسلحہ لے جانا مشکل ہوتا جا رہا تھا، رات کی تاریکی میں حریت پسند دیے پاؤں ان راکٹ لانچروں کے ساتھ، فوجی چوکیوں کے درمیان سے گزر جاتے۔ جب کسی مقام پر چند جن راکٹ لانچر پہنچ جاتے تو ارد گرد کی چوکیوں کا صفایا کرنا آسان ہو جاتا۔

آئی ایس آئی کے صدر دفتر میں 1984ء کا سال بہت طویل محسوس ہوتا تھا۔ جنگ کا شکار انسانوں کا ایک سیلاب پاکستان کا رخ کر رہا تھا۔ افغان بچے برفانی بلندیوں پر جاں سے گزر جاتے یا کھلونا بموں کی نذر ہو جاتے۔ زہریلی گیس سمیت روسی ہر ہتھیار آزما رہے تھے۔ انہوں نے ہزاروں سال پرانے دیہات کو لوح زمین سے مٹا دیا، آبادیاں کھنڈر بن رہی تھیں، باغ اور جنگل کاٹے جا رہے تھے، دیہات، قصبے اور شہر بمباری سے لرز رہے تھے۔ افغانستان کا دوسرا بڑا شہر، افغانستان کے بانی احمد شاہ ابدالی کا دارالحکومت قندھار ملبے کا ایک ڈھیر بن گیا۔ یہ حوصلوں کی آزمائش کا سال تھا، لیکن افغان مجاہد اس امتحان سے سرخرو ہو کر گزر گئے۔ 1985ء کے آغاز میں جنرل اختر فتح کے یقین سے سرشار تھے، جب مسٹر گورباچوف کریملن کے مطلع اقتدار پر نمودار ہوئے۔ وہ دن رات کام میں جتے رہے۔ افغانستان سے

انہیں ایک عجیب اور بہت گہری محبت ہو گئی تھی۔ افغان رہنماؤں سے ان کی پہلے سے زیادہ ملاقاتیں ہونے لگیں جنہیں بہترین خفیہ انتظامات کے ساتھ ان کے گھر پر لایا جاتا تھا۔ اب وہ اس موضوع پر ایک اتھارٹی اور وثوق سے گفتگو کرتے تھے اور حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اس وقت افغانستان کو دنیا میں سب سے زیادہ سمجھنے والے آدمی تھے۔ آئی ایس آئی کے علاوہ سی آئی اے کی فراہم کردہ معلومات کا انبار ہر روز ان کے پاس پہنچتا۔ اب لوگ انہی سے رجوع کرتے اور انہی کی بات سنتے تھے۔ ان میں سے اگر کسی کو ان کی بات یا انداز ناپسند بھی ہو تو اس کے لئے بھی انہیں سننے اور ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ انہوں نے عمر بھر شاید ہی کبھی چھٹی کی ہو، لیکن اب تو اس عشق کی طرح جو آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے، دن رات ان پر یہی ایک دھن سوار رہتی۔ وہ دوروں اور تقریبات سے گریز کرتے اور رات گئے تک، بستر پر لیٹ جانے تک ٹیلیفون پر دفتر سے رابطہ رکھتے اور احکامات صادر کرتے رہتے۔

23 مارچ 1985ء کو صدر نے غیر جماعتی انتخابات کے بعد محمد خاں جونیجو کو اقتدار سونپ دیا۔ رفتہ رفتہ اخبارات کو زیادہ آزادی ملی تو افغان پالیسی پر نکتہ چینی بڑھنے لگی ترقی پسند اخبار نویس تو ظاہر ہے کہ لمبی لمبی داڑھیوں اور بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر پریس کانفرنس شروع کرنے والے افغان لیڈروں کے خلاف تھے ہی، بہت سے دوسرے صحافی بھی آزادی کے لئے برسر پیکار افغانوں کے خلاف لکھ رہے تھے۔ یہ بات کسی طرح مغربی تعلیم یافتہ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اس دور میں اسلام کے نام پر لوگ اپنی جانیں نچھاور کر سکتے ہیں اور یہ کہ روس ایسی عظیم قوت کی عسکری ناکامی سے دوچار کیا جا سکتا ہے۔ پاکستانی صحافت میں بائیں بازو کا پروپیگنڈہ ہمیشہ موثر رہا تھا اور اب یہ اپنا رنگ دکھا رہا تھا۔ ببرک کارمل کے اقتدار سنبھالنے کے بعد افغانستان جانے اور کئی ماہ تک پل چرخی جیل میں قید رہنے والے مختار حسن نے ایجنسی افغان پریس کے نام سے ایک مختصری نیوز ایجنسی قائم کی۔ لیکن

اس طرح کہ اس کی اجازت حاصل کرنے کے لئے لندن میں صدر دفتر بنانا پڑا۔ یہ ایجنسی ہر روز ایک یا دو خبریں اردو اور انگریزی زبان میں جاری کرتی اور ہفتہ میں ایک آدھ فیچر۔ ان خبروں اور فیچروں کی اشاعت کے لئے اخبارات سے درخواست کرنا پڑتی اور بعض اوقات اس کے باوجود ان کی اشاعت ممکن نہ ہوتی۔ ملک میں آئے روز بموں کے دھماکے ہوتے اور بے گناہ لوگ مارے جاتے تو سیاسی لیڈروں کے بیانات شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوتے کہ اس کے ذمہ دار افغان مہاجر ہیں۔ لاہور کے ایک مشہور کالم نگار نے جو 1988ء کے آغاز میں افغانوں کو حریت پسند تسلیم کرنے پر آمادہ ہو گئے، افغان جہاد کی حمایت کرنے والے ایک اخبار میں لکھا یہ کہنا مشکل ہے کہ دھماکے کون کرا رہا ہے۔ ان کا اشارہ یہ تھا کہ ممکن ہے کہ خود صدر ضیاء الحق کی حکومت ہی ایسا کرا رہی ہو۔ دانشور حنیف رامے نے جو بعد ازاں گلبدین حکمت یار کو خراج تحسین پیش کرتے پائے گئے، لاہور کے ایک اجتماع میں حریت پسندوں کو امریکی کارندے قرار دیا۔ جمعیت علماء پاکستان کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی نے جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ کرنل قذافی سے واسطہ رکھتے ہیں (اور اب لادین بعث پارٹی کے سربراہ صدام حسین کو صلاح الدین ایوبی قرار دے رہے ہیں) اپنی پارٹی کے پلیٹ فارم کو مجاہدین کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کی لیکن مولانا عبدالستار خاں نیازی اسے زندگی اور موت کا مسئلہ بنا کر سد راہ ہو گئے۔ مولانا فضل الرحمن افغان مجاہدین کی حمایت کرتے تھے لیکن اسی سانس میں یہ بھی کہتے تھے کہ یہ روس اور امریکہ کی جنگ ہے۔ بعد میں دیوبندی مکتب فکر کے بہت سے افراد اپنے طور پر جہاد میں حصہ لینے کے لئے افغانستان بھی گئے لیکن مولانا فضل الرحمن کی جماعت نے بحیثیت مجموعی اس میں وہ کردار ادا نہ کیا جس کی حکومتوں سے ٹکرانے والے ان سخت جان لوگوں سے امید کی جاتی تھی، البتہ ان سے الگ ہونے والے درخواستی گروپ کے لوگ آواز اٹھاتے رہے۔ صدر ضیاء الحق کے

پروں کے اندر پیدا ہونے والی مسلم لیگ کی حالت عجیب تھی۔ اسے مرکز اور چاروں صوبوں میں اقتدار حاصل تھا لیکن وہ پاکستان کے لئے زندگی اور موت ایسی اہمیت رکھنے والے اس معاملے سے لاتعلق تھی سرحد اور بلوچستان میں اس کو وزرائے اعلیٰ ارباب جہانگیر اور جام آف سبیلہ سرکاری طور پر تو افغان مجاہدین کی حمایت کرتے لیکن بند کمروں کے اجلاسوں اور نجی گفتگوؤں میں اس سے اظہار بیزاری کرتے۔ اسلام آباد میں ایک مسلم لیگی رکن قومی اسمبلی نے ایک روز اپنے دوستوں سے کہا معلوم نہیں افغانستان کے سلسلے میں ان دنوں حکومت کی پالیسی کیا ہے؟ طرفہ تماشا یہ تھا کہ جونیجو کو اس سلسلے میں بنیادی پالیسی سے تو آگاہ کر دیا گیا اور ظاہر ہے کہ ان کے لئے اس کی حمایت کے سوا کوئی راستہ نہ تھا، مگر انہیں مسلسل اعتماد میں لینے اور تصویر کے اندر رکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ خود انہیں بھی اس سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ سال بھر تو وہ صورتحال کو سمجھ ہی نہ سکے۔ بعد میں جب خطرناک مرحلہ آیا تو وہ ضیاء الحق سے الگ ہو کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ تو اس مجبوری سے کہ ایک خفیہ آپریشن تھا اور کچھ اس سبب سے کہ اس طرح کے نظام حکومت میں عوامی رائے کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی، پاکستانی ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو رائے عامہ ہموار کرنے کے لئے کبھی استعمال نہ کیا گیا اور جب ضرورت محسوس کی گئی تو وقت گزر چکا تھا۔

ذہین اور طباع گورباچوف نے 1986ء اور 1987ء میں افغانستان میں اپنے جرنیلوں کو چھ چھ ماہ کی چار قسطوں میں بغاوت کو سختی سے کچل ڈالنے کی آخری مہلت دی لیکن جب انہیں اندازہ ہوا کہ 15 لاکھ جانیں گنوا دینے والی افغان قوم جھکنے پر آمادہ نہیں، ہر روز کم از کم ایک روسی جہاز زمین بوس ہو جاتا ہے، ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں تباہ ہو رہی ہیں اور مرنے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافے سے روس میں اضطراب بڑھتا جا رہا ہے تو روسی معیشت کی تعمیر نو کے آرزو مند لیڈر نے واپسی کا

فیصلہ کرلیا۔

امریکیوں کو واضح طور پر اس کا اشارہ ملا تو وہ مستقبل کے نقطہ نظر سے نئی منصوبہ بندی کرنے لگے۔ پاکستان کا دفتر خارجہ اب جنیوا مذاکرات کی مردہ نعش میں روح پھونکنے کے لئے بے تاب تھا۔ صاحبزادہ یعقوب خاں اور ان کے ساتھی کامیاب سمجھوتے کا کریڈٹ لینے کے لئے بہت بے قرار تھے۔

بہت پہلے جب روسیوں نے ابھی جنگ کی حرارت محسوس کرنا شروع نہیں کی تھی، افغان سیل کے ایک اجلاس میں جنرل اختر نے کہا تھا کہ کابل میں معمول کی زندگی گزارنے والے روسی جرنیل کو جب تک ہراساں اور خوفزدہ نہیں کیا جائے گا، وہ پسپائی پر آمادہ نہیں ہونگے۔ اب ایک اجلاس میں انہوں نے یہ کہا کہ اگر سرحد پار سے روسی افغانستان میں داخل ہو سکتے ہیں تو افغان مجاہدین کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ دریائے آمو کے اس طرف مختصر سی کوئی کارروائی کر ڈالیں۔ اس اجلاس میں دوسروں کے علاوہ وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب خاں بھی موجود تھے۔ چیختے ہوئے انہوں نے کہا اس طرح تو آپ لوگ پاکستان کو برباد کر ڈالیں گے۔ یہ الگ بات کہ جب ایسا ہوا تو گورباچوف نے اسے اپنے ملک میں افغانستان سے واپسی کے لئے ایک دلیل کے طور پر استعمال کیا اور وہ زیادہ واضح طور پر مذاکرات کی کامیابی کے سگنل دینے لگے۔ ایک دوسرے موقعہ پر افغان سیل کے ایک اجلاس میں جب جنرل اختر نے ایسی ہی ایک خوفناک تجویز پیش کی تو صاحبزادہ برہم ہو گئے۔ جنرل اختر نے جیسا کہ ان کا مزاج تھا، اس پر کسی ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ اس شفت زبان دانشور جرنیل کا احترام کرتے تھے جو فوج میں ان کا سینئر رہا تھا اور جسے ضیاء الحق بھی سر کہہ کر مخاطب کرتے تھے انہوں نے نہایت تحمل سے اپنے موقف کی حمایت میں دلائل دیئے اور اپنی بات منوالی۔ جب اجلاس ختم ہو چکا اور سارے لوگ چائے کی میز کے گرد جمع ہوئے تو جنرل اختر وزیر خارجہ کے پاس گئے اور ان سے کہا سر!

آپ جذباتی ہو گئے وزیر خارجہ نے کہا میرا خیال ہے کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں

ایک معتبر ذریعے کو جس نے افغان جنگ کو بہت قریب سے دیکھا اور جسے اندرونی رازوں تک رسائی حاصل تھی، اس پر اصرار ہے کہ 1987ء میں امریکی جنرل اختر کو ناپسند کرنے لگے تھے۔ وہ کبھی ان سے مرعوب نہیں ہوئے اور کبھی ان سے ماتحتوں کی طرح مودب ہو کر پیش نہیں آئے تھے۔ وہ ہمیشہ دلیل دیتے تھے اور دلیل طلب کرتے تھے انہوں نے امریکیوں کی طرف سے افغانوں کی مجلس شوریٰ اور عبوری حکومت قائم کرنے کی تجاویز کو کبھی قبول نہ کیا۔ ان کی سوچی سمجھی رائے یہ تھی کہ اس سے ان کی راہ کھوٹی ہو جائے گی (بعد میں شوریٰ بھی بنی اور عبوری حکومت بھی اور اس سے افغان کچھ بھی حاصل نہ کر سکے)۔

عبوری حکومت کیلئے امریکیوں کا اصرار بتدریج بڑھ رہا تھا۔ اور دوسروں کے علاوہ خود صدر ضیاء الحق بھی اس کے قائل ہو گئے تھے۔ افغان لیڈروں کے ساتھ کئی اجلاسوں میں، جو جہاد میں صدر کے کردار کی وجہ سے ان کا بے حد احترام کرتے تھے، صدر نے انہیں ایسی عبوری حکومت کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کی، جس میں ان کے بعض مخالفین بھی شامل ہوں لیکن ساری جماعتی اتحاد کے رہنماؤں کی اکثریت اس پر آمادہ نہیں کی تھی۔ ایسی ہی ایک ملاقات میں صدر نے انہیں صلح حدیبیہ کا حوالہ دیا جب رسول اللہؐ نے مشرکین مکہ کی بعض شرائط تسلیم کر لیں تھیں او رجو بالآخر فتح مبین پر منتج ہوئی، لیکن افغان لیڈروں کی رائے صدر سے مختلف تھی۔ ملاقات میں شامل تین رہنما استاذ برہان الدین ربانی، پروفیسر عبدالرب رسول سیاف اور صبغۃ اللہ مجددی جو شریعت، شرعی قانون سازی اور حدیث میں ڈاکٹریٹ کی ڈگریوں کے حامل تھے، صدر سے بحث کرتے رہے۔

اس بارے میں دو آراپائی جاتی ہیں کہ صدر کی ان کوششوں سے امریکی آگاہ تھے یا نہیں۔ بہر حال کچھ بھی ہو امریکی اخبارات اب صدر کو ایک بنیاد پرست کے طور پر

پیش کر رہے تھے۔ امریکی سابق بادشاہ ظاہر شاہ کو اقتدار میں لانا چاہتے تھے، روسی اور بھارتی بھی اس نظریے کی حمایت کرتے تھے۔ افغان رہنما اس پر آمادہ نہیں تھے اور امریکی صدر ضیاء الحق سے ناراض تھے کہ وہ یہ بات افغانوں سے منوا کیوں نہیں لیتے۔ کیا انہیں معلوم نہیں تھا کہ اگر صدر چاہیں بھی تو ایسا نہیں کر سکتے۔ افغان زخم خوردہ تھے، ان میں سے ہر ایک خاندان نے اپنا کوئی فرد جنگ میں کھو دیا تھا۔ انہوں نے اپنی جنگ ایک نعرے اور نظریے کے ساتھ لڑی تھی۔ وہ ادھوری کامیابی سے مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔ امریکیوں کو سب سے زیادہ ناراضی گلبدین حکمت یار کے ساتھ تھی، وہ اب اسے ہیروئن فروشوں کو تحفظ دینے والے شخص اور وہشت گرد کے طور پر پیش کر رہے تھے۔ سب لوگ جانتے تھے کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں انہوں نے اس سے پہلے یہ الزامات کبھی عائد نہیں کیے تھے لیکن اب وہ تکرار، اصرار اور برہمی کے ساتھ اس پر تلے ہوئے تھے۔ بعض امریکی اخبارات نے صوبہ ہلمند کے ایک کمانڈر کو پوست کی کاشت کا ذمہ دار قرار دے کر حکمت یار کو اس کے لئے سزا کا مستوجب گردانا۔ وہ کمانڈر واقعی اس میں ملوث تھا لیکن اس کا گلبدین کی پارٹی سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ دوسری طرف امریکیوں، برطانویوں اور فرانسیسی خفیہ اداروں نے افغانستان کے اندر راستے بنا لئے تھے اور وہ بعض کمانڈروں سے براہ راست روابط قائم کرنے میں کامیاب رہے تھے، جنہیں افغان رہنماؤں اور آئی ایس آئی کی نگرانی کے باوجود براہ راست مالی امداد فراہم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

ان کے اپنے لوگوں نے پاکستان کے قبائلی علاقے اور پاکستان میں ہیروئن سازی کی حوصلہ افزائی کی اور کروڑوں کا سرمایہ لگایا تھا۔ منشیات کی تیاری اور سمگلنگ میں ملوث مغربیوں کی تعداد پاکستانیوں اور افغان سے دس گنا زیادہ تھی لیکن وہ پاکستانی قوم اور افغانوں کو اس کے لئے ذمہ دار قرار دے رہے تھے۔ سب سے بڑھ کر افغان رہنماؤں کو جو منشیات فروشی سے مذہبی جذبے سے نفرت کرتے تھے۔

امریکیوں نے افغان جنگ میں سعودیوں سے بڑھ کر مالی مدد فراہم نہیں کی تھی لیکن اب جب فیصلے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ تو وہ شائیلاگ کی طرح ایک پونڈ گوشت کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ستم یہ تھا کہ وزیر اعظم جونیجو سمیت، پاکستان کی سینئر سیاسی قیادت حقائق سے بے بہرہ تھی۔ وہ افغانستان میں اس عظیم فتح کی بجائے جو پاکستان کو ایک نئے عہد میں داخل کر دیتی، افغان مسئلے سے جلد از جلد نجات کے آرزومند تھے، جیسے کوئی بے خبر اور بزدل آدمی جھگڑا چکانے کے لئے ہر شرط ماننے پر آمادہ ہو۔ جنرل اختر اور صدر ضیاء الحق کا انداز فکر تو یہ تھا کہ افغانستان آزاد ہو جائے اور پاکستان سے اس کے قریبی مراسم قائم ہو چکیں تو کشمیر کی آزادی کے لئے تحریک اٹھا دی جائے۔ اس اثنا میں خالصتان آزاد ہو اور اس کے ساتھ ہی پاکستان، ایران، آزاد کشمیر، افغانستان اور ترکی پر مشتمل ایک اتحاد تشکیل دینے کے لئے کام شروع کر دیا جائے جس سے علاقے میں طاقت کا توازن ہمیشہ کے لئے بدل جائے۔ آئی ایس آئی کے صدر دفتر میں آذربائیجان کے لئے آڈیو کیسٹ تیار کئے گئے، جو بارہ سے سولہ سال تک کے بچوں میں تقسیم کئے گئے۔ روس کی مسلمان ریاستوں میں قرآن مجید کے نسخے اور اس کے تراجم بھجوائے جا رہے تھے۔

صدر ضیاء الحق اور جنرل اختر کو یقین تھا کہ ان کی منزل قریب تر آتی جا رہی ہے، وہ مستقبل کے ایک عظیم اور طاقتور پاکستان کے تصور میں تھے۔ ایک عظیم فتح کا خواب ان کے دل و دماغ میں جاگزیں تھا۔ ایک نہایت قابل اعتماد اور نا قابل تردید ذریعے کے مطابق 1987ء کے آغاز میں وہ دونوں رہنما، میران شاہ کے پاکستانی علاقے سے ملحق افغانستان کے صوبہ خوست میں گئے، جہاں کچھ عرصہ پہلے روسیوں نے اپنے چھاپہ مار اتارے تھے اور جہاں آٹھ سالہ جنگ کے بعض شدید ترین معرکے رونما ہوئے تھے یہ افغانستان میں مجاہدین کے سب سے بڑے مراکز میں سے ایک تھا جہاں زیر زمین غاروں میں ہزاروں افراد پناہ لے سکتے تھے۔ اس سفر کا

علم دونوں جرنیلوں، ان کے دو رازدار افسروں اور جہاز کے پائلٹ کے سوا کسی کو نہیں تھا۔ وہ ایک ہیلی کاپٹر میں سوار ہو کر پاور مرکز گئے اور وہاں سے کم از کم ایک گھنٹہ پیدل چلتے ہوئے داغ بیلی کے مورچے میں پہنچے۔ بلندی پر واقع اس مورچے کے سامنے خوست چھاؤنی اور ہوائی اڈہ تھا وہاں انہوں نے کچھ وقت گزارا اور لوٹ آئے۔

افغانی مستقبل کے ایک سحر انگیز خواب میں وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت قریب آ گئے تھے، حد درجہ باہمی اعتماد اور کامل رازداری کے ساتھ وہ آنے والے دنوں کی طرف دیکھ رہے تھے، جس کے مطلع سے اہل پاکستان اور اس خطے کے دوسرے مسلمانوں کے لئے عظمت کا ایک نیا دور شروع ہو سکتا تھا۔ آرمی ہاؤس کے عقب میں جہاں صدر ضیاء الحق اور ان کا خاندان مقیم تھا، جنرل اختر کے لئے خاص طور پر حاصل کئے گئے گھر میں ان دونوں صدر اور ان کے معتمد جرنیل نے تنہائی میں بہت سی ملاقاتیں کیں۔ صدر صرف اپنے ڈرائیور کو ساتھ لے کر کار میں نکلتے اور جنرل اختر کے ہاں جاتے اس پر سکیورٹی حکام نے کئی بار تشویش کا اظہار کیا، جب پریشانی کے عالم میں صدر سے کہا جاتا کہ یہ حفاظتی اقدامات کے تقاضوں سے صریح انحراف ہے، تو وہ کبھی سنجیدگی سے اور کبھی ہنستے ہوئے کہتے DONT WORRY I AM IN SAFE HANDS (فکر نہ کیجئے، میں محفوظ ہاتھوں میں ہوں) بعض دوسرے اعلیٰ حکام کی طرح صدر اور جنرل اختر کے درمیان خفیہ رابطے کے لئے ہاٹ لائن تو موجود تھی لیکن اس سے ہمیشہ استفادہ نہیں کیا جاتا تھا۔ جب کبھی کوئی نازک فیصلہ درپیش ہوتا تو وہ مل بیٹھتے اور اس وقت وہ چھت کے نیچے گفتگو نہیں کرتے تھے۔

جنرل اختر کی میز کے دراز میں ایک چھوٹی سی ڈائری رکھی رہتی جس پر وہ صدر سے گفتگو کے لئے ضروری نکات درج کرتے رہتے اگر ان کے درمیان تنہائی کی

ملاقات کا موقعہ نہ آتا یا خاص طور سے اس کی ضرورت محسوس نہ کی جاتی، تو وہ جمعہ کی نماز کے لئے آرمی ہاؤس کی مختصر سی مسجد میں ملتے۔ نماز کے بعد وہ مسجد کے قریب ایک چھوٹے سے درخت کے نیچے جا کھڑے ہوتے۔ جنرل اختر اپنی جیب سے ڈائری نکالتے اور صدر کے سامنے اپنی معروضات پیش کر دیتے۔ وہ ان میں سے بعض نکات کی وضاحت طلب کرتے، بعض اقدامات پر عمل درآمد کا حکم دیتے اور بعض پر بعد ازاں گفتگو کے لئے کہتے مارچ 1987ء میں جنرل اختر آئی ایس آئی سے الگ ہو گئے، لیکن یہ معمول اس کے بعد بھی جاری رہا۔ آئی ایس آئی سے جدا ہونے کے بعد بھی وہ افغان سیل کے ایک ممبر تھے اور اب بھی ان کی رائے کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ اگرچہ اب وہ فیصلہ صادر کرنے اور ترجیحات طے کرنے والے آدمی نہیں تھے۔

روسی افغانستان میں کوئی اور ادارہ تو ڈھنگ سے تعمیر نہ کر پائے، حتیٰ کہ افغان فوج میں بھی فرار اور بغاوت کا سلسلہ جاری رہا جس پر انہوں نے اس قدر توجہ مبذول کی تھی لیکن وہ 70 ہزار افراد پر مشتمل خفیہ پولیس خاد کی تشکیل میں ضرور کامیاب رہے اور اسے اب وزارت کی سطح پر ترقی دے کر واد (وزارت اطلاعات دولتی) کا نام دے دیا گیا۔ 1980ء میں طے پانے والے ایک معاہدے کے تحت واد کے بیشتر کارکنوں نے ماسکو کے جی بی سکول میں تربیت پائی۔ پاکستان میں واد کی سرگرمیاں کے جی بی کی نگرانی میں بروئے کار آ رہی تھیں۔ تخریب کاری کے لئے، جا کا صدر دفتر کراچی میں تھا۔ پاکستان میں اپنے حامی ترقی پسند کارندوں کی مدد سے کے جی بی کے پاس پاکستانی شخصیتوں، اداروں، علاقوں، جماعتوں اور آبادیوں کے بارے میں وسیع معلومات کا ایک ذخیرہ موجود تھا، جسے از سر نو مرتب کرنے کا عمل جاری رہتا تھا۔ پاک افغان سرحد کی مخصوص صورتحال نے واد کے لئے کام کرنے میں آسانیاں پیدا کیں۔ جبکہ اس کے بعض ایجنٹ مہاجر کیمپوں میں داخل

ہونے اور افغان پارٹیوں کے کارڈ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ کراچی میں سوویت کلچرل سنٹرل واد کے کارندوں کو پاکستانی طالب علموں سے رابطے کے مواقع فراہم کرتا، نمائشوں اور بر سیوں کی تقریبات بھی ایسے روابط کے لئے استعمال کی جاتیں 1987ء میں کراچی میں ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس میں واد کے ایجنٹوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ حالت جنگ میں ہونے کے باوجود پاکستان نے افغانستان کی انتظامیہ کو کراچی کی بندرگاہ کے راستے تجارت کی اجازت دے رکھی تھی کہ پابندی کی صورت میں افغان عوام مشکلات کا شکار ہوتے۔ کراچی میں افغان ٹریڈ کمشنر کا دفتر بھی واد کی سرگرمیوں کے لئے استعمال ہو رہا تھا۔ بائیں بازو کے پانچ سیاستدانوں کی مدد سے سرحد اور بلوچستان سے ہر سال ہزاروں پاکستانی طلبہ کو روس پہنچایا جاتا جہاں وہ مفت تعلیم اور وظائف حاصل کر سکتے تھے واد نے ڈیورنڈ لائن کے قریبی علاقوں میں دہشت گردی کے سیل قائم کیے گئے۔ افغان جہاد شروع ہونے کے بعد سے اس نے پاکستان میں تخریب کاری کا آغاز کر دیا، لیکن 1987ء میں بتدریج اس کی سرگرمیاں بہت زور پکڑ گیں۔ اب اس عمل میں اسے بھارتی ایجنسی را کی مدد بھی حاصل تھی جو سندھ میں پہلے سے سرگرم عمل تھی، لیکن بھارتی پنجاب کی بگڑتی صورتحال کے بعد اس نے پاکستان کے دوسرے حصوں میں بھی ایجنٹوں کا زیادہ وسیع جال پھیلانا شروع کر دیا اور 1988ء تک پہنچتے پہنچتے اس کی تنظیم بے حد موثر ہوگئی۔ 1987ء پاکستان میں تخریب کاری کے واقعات کا سال تھا۔ پشاور، کراچی، راولپنڈی اور لاہور کے اندوہناک واقعات میں ہزاروں پاکستانی ہلاک ہوگئے۔ اس قوم میں، جسے جنگ اور تباہی کے لئے ذہنی طور پر تیار نہ کیا گیا تھا، اس سے جو خوف و ہراس پیدا ہوا، سیاستدانوں نے اسے حکومت اور خاص طور پر صدر ضیاء الحق کے خلاف نفرت پھیلانے کے لئے استعمال کیا۔ ہر حادثے کے لیے وہ انہیں ذمہ دار قرار دیتے اور ان میں سے بعض افغان مجاہدین کو

وہ یہ ماننے پر آمادہ نہ تھے کہ افغان حریت پسند پاکستان کی مدد سے نہ صرف اپنی آزادی بلکہ پاکستان کی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

1988ء کے آغاز میں گورباچوف اور رونالڈ ریگن کے درمیان افغانستان پر ایک خاموش مفاہمت ہوگئی۔ بظاہر دونوں بڑے ملک اس پر متفق ہو گئے کہ روسی افواج افغانستان سے نکل جائیں گی اور اس عمل میں امریکہ اس حد تک تعاون کرے گا کہ یہ ایک توہین آمیز شکست دکھائی نہ دے۔ غالباً ان کے درمیان اس پر بھی اتفاق رائے ہوگیا کہ افغانستان میں ان خطرناک بنیاد پرستوں کی حکومت نہ بننے دی جائے جن کے بھائی بند ایران میں لاشرقیہ والغربیہ کا نعرہ بلند کر رہے تھے

گورباچوف نے اعلان کردیا کہ جنیوا میں معاہدے پر دستخط ہوں یا نہ ہوں، روسی فوجی افغانستان سے واپس چلے جائیں گے۔ ادھر صدر ضیاءالحق کی سرتوڑ کوششوں کے نتیجے میں افغان لیڈر اس پر آمادہ ہو گئے کہ وہ کابل کے ایسے اچھے مسلمانوں کو عبوری حکومت میں شامل کر سکتے ہیں جو جہاد میں تو شریک نہیں ہوئے لیکن کابل کی کٹھ پتلی انتظامیہ کے ممبر بھی نہ تھے۔ جنیوا میں مذاکرات کا آخری دور شروع ہونے والا تھا۔ وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب خاں اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو میں انتخاب ہارنے کے بعد وزارت خارجہ سے الگ کر دیئے گئے تھے اور اب کراچی سے زین نورانی جنہوں نے امور خارجہ کے وزیر مملکت کی حیثیت سے اڑھائی سال تربیت حاصل کی تھی، جونیجو کے وزیر خارجہ بن چکے تھے۔ صدر ضیاءالحق اس پر اڑے ہوئے تھے کہ روس پر دباؤ ڈال کر امریکہ اور آزاد دنیا کی تائید حاصل کر کے کابل میں ایسی عبوری حکومت قائم کر دی جائے جس میں اصل قوت آزادی کے لئے ایک عشرے کی تاریخی جدوجہد کرنے والے پاکستان دوست افغان مجاہدین کے ہاتھ میں ہو۔

یکا یک راولپنڈی اور اسلام آباد کے در و دیوار اوجڑی کیمپ میں دھماکوں سے لرز

اٹھے، جبکہ صدر اور وزیر اعظم دونوں ملک سے باہر تھے۔ جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین جنرل اختر کو اس معاملے سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا لیکن انہوں نے آگے بڑھ کر معملات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ آئی ایس آئی کی سربراہی کے دور میں، وہ ہفتے میں دوبار اس کیمپ میں جاتے رہے تھے۔ انہوں نے یہاں غیر معمولی حفاظتی انتظامات کر رکھے تھے اور کوئی دوسرا تو کیا فوج کے جرنیل بھی اس کے وجود سے بے خبر تھے۔ تاہم بعد ازاں اس غیر معمولی رازداری کا اہتمام نہ ہو سکا اور دشمن اس تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بظاہر یہ محسوس کیا گیا کہ روسیوں کی پسپائی کے تصور سے خوفزدہ واد کی کارروائی ہے، لیکن بعض دوسرے باخبر ماہرین کو اب اس پر اصرار ہے کہ یہ خود اسلحہ فراہم کرنے والی سی آئی اے کا کارنامہ تھا جسے اب آئی ایس آئی کا وجود ناگوار تھا۔ اس وقت جب امریکی ماہرین کی ایک ٹیم، جس کے ارکان نیکریں پہن کر کیمپ میں داخل ہوئے، یہ تجویز کر رہی تھی کہ اسلام آباد اور راولپنڈی کی آبادی سے خالی کرا لیا جائے، جنرل اختر کے حکم پر فوجی جوان قطاریں باندھ کر کیمپ میں داخل ہوئے اور اپنے ہاتھوں میں باقی ماندہ بم اور دوسرا اسلحہ شہر سے باہر اٹھا لے گئے۔

غیر ملکی دورے سے واپسی پر وزیر اعظم جونیجو نے اعلان کیا کہ اس سانحہ کی تحقیقات کرائی جائے گی اور ذمہ دار افراد کے خلاف کارروائی کی جائے گی (کچھ دن بعد بھارت کے ایک اسلحہ ڈپو میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا، لیکن وہاں کسی جرنیل کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہوئی)

صدر ضیاء الحق نے وطن واپسی پر جنرل اختر عبدالرحمن کو ایک خط لکھا اور اس میں اوجڑی کیمپ کے حادثہ کے بعد صورتحال کو سنبھالنے کے لئے ان کی خدمات کی تعریف کی گئی۔ وزیر اعظم جونیجو نے کابینہ کے پانچ ارکان ابراہیم بلوچ، رانا نعیم، قاضی عابد، اسلم خٹک اور نسیم آہیر پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کر دی۔ کمیٹی کی رپورٹ

کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ دشمن کی کارروائی ہے اور یہ کہ اگر کوئی شخص غفلت کا مرتکب ہوا ہے تو اس کے خلاف فوجی ضابطوں کے مطابق کارروائی کی جا سکتی ہے۔ کمیٹی کے ارکان اس وقت ہکا بکا رہ گئے، جب ایک رکن رانا نعیم نے اصل رپورٹ میں تبدیلیاں کر کے ایک دوسری رپورٹ مرتب کی۔ اس پر کمیٹی کے صرف تین ارکان کے دستخط دکھائے گئے تھے جبکہ اسلم خٹک اور نسیم آہیر کے دستخط موجود نہ تھے۔ باقی دو ارکان نے بھی حلفیہ طور پر کہا کہ ان کے دستخط جعلی ہیں۔ صرف ایک رکن اس رپورٹ کے مستند اور باضابطہ ہونے پر اصرار کر رہے تھے۔ وہ پیپلز پارٹی کی سربراہ بے نظیر بھٹو سے جا کر ملے اور ان کی یہ تصویر محکمہ اطلاعات نے سرکاری طور پر اخبارات کو جاری کی، جس میں وہ مذاکرات کرنے والے کی بجائے ایک خبر رساں کا چہرہ لئے بیٹھے تھے۔ صدر کی شہادت کے بعد وہ اچک کر پیپلز پارٹی کی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ جونیجو کابینہ کے ایک وزیر کھلے عام کہتے پھر رہے تھے کہ جنرل اختر اور بعض دوسرے لوگوں کو ان کے مناصب سے برطرف کر دیا جانا چاہئے۔ کیا اس خیال کو وزیر اعظم کی تائید حاصل تھی؟ اور کیا انہیں معلوم نہیں تھا کہ جنرل اختر کو آئی ایس آئی سے الگ ہوئے ایک سال گزر چکا ہے۔

جنیوا مذاکرات کے حوالے سے صدر اور وزیر اعظم کے طرز فکر میں، پہلے ہی طویل فاصلہ حائل ہو چکا تھا۔ وزیر اعظم نے راولپنڈی میں سیاسی جماعتوں کی گول میز کانفرنس طلب کر لی، بائیں بازو کی جماعتیں اور پیپلز پارٹی جو کل تک حکومت سے کسی رابطے کی روادار نہ تھیں کسی پیشگی شرط کے بغیر اس کانفرنس میں شرکت پر آمادہ ہو گئیں اور انہوں نے جنیوا معاہدے پر دستخط کرنے کی حمایت کی۔ اس وقت صدر پورے وثوق سے یہ سمجھتے تھے کہ اگر پاکستان ڈٹا رہے تو روس اور امریکہ کے لئے افغانستان میں عبوری حکومت کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا۔ گول میز کانفرنس کے پہلے دن کے اختتام پر انہوں نے کابینہ کے ارکان سے ملاقات کی

جذبات کی ایسی شدت کے ساتھ، جو ان کے مزاج سے لگا نہیں کھاتی تھی، انہوں نے جونیجو اور ان کے ساتھیوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر انہوں نے اپنی شرائط منوائے بغیر معاہدے پر دستخط کر دیئے تو وہ ایک تاریخی موقعہ کھو دیں گے۔ وزیر مملکت زین نورانی کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے کہا اگر آپ نے معاہدے پر دستخط کیے تو پاکستانی عوام آپ کی بوٹیاں نوچ لیں گے۔ لیکن نورانی خوب جانتے تھے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ پاکستانی عوام سمجھ ہی نہیں پائیں گے کہ ان کے ساتھ کیا بیت گئی ہے۔

کچھ دن بعد مسلم لیگی ارکان پارلیمنٹ کے ایک اجلاس میں جو انہیں اس تاریخی صورتحال کے بارے میں آگاہ کرنے کے لئے بلایا گیا تھا۔ صدر نے ذاتی طور پر شرکت کی درخواست کی۔ صدر کا انداز فکر یہ تھا کہ انہیں غلط تناظر میں معلومات فراہم کر کے کسی فیصلے کی توثیق سے پہلے وہ اپنے موقف سے آگاہ کر دیں۔ اس اجلاس میں وزیر اعظم نے اس انداز سے صدر کو مخاطب کی دعوت دی گویا اس کی کوئی ضرورت تو نہ تھی لیکن چونکہ یہ صدر کی خواہش ہے، لہذا انہیں سن لیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی سرکاری ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کو حکم دیا گیا کہ صدر کی یہ تقریر ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات کے لئے جاری نہیں کی جائے گی۔ اجلاس کے ان شرکاء نے جو سٹیج کے قریب تھے، صدر کے ہاتھوں کو جذبات کی شدت سے لرزتے دیکھا، لیکن انہیں اپنے چہرے اور جذبات پر اب بھی قابو تھا۔

14 اپریل 1988ء کو جنیوا میں ایک معاہدے پر دستخط کر دیئے گئے جس کے تحت روسی افواج کو فروری 1989ء تک افغانستان سے نکل جانا تھا۔ معاہدے پر پاکستان اور افغانستان کی کابل انتظامیہ کے علاوہ امریکہ نے ضامن کی حیثیت سے دستخط ثبت کیے۔ ٹھیک 40 دن بعد وزیر اعظم محمد خان جونیجو کی حکومت اور اسمبلیاں اس وقت برطرف کر دی گئیں جب وہ مشرق بعید کے دورے سے لوٹ کر آئے تھے۔

صدر نے اس حکم سے پہلے کسی سے صلاح مشورہ نہیں کیا۔ ہنگامی پریس کانفرنس کیلئے اپنا بیان انہوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا اور اسے ٹائپ کرانے سے بھی گریز کیا۔ پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے صدر کے لہجے میں وہ اعتماد نہیں تھا جس کے لئے وہ سالہا سال سے پہچانے جاتے تھے، لیکن یہ تو پوری طرح واضح تھا کہ وہ اپنی جنگ تنہا لڑنے کا فیصلہ کر چکے تھے، تمام سیاسی جماعتوں اور پریشر گروپوں سے الگ، اپنے غیر ملکی حلیفوں سے دور۔

آخری باب

گہرا، سیاہ راز

29 مئی کو وزیر اعظم جونیجو اور اسمبلیوں کی برطرفی صرف اہل پاکستان ہی نہیں پوری دنیا کے لئے ایک چونکا دینے والی خبر تھی۔ صدر نے کچھ دن پہلے پارلیمنٹ کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے وزیر اعظم کو انتباہ کیا تھا کہ وہ اپنی روش تبدیل کر لیں۔ اوجڑی کیمپ کے سانحہ کے بعد چہ میگوئیوں کا ایک سلسلہ جاری تھا اور ہر باخبر آدمی جانتا تھا کہ صدر اور وزیر اعظم کے تعلقات خوش گوار نہیں، لیکن سب لوگ جانتے تھے کہ صدر میں صبر کرنے کی بہت غیر معمولی صلاحیت موجود ہے، اس لئے کم ہی لوگ کسی بڑے اقدام کی امید کر رہے تھے۔ صدر نے رفتہ رفتہ ملک کے اندرونی نظام میں ہر چیز وزیر اعظم کو سونپ دی تھی۔ جب 1987ء میں وزیر اعظم نے وائس چیف آف آرمی سٹاف کی تقرری کے سوال پر اپنی رائے منوانے کی کوشش کی اور ملتان کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل راجہ سروپ کو اس منصب پر فائز کرنا چاہا تو صدر اپنی پسند کے امیدوار سے دستبردار ہو گئے اور انہوں نے معاملے کو سلجھانے کے لئے سینئر کور کمانڈر اسلم بیگ کی تقرری کا فیصلہ کر لیا۔ کئی مواقع پر وزیر اعظم نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا تو صدر بدمزہ ہونے کے باوجود خاموش ہو رہے۔ مثلاً جب میاں داد نے شارجہ میں آخری گیند پر چھکا لگا کر بھارت سے میچ جیتا تو کھلاڑی کی خواہش پر صدر نے اسے تحفے میں ملنے والی کار پر درآمدی ڈیوٹی ختم کرنے کا حکم دیا۔ پوری قوم اس بلے باز کو خراج تحسین پیش کر رہی تھی اور کوئی بھی پاکستانی صدر کی طرف سے انعام میں دی جانے والی رعایت پر اعتراض نہ کرتا، لیکن جونیجو نے ایسا کیا۔ وہ صاف صاف صدر کی توہین کر رہے تھے۔ اپریل میں جب صدر پارلیمنٹ سے سالانہ خطاب کرنے والے تھے تو وزیر اعظم کے سیکرٹریٹ سے ایک تقریر انہیں

لکھ کر بھجوا دی گئی۔ وہ شخص جس نے قومی اسمبلی کے ایک حلقے کا انتخاب جیتا تھا اور جسے وزارت عظمیٰ عطا کی گئی تھی، بھارت اور برطانیہ کے وزیر اعظم جیسے اختیارات طلب کر رہا تھا اور وہ بھی قوت کے مظاہرے سے یہ قوت کہاں تھی؟ اگر صدر ان کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کرنے کا فیصلہ کر لیتے تو کیا وہ اسے روک سکتے تھے؟ یہ درست ہے کہ انہوں نے صدر کی مجبوریوں اور مصلحتوں سے فائدہ اٹھا کر الیکشن سے باہر رہنے والی جماعتوں سے رابطے قائم کر لئے تھے، لیکن خود اسمبلی میں صدر کے حامیوں کی تعداد کم نہیں تھی اور جونیجو کسی اعتبار سے صدر سے بہتر حکمت کار (سٹریٹجسٹ) نہیں تھے۔ وہ ذاتی مراسم قائم کرنے کی ذرا بھی صلاحیت نہیں رکھتے تھے اور ان کا واسطہ اس شخص سے تھا جو اپنی ضرب المثل انکساری اور شائستگی سے دشمنی پر تلے آدمی کو رام کر سکتا تھا۔ کیا ابلاغ کے عجز کا شکار وزیر اعظم فوجی اقتدار کے خلاف سیاسی کارکنوں، اخبار نویسوں، دانشوروں اور مختلف ناراض عناصر کی طرف سے پیدا کی جانے والی نفرت کو استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا؟ لیکن شاید سب سے بڑھ کر جنیوا مذاکرات کے لئے امریکہ، روس اور مغربی یورپ کا اصرار اس کا سب سے بڑا اثاثہ تھا۔ اس نے شریعت بل کا راستہ روک رکھا تھا اور اہل مغرب اسے ناپسند نہیں کرتے تھے۔ اس نے افغانستان سے کبھی واسطہ نہیں رکھا تھا اور علاقے میں بھارت کی بالادستی ختم کرنے کی کوششوں میں اس کا کوئی کردار نہیں تھا۔ وہ درحقیقت ایک لیڈر تھا ہی نہیں، وہ اس طرح کا ایک آدمی تھا جس کی اب امریکہ، مغربی یورپ اور حد تو یہ ہے کہ خود روس کو ضرورت تھی، جو ان چاروں کے پسندیدہ ظاہر شاہ کو اقتدار میں لانے کی کوششوں کی کبھی مزاحمت نہ کرتا۔ اب جبکہ بعض ممتاز امریکی سیاستدانوں کی سالہا سال کی کوششوں سے بھارت، روس، امریکہ اور اسرائیل میں رابطے قائم ہو چکے تھے تو پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی حفاظت پر مصر، افغانستان کی مکمل آزادی کا آرزومند، بھارت سے متصادم، کشمیر کی تحریک آزادی کے لئے خاموشی

سے کام کرتا اور شرعی قوانین کے نفاذ کا حامی صدر، پاکستان کے دشمنوں اور سرپرستوں کو قبول نہ تھا اور حیرت انگیز بات تو یہ تھی کہ اب اتفاق میں ان سب کے مفادات ایک ہو گئے تھے۔ وہ سب علاقے میں بھارت کے غلبے پر متفق ہو گئے تھے۔ وہ سب بنیاد پرستوں کے دشمن تھے، وہ سب ظاہر شاہ پر اتفاق کرتے تھے۔

جنیوا معاہدے پر بات چیت کے آخری مرحلے میں صدر تنہا رہ گئے۔ جونیجو نے اس کے لئے پیپلز پارٹی کی تائید حاصل کر لی تھی جو 1984ء تک ببرک کارمل سے براہ راست مذاکرات کی حمایت کر رہی تھی اور جس کے بیشتر رہنما افغان مجاہدین کے اتنے ہی مخالف تھے جتنے کہ بھارت اور روس نواز عبدالولی خاں۔ دستخطوں کی مقررہ تاریخ قریب آ پہنچی اور صدر یہ کہہ کر اسے موخر کرنے پر اصرار کرتے رہے کہ چند ہفتوں کی تاخیر سے کوئی قیامت نہیں ٹوٹ پڑے گی تو امریکی صدر مسٹر رونالڈ ریگن نے فون پر ان سے رابطہ کیا۔ آخر کار مجبور آدمی نے ہاں کر دی، ہمیشہ کی طرح انہوں نے معاملے کو موخر کرنے اور اپنے پتے نئے سرے سے ترتیب دینے کا فیصلہ کیا۔ صدر نے کوئی جماعت نہیں بنائی تھی۔ انہوں نے افغانستان میں اپنی جنگ خاموشی اور خفیہ طریقے سے لڑی تھی اور اب یکا یک اس وقت ساری دنیا کے خلاف اعلان جنگ نہیں کر سکتے تھے، جب پاکستان میں افغان مجاہدین کے حامی سیاسی حلقے بھی ان سے دور چلے گئے تھے۔

آزردہ، ملول اور تنہا صدر نے جن کے بالکل سامنے ایک عظیم تاریخی موقع ضائع کیا جا رہا تھا، اپنے اعصاب پر قابو رکھا۔ آخر شب عبادت کرنے والے تقدیر پرست آدمی کا اس میں کوئی جواب نہ تھا، دوسروں کے سامنے وہ ہنستا تھا، اپنے معمولات جاری رکھے ہوئے تھا لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے دل پر کیا بیت رہی ہے۔ اس نے اقتدار عملاً دوسروں کے حوالے کر دیا تھا اور نازک خارجہ معاملات کے علاوہ، جن پر کھلے عام بحث کا وہ قائل نہ تھا ہر چیز سے لاتعلقی اختیار کر کے ایک

استاد اور فلسفی کا کردار نبھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیا اسے گالی دینے اور اسے دیوار کی طرف دھکیلنے والوں میں سے کسی کو احساس نہیں تھا کہ آخر کار وہ گوشت پوست کا بنا ایک آدمی ہی تو ہے، ایک دن اس کے اعصاب جواب دے سکتے ہیں، لیکن عملی سیاست تو شاید ایک کاروبار کی طرح ہوتی ہے جس میں صرف اپنے منافع کا حساب رکھا جاتا ہے اور جس میں لالچ کے شکار لوگ، بعض اوقات دوسروں سے بڑھ کر اپنے نقصان کا راستہ کھولتے ہیں۔

وزیر اعظم اس وقت چند گھنٹے پہلے مشرق بعید سے آئے تھے اور انہیں ایک دوسرے ملک کی طرف جانا تھا وہ جنیوا معاہدے کو اپنی ذاتی کامیابی سمجھ رہے تھے، جس کے نتیجے میں مہاجر واپس چلے جائیں گے۔ پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور اخبارات ان کی تحسین کریں گے اور ساری دنیا ان پر مہربان ہو گی۔

صدر کو شکست دینے پر وہ خوش تھے اور اب وہ جنرل اختر عبدالرحمن سمیت بعض دوسروں کے خلاف کارروائی کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے انہیں یقین تھا کہ اس کے بعد وہ ملک کے سب سے طاقتور اور مکمل طور پر با اختیار حکمران بن کر ابھریں گے۔ وہ وزیر اعظم ہاؤس کے باغیچے میں تشریف فرما تھے، جب انہیں برطرفی کی خبر دی گئی۔ انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا اور وہ بار بار حیرت سے استفسار کرتے رہے۔

کیا صدر جنرل محمد ضیاء الحق اور جنرل اختر عبدالرحمن کو اندازہ نہیں تھا کہ بہت سی اندرونی اور بیرونی طاقتوں کی مخالفت مول لے کر وہ کس راستے پر چل نکلے ہیں؟

یہ کئی ماہ پہلے کی بات ہے، جنرل اختر عبدالرحمن گالف کورس میں جوگنگ کرتے ہوئے اچانک رکے اور انہوں نے اپنے بیٹے ہارون خاں سے دفعتاً کہا ہمیں جو کچھ کرنا تھا ہم نے کر ڈالا، لیکن وہ اب ہمیں چھوڑیں گے نہیں اسرار سے بھرا مختصر سا جملہ کہا کر وہ پھر سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ ان کے لئے سوچ بچار اور سیر کا وقت تھا اور انہوں نے کبھی اسے گفتگو میں ضائع نہیں کیا تھا۔ ساری زندگی وہ اپنے

معمولات اور خود سے طے کردہ راستے پر چلتے رہے تھے اور اب اس نازک مرحلے میں بھی تبدیلی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ ایک عشرے تک انہوں نے ایک جنگ لڑی تھی۔ دشمن کا قرض چکایا تھا، کامیابیاں حاصل کی تھیں اور مستقبل کی عظیم فتوحات کی بنیاد رکھ دی تھی، جو اگر حاصل کر لی گئیں تو پاکستان جو قائداعظمؒ کی وفات کے بعد سے عدم استحکام کا شکار رہا تھا ایک عظیم ملک بن کر ابھرے گا اور ملت اسلامیہ کے لئے ایک نئے عہد کی اساس فراہم کر سکے گا۔ پھر وہ اپنی راہ کیوں بدلتے۔ یہ درست ہے کہ مسائل اور خطرات موجود تھے، لیکن وہ کوئی تاجر تو نہیں تھا کہ نفع و نقصان کا بہی کھاتہ کھول کر دیکھتے۔ وہ تو ایک جرنیل تھے اور تاریخ کی جاودانی چاہتے تھے، وہ تو ایک مسلمان تھے اور انہیں اپنے رب کے پاس جانا تھا۔ امید کا چراغ ہمیشہ اس آدمی کے دل میں جلتا رہا تھا۔ وہ اسے خود ہی کیسے گل کر دیتا۔ اس کا لیڈر ضیاء الحق تھا، جو آفت اور آزمائش کی گھڑی میں آسمان کی طرف انگلی اٹھاتا اور اس سے کہتا تھا اختر غم نہ کرو، خدا ہمارے ساتھ ہے۔

جونیجو نے اپنی برطرفی پر پہلے دن کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ وہ ششدر اور خوفزدہ تھے۔ دوسرے روز اپنے ساتھیوں کے اصرار پر وہ اخبار نویسوں سے ملے انہوں نے اس اقدام کی تائید نہیں کی لیکن ان کا رویہ اب بھی مفاہمانہ تھا۔ وہ یہ اندازہ لگانے سے قاصر تھے کہ کیا ہونے والا ہے اور انہیں کیا کرنا چاہئے۔ شام کو وہ مئی کے آخری دن کی گرمی میں سویٹر پہنے صدر سے جا کر ملے۔ انہوں نے شکایت تو کی، لیکن احتجاج نہیں کیا۔ وہ ایک لیڈر نہیں تھے اور خطرات مول نہیں لے سکتے تھے۔

اخبارات اور سیاسی جماعتوں نے مخالفت کا ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ صدر نے جونیجو کی حکومت پر بدعنوانی، امن و امان کی تباہی اور شرعی قوانین نافذ کرنے کی ذمہ داری سے انحراف کے الزامات عائد کئے۔ انہوں نے تیزی کے ساتھ غریبوں کی بہبود کے اقدامات اور قاضی عدالتوں کے قیام کا وعدہ کیا، لیکن اپنے خطاب میں

انہوں نے افغانستان اور اوجڑی کیمپ کے حوالے سے درپردہ سازشوں کا کوئی ذکر نہ کیا۔ انہوں نے جونیجو کے ذاتی رویے کی تعریف اور جلد از جلد انتخابات کرانے کا اعلان کیا۔

صدر مستقبل کی صورت گری کے لئے منصوبہ سازی میں مصروف تھے۔ اپنے دوستوں، دانشوروں، سیاستدانوں اور جرنیلوں سے انہوں نے طویل گفتگوئیں کیں۔ انہوں نے قوم کو بتایا کہ نئے انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر ہوں گے اور اپنی ایک نشری تقریر میں غریبوں کی حالت زار کا ذکر کرتے ہوئے ان کی آواز رندھ گئی۔ جب لوگوں نے اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کی تو لاہور کے ایک دانشور نے جواب پیپلز پارٹی میں شامل ہیں، اس مصنف کے ساتھ ایک طویل انٹرویو میں کہا کہ وہ خود بھی گریہ کرنے والے آدمی ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ صدر کا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ آج جب یہ شخص روس، امریکہ اور بھارت کا مقابلہ کر رہا ہے تو قوم نے اسے تنہا چھوڑ دیا ہے۔

صدر منصوبہ بناتے رہے اور وہ کسی چیز سے پوری طرح مطمئن نہ ہو پائے۔ انہوں نے متناسب نمائندگی کی بہت سی صورتوں پر بھی تبادلہ خیال کیا۔ انہوں نے انتخابی شیڈول کا اعلان کر دیا اور ضروری قوانین بنانے کے بارے میں سوچتے رہے۔ وہ واضح طور پر ملال کا شکار تھے کہ انہوں نے غیر جماعتی ایوان کو جماعتی اسمبلی میں تبدیل کرنے کی اجازت کیوں دی اور اگرچہ وہ ہمیشہ کی طرح اب بھی کہتے تھے کہ لوگ ان کی مشکلات کا ادراک نہیں کرتے لیکن اب وہ مفلسوں اور مجبوروں کی بہبود اور انقلابی اسلامی قوانین کے لئے خطرہ مول لینے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ اب بھی ملک کو پیپلز پارٹی کی حکمرانی سے بچانے کا مکمل عزم رکھتے ہیں۔

انہوں نے جنرل اختر کو بار بار مشورے کے لئے بلایا اور اس پر افسوس کا اظہار کیا کہ ان کے ساتھی ایک مکمل منصوبے کی تشکیل میں ان کی پوری طرح مدد نہیں کر سکے

اور وہ چیلنج کی نوعیت کو سمجھ نہیں رہے۔

جولائی کے آخر میں صدر نے جنرل اختر سے اشارۃً کہنا شروع کیا کہ انہیں گڑبڑ کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔ پھر انہوں نے ایک شخص کا نام لے کر کہا کہ انہیں اس کا رویہ مشکوک نظر آتا ہے۔ ایک روز جنرل اختر نے صدر کو اس شخص کے ساتھ گالف کھیلتے دیکھا۔ کھیل سے فارغ ہو کر وہ جنرل اختر کو ایک طرف لے گئے اور کہا کہ وہ اس کا ذہن پڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

پھر انہوں نے کہا مجھے شبہ ہے کہ کچھ ہو رہا ہے، آپ ہوشیار رہیں۔

جنرل اختر جولائی کے ایک دن چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے دفتر پہنچے تو انہوں نے اپنے ڈائریکٹر لیفٹیننٹ جنرل امتیاز وڑائچ کو طلب کر کے سوال کیا کہ اگر بالفرض کسی وقت ہمارے دفتر پر دہشت گرد حملہ کر دیں تو اس سے نمٹنے کے کیا انتظامات موجود ہیں۔ جنرل وڑائچ نے انہیں اس اہم دفتر کے لئے کئے جانے والے حفاظتی اقدامات کی تفصیل سے آگاہ کیا، لیکن جنرل اختر نے اس سے مطمئن نہ ہوئے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ تو معمول کے انتظامات ہیں اور اگر کوئی غیر معمولی صورتحال پیدا ہو جائے تو اس سے نمٹنے کے لئے یہ بندوبست کافی نہیں۔ چنانچہ تفصیلی بحث کے بعد ان انتظامات کو موثر بنانے کے لئے اقدامات کئے گئے۔

صدر بہت دنوں سے اصرار کر رہے تھے کہ افغانستان سے متعلق آئی ایس آئی کے سیل کو الگ کر کے اسے چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی سے متعلق کر دیا جائے اور جنرل اختر ایک بار پھر اس معاملہ کو ہاتھ میں لے لیں، اگرچہ ان کی رائے میں جنرل حمید گل پرجوش محب وطن، قابل اعتماد اور ذہین آدمی تھے لیکن وہ فوج اور آئی ایس آئی میں اعلیٰ سطح پر اہم تبدیلیوں کا فیصلہ کر چکے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ غلام مصطفیٰ جتوئی ان کے وزیر اعظم ہوں گے اور وہ 26 اگست کو حلف اٹھائیں گے۔

جنرل اختر اول اول افغان مسئلے کو ہاتھ میں لینے سے ہچکچا رہے تھے لیکن بہاولپور روانگی سے پہلے صدر نے ایک بار پھر اصرار کیا تو وہ آمادہ ہو گئے۔ ایک مرحلے پر انہیں یہ خیال بھی گزرا کہ صدر انہیں مارشل لاء نافذ کرنے کے لئے کہہ سکتے ہیں۔ صدر نے ان سے یہ نہیں کہا، اشارۃً بھی نہیں اور ظاہر ہے خود وہ صدر سے اس موضوع پر بات نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی ذاتی رائے یہی تھی کہ مارشل لاء کا نفاذ مناسب نہیں۔

جنرل اختر صورتحال کے بارے میں تشویش کا شکار تھے۔ وہ غور و فکر جاری رکھے ہوئے تھے 15 اگست کو وہ رات ڈیڑھ بجے تک آئی ایس آئی کے بریگیڈیئر امتیاز سے صلاح مشورہ کرتے رہے۔ یہ بہت غیر معمولی بات تھی کیونکہ وہ رات بارہ بجے سو جانے کے عادی ہے اور انہوں نے زندگی میں بہت ہی کم اس معمول سے انحراف کیا تھا۔ وہ بہاولپور جانا نہیں چاہتے تھے۔ ایک ٹینک کی کارکردگی دیکھنے سے انہیں بہت زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ یوں بھی وہ وقت برباد کرنے والی تقریبات سے دور رہتے تھے۔ بریگیڈیئر امتیاز نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ بہاولپور جاتے ہوئے ہچکچائیں نہیں، کہ فوج کی ساری قیادت وہاں جا رہی ہے۔ بریگیڈیئر امتیاز ایک عرصہ تک ان کے نائب رہے تھے۔ وہ کراچی کے آئی ایس آئی دفتر کے انچارج تھے اور کرنل کے طور پر ترقی حاصل کرنے سے محروم رہے تھے۔ جنرل اختر مختلف آدمی کو اسلام آباد لائے اور صدر سے کہہ کر ان کی ترقی کا اہتمام کیا جو ان کی صحت پر اعتراض کے سبب روک لی گئی تھی۔ وہ اندرون ملک سکیورٹی کے انچارج تھے اور جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین کے مقابلے میں بعض چیزوں کے بارے میں بہت زیادہ باخبر ہو سکتے تھے۔ ان کے درمیان ایک عرصے سے گہرا تعلق چلا آ رہا تھا جب مارچ 1987ء میں جنرل اختر آئی ایس آئی سے الگ ہو کر چیئرمین بنے تو بریگیڈیئر امتیاز رو پڑے اور روتے روتے انہوں نے اپنا سر ان کے

ہاتھوں پر رکھ دیا تھا۔ ایسے آدمی کے مشورے کو نظر انداز کرنا موزوں نہیں تھا۔ 16 اگست کی شام انہوں نے ایک بار پھر اس موضوع پر بریگیڈیئر امتیاز سے گفتگو کی، جن کی رائے میں فوج میں تبدیلیاں ہونے والی تھیں۔ اس گفتگو کے بعد انہوں نے آخری فیصلہ کر لیا۔

خود صدر بھی بہاولپور جانے کے بارے میں تامل کا شکار رہے تھے لیکن میجر جنرل محمود علی درانی کے مسلسل تقاضوں پر وہ آمادہ ہو گئے جو ان کے ملٹری سیکرٹری رہ چکے تھے اور بھروسے کے آدمی تھے۔

جنرل اختر کو کوئی چیز بے قرار کر رہی تھی۔ انہوں نے امریکہ میں مقیم اپنے بیٹے اکبر خاں، کینیڈا میں غازی خاں اور چند دنوں سے ان کے اصرار پر پاکستان آئے ہوئے ہمایوں اختر خاں اور ہارون خاں سے لاہور میں فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی، لیکن ان میں سے کسی سے ان کا رابطہ نہ ہو سکا۔ دو دن پہلے ان کی اہلیہ نے اپنے خواب میں فو کفن پوش روحوں کو اپنے گھر سے آسمان کی طرف پرواز کرتے دیکھا تھا۔ اگرچہ انہوں نے اس خیال کو اپنے ذہن پر مسلط ہونے نہ دیا اور انہیں تسلی و تشفی دی لیکن وہ مکمل طور پر اسے اپنے ذہن سے جھٹک بھی نہ سکے تھے۔

ادھر پچھلی دیوار کے ساتھ آرمی ہاؤس کے مکین کیلئے بھی یہ معمول کی رات نہیں تھی۔ اگرچہ اس نے اپنے اہل خاندان کو ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا تھا کہ وہ مشکل میں ہے یا اسے کسی اندیشے نے آ گھیرا ہے لیکن رات کے تین بجے اس نے کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں اپنے بڑے بیٹے اعجاز الحق کے ساتھ گفتگو کرنے کی کوشش کی، لیکن رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ انہوں نے اپنی اہلیہ کو نیند سے بیدار کیا اور کچھ دیر اس ماضی کے بارے میں گفتگو کرتے رہے جس سے ان دونوں کو کوئی شکایت نہیں تھی۔

اگلی صبح جنرل اختر معمول کے مطابق سو کر اٹھے۔ معمول کے مطابق انہوں نے چائے کی ایک پیالی لی، پھر اخبارات پڑھے، غسل کیا، کلف لگی وردی پہنی، ہلکا سا

ناشتہ کیا اور جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ 1982ء تک جب تک بوا جی زندہ تھیں وہ دفتر جاتے وقت آیت الکرسی پڑھ کر بیٹے پر دم کرتی تھیں، اس کے بعد سے ان کی رفیق زندگی نے اس معمول کو جاری رکھا تھا۔ آج بھی تو ایسا ہونا چاہئے لیکن ایسا نہیں ہوا اور جب وہ گھر کے بڑے دروازے کی طرف بڑھے تو وہ قرآن مجید لے کر آئیں اور انہیں اس کے نیچے سے گزرنے کو کہا۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ وہ کبھی تو ہم پسند اور اندیشوں کا شکار ہونے والا نہیں تھا لیکن یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ رشید بیگم نے انہیں نہیں بتایا کہ آج کی رات انہوں نے پھر ایک خواب دیکھا ہے اور یہ بتانے کی بیا ایسی بے تابی بھی کیا تھی، یوں بھی ایک خوبصورت خواب تھا جس میں انہوں نے اپنے دوپٹے پر ہیرے جڑے ہوئے دیکھے تھے۔

پاک ون سی 130 چکلالہ کے فضائی مستقر سے پونے آٹھ بجے بہاولپور روانہ ہوا، جہاں ہیلی کاپٹر سے پندرہ منٹ کی پرواز کے فاصلے پر خیر پور ٹامیوالی میں انہیں ایم ون اے ون امریکی ٹینک کا مظاہرہ دیکھنا تھا۔ طیارے میں صدر کے علاوہ کئی اعلیٰ فوجی افسر سوار تھے۔ بار بار یہ سوال کیا گیا ہے اور اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا کہ صدر اتنے جرنیلوں کو ساتھ کیوں لے گئے۔ ایک معتبر ذریعے کے مطابق صدر شکوک کا شکار تھے اور وہ اعلیٰ افسروں کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے۔

خیر پور ٹامیوالی میں امریکی ٹینک ایم ون اے ون کی کارکردگی متاثر کن نہیں تھی، لیکن صدر اس سے بدمزہ نہیں ہوئے اور بہاولپور لوٹ آئے۔ یہاں انہوں نے ظہر کی نماز پڑھی اور دوپہر کا کھانا کھایا۔ پہلے سے طے شدہ پروگرام پر عمل کرنے کی بجائے باجماعت نماز کی جگہ بدل دی گئی تھی اور کھانے کے کمرے میں صدر زیادہ خوش دکھائی نہ دیئے۔

تین بج کر 46 منٹ پر صدر کا جہاز بہاولپور کے رن وے سے اڑا، ان کی دعوت پر امریکی سفیر آرنلڈ رافیل اور پاکستان میں امریکی فوجی مشن کے سربراہ ہربرٹ

واشم بھی اس جہاز میں آبیٹھے لیکن جنرل اسلم بیگ نے صدر کی دعوت قبول نہ کی۔ انہوں نے کہا کہ وہ راستے میں ایک فوجی اجلاس کے لئے رکیں گے۔ صدر نے کہا ہاں! آپ کا جہاز بھی کھڑا ہوا ہے۔ بہاولپور کے ہوائی اڈے سے صدر کا جہاز اڑنے کے لگ بھگ اڑھائی منٹ بعد بہاولپور کے ٹریفک کنٹرولر نے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی جواب نہ ملا، چند لمحے بعد فلائٹ لیفٹیننٹ ساجد چودھری کی آواز سنائی دی۔ سٹینڈ بائی اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ ٹریفک کنٹرولر نے پھر رابطہ کرنے کی کوشش کی، پھر سٹینڈ بائی کی قدرے بلند تکرار سنائی دی۔ چند لمحوں بعد ایک اور کمزور آواز سنائی دی۔ مشہود! مشہور خیال ہے کہ یہ صدر کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیئر نجیب احمد کی آواز تھی۔ کیا کاک پٹ میں بیٹھے لوگ بے ہوش ہو چکے تھے؟ تین بج کر 49 منٹ پر جہاز ہوا میں ہچکولے کھاتا دکھائی دیا اور دو منٹ کے اندر ناک کے بل زمین پر آ رہا یہ بہاولپور کے ہوائی اڈے سے 9 کلومیٹر دور دریائے ستلج کے پار لبستی لال کمال کا علاقہ تھا، چاروں طرف اگی فصلوں کے درمیان یہ ایک چھوٹا سا ویران قطعہ تھا۔

جہاز اب آگ کا گولہ بن چکا تھا۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس آگ کو بجھانے کی کوشش کیوں نہ کی گئی، جہاں زندگی کی موہوم سی امید ہو سکتی تھی۔ بیگم ضیاء الحق کے بقول وہاں وہ کور تھی جس کا انہوں نے معائنہ کیا تھا، لیکن کوئی آگ بجھانے نہ آیا، انہوں نے رسیاں باندھ کر گھیرا ڈال دیا۔ لوگ پانی کی بالٹیاں لے کر پہنچ گئے، لیکن کسی کو جہاز تک جانے کی اجازت نہ دی گئی۔

جنرل اسلم بیگ کا طیارہ اس وقت بہاولپور کے ہوائی اڈے پر تھا، اور غالباً ان کے جیٹ طیارے میں سی 130 کی تباہی کا سگنل بھی موصول ہوا۔ وہ ائیر پورٹ سے اترے۔ انہوں نے فضا میں چکر لگایا اور سیدھے راولپنڈی پہنچ گئے۔ یہاں انہوں نے سینئر فوجی افسروں کا اجلاس بلایا۔ سینٹ کے چیئرمین جناب غلام اسحٰق

خان سے دستور کے مطابق صدارت کا عہدہ سنبھالنے کو کہا گیا۔ جنہوں نے فوراً ہی جنرل اسلم بیگ کو چیف آف آرمی سٹاف کے منصب پر فائز کر دیا پشاور سے کار میں آنے والے جنرل فضل حق اجلاس میں تاخیر سے پہنچے۔ ان کا اصرار تھا کہ راولپنڈی کے کور کمانڈر جنرل عمران اللہ کو کمانڈر انچیف اور سب سے سینئر جرنیل مرزا اسلم بیگ کو جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کا چیئرمین بنا دیا جائے، لیکن ان کی بات کسی نے نہ سنی۔ ملک اب نئے ہاتھوں میں تھا۔ بعد میں روتے ہوئے انہوں نے کہا کاش اختر ہی بچ گیا ہوتا ساڑھے چار بجے تک، کراچی، لاہور اور اسلام آباد سمیت ملک کے تمام شہروں میں صدر کے طیارے کی تباہی کی خبر پہنچ چکی تھی۔

19 اگست کی صبح جنرل اختر عبدالرحمن کی میت ان کے گھر پر لائی گئی۔ بتایا گیا تھا کہ حادثے میں جسم راکھ بن گئے ہیں اور چہرے ثابت و سالم نہیں رہے لہذا سوگ میں ڈوبے، آہوں اور سسکیوں سے آباد گھر میں کسی نے رخصت ہو جانے والے کا چہرہ نہیں دیکھا کہ یادوں کی ابدیت میں، وہ ویسا ہی توانا، تازہ، جیتا جاگتا، رستا بستا رہے، ہزار ہا غمزدہ لوگوں نے جنازے میں شرکت کی جن میں سے صرف چند سو ہی جانتے ہوں گے کہ وہ جس آدمی کو مٹی کے سپرد کرنے جا رہے ہیں در حقیقت کون اور کیا تھا۔

20 اگست کو اسلام آباد کے ایوان صدر سے ضیاء الحق کا جنازہ اٹھا۔ ضیاء الحق کی نا مقبولیت پر متفق اخبار نویسوں، دانشوروں، سیاست دانوں اور حکمرانوں کے لئے یہ ایک حیران کر دینے والا دن تھا۔ ششدر اور مبہوت انہوں نے دیکھا کہ گریہ کرنے والوں میں اپاہج، کمزور اور مفلس لوگ کتنی بڑی تعداد میں شامل تھے گریہ کرتی بیوہ عورتیں، یتیم اور معذور بچے، پھر تحسین کا ایک طوفان اٹھا۔ دنیا کے اہل دانش، جرنیل، مدبر، حکمران، ادیب اور شاعر اس کو روئے، جسے گیارہ سال سے گالی دی جا رہی تھی۔ صرف زبگینو برزنسکی ہی نہیں، بہت سے دوسرے باخبروں نے بھی دنیا کو

بتایا کہ تاریخ کی لوحِ ابدیت پر اس کا نام لکھا جانے والا ہے۔

اہلِ وطن کو یہ خبر بی بی سی، نیوز ویک اور ٹائمز لندن نے دی کہ ضیاء الحق کا ممکنہ جانشین اختر عبدالرحمن نامی جرنیل تھا۔ دس کروڑ انسان اس آدمی سے ناواقف تھے، جسے قتل نہ کر دیا جاتا تو دشمن کا منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ بے خبری کی دھند سے دھیرے دھیرے ایک نادر و نایاب اور خیرہ کن تصویر ابھرنے لگی۔ کیا وہ شاعر اسد اللہ خان غالب کی طرح تھا؟ لیکن غالب کا اعتراف کچھ لوگوں نے تو کیا ہی تھا، یہ تو ایک عجیب آدمی نکلا، بھلا تاریخ میں کبھی ایسا بھی ہوا تھا کہ میدانِ کارزار کا ایک شہسوار اپنی موت کے بعد دنیا پر منکشف ہو؟

شہید صدر کی مرقد پر پھول برسائے جا رہے تھے۔ جنرل مرزا اسلم بیگ نے اعلان کیا کہ آرمی ہاؤس کو قومی یادگار میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ ٹی وی سے فلمیں دکھائی جانے لگیں۔ شاعروں نے مصرعوں کو سسکیوں اور حسرتوں سے بنا، حتیٰ کہ چاہنے والوں کے لئے غم کی ردا نے جیسے چاند ستاروں کو ڈھانپ دیا اور پھر سوال اٹھا کہ وطن اور اسلام کے ان سپاہیوں کا قاتل کون ہے؟

لاشیں پوسٹ مارٹم کے بغیر دفنا دی گئیں۔ امریکہ کے دفتر خارجہ سے متعلق افسروں نے معتبر صحافیوں کو رازداری سے یہ بتانے کی کوشش کی کہ یہ حادثہ ہو سکتا ہے۔ ایف بی آئی کی ٹیم کو پاکستان آنے سے روک دیا گیا اور پاکستانی فضائیہ کے سربراہ نے حادثے کے اسباب کا سراغ لگانے کے لئے ایک ٹیم مقرر کر دی۔

دو ہفتوں کے بعد ریڈیو اور ٹی وی سے صدر کا ذکر غائب ہو گیا۔ صدر نے وزیر اعظم کی تقرری سے انکار کیا اور جماعتی انتخابات کا اعلان کر دیا۔ لاہور ہائی کورٹ نے جس میں 17 اگست کی صبح ایک رٹ دائر کی گئی تھی، وزیر اعظم اور اسمبلیوں کی برطرفی کو ناجائز قرار دیا لیکن جونیجو کی وزارت عظمیٰ بحال نہ کی۔ سپریم کورٹ نے بھی اس فیصلے کو برقرار رکھا جبکہ بعض معلومات کی بنیاد پر جونیجو اچکن پہن کر آئے

تھے کہ عدالت سے سیدھے وزیر اعظم ہاؤس جا سکیں۔ کمانڈر انچیف نے ممتاز سیاستدانوں سے خفیہ ملاقاتیں کیں۔ بے نظیر نے فوج کے ساتھ نامہ و پیام کیا۔ اسلامی جمہوری اتحاد وجود میں آیا اور جونیجو کو مکھن سے بال کی طرح نکال دیا گیا۔ انتخابی مہم شروع ہوئی تو بیگم نصرت بھٹو نے بیان دیا کہ پاکستان کی ایٹمی تنصیبات عالمی معائنے کے لئے کھول دی جائیں گی اس پر مزاحمت کا طوفان اٹھا تو بے نظیر نے سیاچن گلیشیر کے حوالے سے مرنے والے پر بہتان باندھے لیکن مسجد فیصل کے سائے میں سونے والے کا وکیل کوئی نہ تھا۔ اسلامی جمہوری اتحاد کے پلیٹ فارم سے افغان جہاد کی حمایت میں شور و غوغا تو اٹھا لیکن کسی کو اس جہاد کے لئے تنہا اٹھ کھڑے ہونے اور پہاڑ ایسی آزمائشوں سے گزرنے والوں کی یاد نہ آئی۔

بے نظیر کے اقتدار میں آنے سے چند روز پہلے فضائیہ کے تحقیقاتی بورڈ نے اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ یہ حادثہ نہیں تھا صریحاً تخریب کاری تھی لیکن قاتل کون تھے؟ بورڈ نے سفارش کی کہ مجرموں کا سراغ لگانے کے لئے الگ سے تحقیقات کی جائے، چنانچہ صدر غلام اسحٰق خاں کے حکم پر آئی ایس آئی اور ایف آئی اے کے افسروں پر مشتمل ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کی گئی۔ ایک وفاقی سیکرٹری ایف کے بندیال کو اس کا رابطہ افسر مقرر کیا گیا۔ دنیا بھر کے ممتاز اخبارات نے بعد میں لکھا کہ اس کمیٹی نے در حقیقت کوئی تحقیقات کی ہی نہیں۔ ان میں دنیا کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا جریدہ ریڈرز ڈائجسٹ بھی تھا۔ اس پر ایف کے بندیال نے ریڈرز ڈائجسٹ کے ایڈیٹر کو جون 1989ء میں خوبصورت انگریزی میں خط لکھا کہ ان کی کمیٹی بڑی ہی سرگرمی سے تحقیقات کر رہی ہے۔ یہ خط پاکستانی اخبارات میں لیڈ سٹوری کے طور پر چھپا۔ اگلے ہی دن اعجاز الحق نے اس کے مندرجات کی تردید کر دی پھر سرکار خاموش ہو رہی، پونے دو سال گزر چکے اور اب تک کسی کو معلوم نہیں کہ یہ تحقیقات کس زمین اور کس آسمان پر ہو رہی ہیں۔

معلوم نہیں ایف آئی اے اور آئی ایس آئی کی فائلوں میں کیا لکھا ہے لیکن اس مصنف کی چند ماہ کی کوششوں کے نتائج یہ ہیں۔

فضائیہ کے تحقیقاتی بورڈ نے شواہد سے ثابت نہ ہونے والے نکات کی نفی کرنے کے عمل Process of Elimination

کے ذریعے قرار دیا کہ حادثے کا کوئی امکان نہیں اور یقینی طور پر یہ تخریب کاری کا واقعہ تھا۔ رپورٹ کے الفاظ یہ ہیں ایسے تکنیکی اسباب کی عدم موجودگی سے، جو حادثے کا ذریعہ بنے ہوں، بورڈ کو یقین ہے کہ حادثہ سبوتاژ کی ایک مجرمانہ کارروائی تھی ایک قابل اعتماد ذریعے کے مطابق بورڈ کے ارکان تباہ شدہ جہاز کے ٹکڑوں کو لیبارٹریوں میں ٹسٹ کرانے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اس کی تباہی میں زہریلی گیس استعمال کی گئی لیکن رپورٹ میں صاف صاف یہ دوٹوک رائے دینے کی بجائے اس طرح محض اشارہ کرنے پر اکتفا کیا گیا۔ اس ذریعے کے مطابق بعض ارکان سے کہا گیا کہ وہ اسے ایک حادثہ ظاہر کرنے کی کوشش کریں لیکن بورڈ کے ان ارکان نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا کہ ان کی رائے میں یہ حد درجہ مضحکہ خیز اور احمقانہ ہوتا، جسے کوئی بھی تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوتا، لیکن دباؤ کے نتیجے میں گیس کی تھیوری کا صاف صاف اور برملا اظہار نہ کیا گیا تا کہ ان خطوط پر تحقیقات تیزی سے آگے نہ بڑھ سکے۔

کراچی میں جمعیت علماء پاکستان کے رہنما ظہور الحسن بھوپالی اور لاہور میں مسلم لیگ کے ممتاز قائد چودھری ظہور الٰہی کو قتل کرنے والی دہشت گرد تنظیم الذوالفقار کے 25 سے زیادہ ارکان 2 اگست کے بعد سے بہاولپور میں مقیم تھے۔ ان میں سے کچھ تو پنجاب اسمبلی کے ایک

موجودہ ایم پی اے کے بھائی کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور کچھ ہوٹلوں میں، ایم پی اے کا یہ بھائی دہشت گردی کے واقعات میں ملوث رہا ہے۔

اس ایم پی اے کا برادر نسبتی جواب ایک اعلیٰ منصب پر فائز ہے، ایک سرکاری افسر کے گھر میں ٹھہرا ہوا تھا جو اس کا ہم زلف ہے۔

یہ افسر وہ ہے جو جہاز گرنے کے بعد نگرانی پر مامور تھا، جہاز کا ملبہ اس کے کنٹرول میں تھا۔ اسی کے حکم پر ملبے کے گرد کندھے جوڑ کر گھیرا ڈالا گیا اور اس پر پانی ڈالنے اور تصویر بنانے کی اجازت نہ دی گئی۔ اسی نے بہاولپور کے کمبائنڈ ملٹری ہسپتال میں لاشوں کا پوسٹ مارٹم روکنے کا حکم دیا اور پھر ان لاشوں کو لکڑی کے تابوتوں میں ڈال کر کیلیں ٹھونک کر اس ہدایت کے ساتھ روانہ کیا گیا کہ کسی کو انہیں کھولنے کی اجازت نہ دی جائے اس کے بعض رشتہ دار الذوالفقار میں شامل ہیں۔

14 اگست 1988ء کو الذوالفقار کے دو کارندے بہاولپور ڈویژن کی بھارتی سرحد سے پاکستان میں داخل ہوتے ہوئے گرفتار کیے گئے۔ ستلج رینجرز نے ان دونوں کو ایک خفیہ ایجنسی کے حوالے کیا۔ بعد میں کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ دونوں کہاں گئے۔ وہ ذرائع سو فیصد قابل اعتماد ہیں جنہوں نے ان کی گرفتاری اور سپردگی کی اطلاع فراہم کی ہے

دو الگ الگ اور معتبر ذرائع کے مطابق 'الذوالفقار' کا سربراہ مرتضیٰ بھٹو 17 اگست کو دہلی کے مشہور اشوکا ہوٹل میں مقیم تھا۔ انہی ذرائع کے مطابق وہ اپریل 1989ء میں سندھ کی سرحد سے پاکستان میں داخل ہوا اور بہاولپور پہنچا۔ اس کے پاس ایک بھارتی پاسپورٹ

بھی دیکھا گیا۔

اگرچہ بعد ازاں طیارے کو زہریلی گیس سے تباہ کیا گیا لیکن 'الذوالفقار' کے پاس دو متبادل منصوبے تھے جس پر عملدرآمد کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ ایک منصوبے کے تحت جہاز کو رن وے پر اترتے وقت تباہ کیا جاتا تھا اور دوسرے کے تحت جرنیلوں پر مسجد میں ظہر کی نماز پڑھتے وقت حملہ کیا جاتا۔ صدر اور ان کے ساتھیوں نے یہ نماز پہلے سے طے کردہ پروگرام کے تحت مسجد کی بجائے فوجی میس کی گراؤنڈ میں پڑھی۔

اس وقت جب سی 130 ہوائی اڈے پر کھڑا تھا، اس میں زہریلی گیس کی ایک ڈبیا رکھی گئی، اسے کاک پٹ کے ایک پرزے کے سائز کے مطابق بنایا گیا تھا۔ اس پرزے کو نکال کر یہ ڈبیا اس کی جگہ لگا دی گئی۔ اس کا رنگ اور ساخت مکمل طور پر اس پرزے کے مطابق تھی۔ یہ کام نچلے درجے کے ایک افسر نے ایک اہلکار کی مدد سے کیا۔ خاموشی سے تحقیقات کرنے والے ماہرین کو یقین ہے کہ یہ ڈبیا جسے بعد ازاں غالباً ریموٹ کنٹرول سے پھاڑ دیا گیا، کسی طاقتور خفیہ ادارے نے فراہم کی تھی یہ ڈبیا 'الذوالفقار' کے ذریعے بہاولپور پہنچی اور جہاز میں نصب کرنے والوں کے حوالے کر دی گئی۔

منصوبے میں بھارتی خفیہ ایجنسی را کی شرکت سو فیصد یقینی ہے۔ ایک انتہائی قابل اعتماد ذریعے کے مطابق حادثے کے کچھ عرصہ بعد را کے چار ایجنٹوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ان میں سے دو چکالہ ائیر بیس سے (جہاں سے جہاز روانہ ہوا) اور دو بہاولپور سے پکڑے گئے۔ چکالہ سے پکڑے جانے والوں نے جہاز اڑنے کے بعد وائرلیس پر

بہاولپور میں اپنے دونوں ساتھیوں کو منصوبے پر عملدرآمد کا اشارہ دیا۔
گرفتاری کے بعد ان چاروں نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔ انہیں
کسی نامعلوم مقام پر رکھا گیا ہے۔ ان کے خلاف کوئی پرچہ درج کیا
گیا اور نہ کوئی قانونی کارروائی کی گئی۔ چاروں کا تعلق بھارت کے
ایک شہر سے ہے۔ اس کتاب کی تدوین کے دوران دوبار یہ اطلاع
موصول ہوئی کہ یہ لوگ قتل کر دیئے گئے ہیں لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ
وہ زندہ ہیں۔

اگرچہ حادثے میں سی آئی اے کے براہ راست ملوث ہونے کا کوئی
ٹھوس ثبوت مہیا نہیں کیا جا سکتا لیکن طیارے کی تباہی کے بعد امریکی
حکومت پورے عزم کے ساتھ پردہ پوشی پر تل گئی۔ حادثے میں دو
امریکی شہری ہلاک ہوئے تھے لہذا امریکی قانون کے تحت خود
امریکیوں کو اس کی تحقیقات کرنی چاہئے تھی مگر ایف بی آئی کی ٹیم کو
پاکستان آنے سے روک دیا گیا۔

ائیر فورس اور ایف بی آئی کے ماہرین کے ایک ایسے وفد کی بجائے
جو جرم کے نشانات سے مجرموں تک پہنچ سکتا۔ فنی ماہرین کی ایک ٹیم
بھیجی گئی جو صرف حادثے کے اسباب کا سراغ لگا سکتی تھی۔ افغانستان
میں سی آئی اے کے ساتھ کام کا تجربہ رکھنے والے ماہرین کا کہنا ہے کہ
اگر سی آئی اے چاہتی تو 17 اگست کو رات گئے تک کے ریکارڈ شدہ
سگنلوں کی مدد سے بہت سے شواہد فراہم کر سکتی تھی۔

بعض امریکی اخبارات اور کانگرس کے دباؤ پر، حادثے کے دس ماہ
بعد ایف بی آئی کی ایک ٹیم اسلام آباد پہنچی۔ اس ٹیم کے ارکان حکومت
پاکستان کے مہمان تھے۔ وہ صرف ایک بار اسلام آباد سے باہر نکلے،

جب وہ سرکاری افسروں کی معیت میں ٹیکسلا کے میوزیم اور کھنڈرات دیکھنے گئے۔ صدر ضیاء الحق کے صاحبزادے اعجاز الحق نے جنرل اسلم بیگ کے پائلٹ سمیت کئی گواہوں سے ان کی ملاقات تجویز کی لیکن وہ ان میں سے اکثر سے نہیں ملے۔

نیشنل سکیورٹی کے ڈپٹی ایڈوائزر مسٹر رابرٹ اوکلے جنہوں نے 17 اگست کو ایف بی آئی کی ٹیم کو پاکستان آنے سے روکنے میں اہم کردار ادا کیا تھا، فوراً ہی پاکستان میں سفیر مقرر کر دیئے گئے۔ کانگرس کی ہاؤس جوڈیشل سب کمیٹی آن کرائمز کے سامنے شہادت دیتے ہوئے جب مسٹر اوکلے سے سوال کیا گیا کہ ایف بی آئی کی ٹیم پاکستان کیوں نہ بھیجی گئی تو ان کا جواب تھا اس کا کسی کو خیال ہی نہیں آیا جس قانون (Long arms act) کے تحت ایف بی آئی کی ٹیم کو پاکستان آنا چاہئے تھا، اس کے نفاذ میں مسٹر اوکلے بہت سرگرم رہے تھے۔ ایک دوسرے موقع پر انہوں نے کہا پاکستانی فوج ہی وہ واحد ادارہ تھا جو حادثے کے بعد ملک کو سنبھال سکتا تھا اور ہم اسے عدم استحکام کا شکار کرنا نہیں چاہتے تھے۔

13 اگست کو بہاولپور میں مقیم ایک امریکی راہبہ (نن) کو پراسرار طور پر قتل کر دیا گیا۔ قاتل کا تعلق 'الذوالفقار' سے تھا جس کے ارکان اس شہر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ قتل کے اس سنگین واقعہ میں امریکیوں نے کوئی دلچسپی نہ لی اور اسے ڈکیتی کی کوشش قرار دے کر معاملہ دفن کر دیا۔ اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا کہ را 'الذوالفقار' اور بہاولپور میں متعین سرکاری افسروں کے درمیان رابطے کے فرائض کس نے انجام دیئے۔ یہ ایک طاقتور خفیہ ایجنسی ہی ہو سکتی ہے۔

ستمبر 1989ء میں جنرل اختر کے صاحبزادے ہارون اختر امریکہ گئے، انہوں نے کانگرس کی سب کمیٹی برائے تحقیقات جرائم کے سامنے 5 گھنٹے تک شہادت پیش کی۔ انہوں نے جرم کے بعض واضح نشانات سے ارکان کانگرس کو آگاہ کیا۔ انہوں نے اس معاملے میں بظاہر بڑی دلچسپی ظاہر کی، بعد میں کچھ معلوم نہ ہوسکا کہ امریکیوں نے ان شواہد کی بنیاد پر کیا کارروائی کی۔

بظاہر ایسا نظر آتا ہے اس حادثے سے پیدا ہونے والی صورتحال میں سب سے زیادہ فوائد حاصل کرنے والے امریکی پس پردہ حقائق سے پوری طرح باخبر ہیں جسے نیوز ویک نے گہرے تاریک راز کا نام دیا ہے لیکن وہ اسے آشکار نہیں کرنا چاہتے کہ شاید اس کے نتیجے میں انہیں علاقے میں اپنی پسند کی پالیسیاں جاری رکھنے میں مشکلات پیش آسکتی ہیں۔

اپنے طور پر حادثے کی تحقیقات کرنے والے ایک ماہر کے مطابق امریکیوں کو فوراً ہی اصل حقائق کا علم ہوگیا تھا اور جب بھی چاہتے زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے میں تمام اسرار بے نقاب کرسکتے تھے لیکن ان کے قومی مفادات کا تقاضا غالباً یہی ہے کہ وہ اس معاملے پر اسرار کے پردے ڈالے رکھیں، لہٰذا ان کا ہر اوارہ چند قدم کے بعد ٹھٹھک کر رک جاتا ہے۔ تمام تر حقائق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس مصنف کی پختہ رائے یہ ہے کہ اس سازش میں یقینی طور پر

1 بھارتی خفیہ ایجنسی را

2 دہشت گرد تنظیم 'الذوالفقار'

3 اور چند سرکاری افسر شامل ہیں

4 سانحے کے ذمہ دار افراد کو بچانے کی تمام تر ذمہ داری امریکہ پر عائد ہوتی ہے کیونکہ بھارت یا کوئی دوسری طاقت پاکستان میں پردہ پوشی کے لئے فضا ہموار نہیں کر سکتی تھی۔

5 ایک یا دوسرکاری افسر غالباً نادانستہ طور پر استعمال ہوئے

حادثے کے بعد ملتان میں متعین آرٹلری ڈویژن کے کمانڈر میجر جنرل محمود علی درانی کا نام بھی لیا جاتا رہا، جنہوں نے 17 اگست کے مظاہرے کا اہتمام کیا اور صدر سے شریک ہونے پر اصرار کرتے رہے۔ درانی صدر اور جنرل اختر کے قریب رہے تھے۔ ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ وہ کبھی ان سے ناخوش ہوئے ہوں انہیں اس سے کوئی فائدہ بھی نہیں پہنچا۔ وہ اب تک اس سانحے پر گہرے ملال کا شکار ہیں اس امکان کو مکمل طور پر مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ بعض لوگوں نے انہیں صدر کو بلانے کی تلقین کی ہو اور وہ اس کا مقصد نہ سمجھ پائے ہوں

کیا بریگیڈیئر امتیاز سانحے کے ذمہ دار افراد کی فہرست میں شامل ہیں؟ اس کے باوجود کہ وہ جنرل اختر کو جہاز پر سوار کرنے کے ذمہ دار ہیں، یہ لازمی نہیں ہے کہ انہیں سازش کا علم ہو۔ 17 اگست کی رات انہیں جس طرح دھاڑیں مار مار کر روتے دیکھا گیا اس سے بھی یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ معاملے کو سمجھے بغیر استعمال ہوئے۔ تاہم صحیح رخ میں موزوں طریقے سے کی جانے والی تحقیقات ہی سے اس بارے میں حتمی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔

سانحہ کے بعد یہ تاثر دینے کے لئے بڑی سرگرمی دکھائی گئی کہ اس کے ذمہ دار شیعہ ہیں جن کے ایک ممتاز رہنما جولائی 88ء کے آخر میں شہید کر دیئے گئے تھے۔ اس سلسلے میں دو شواہد پیش کئے گئے۔ سب سے پہلے یہ کہا گیا کہ جہاز کے پائلٹ مشہود حسن شیعہ تھے لندن میں "الذوالفقار" کی طرف سے جاری کئے گئے ایک پریس ریلیز میں مشہود حسن کو اس کارنامے کا کریڈٹ دیتے ہوئے ہر سال ان کی

برسی منانے کا اعلان کیا گیا، لیکن جلد ہی یہ حقیقت سامنے آئی کہ مشہود کیس ات پشتوں میں کوئی شیعہ نہیں تھا اور یہ کہ وہ مشہور اخبار نویس الطاف حسن قریشی کے رشتہ دار تھے۔ بعد میں ایک اور کہانی سامنے آئی۔ بعض ذرائع نے دعویٰ کیا کہ ائیر فورس کا ایک اور پائلٹ سکواڈرن لیڈر رمیض شیعہ مکتب فکر سے تعلق رکھتا تھا اور چونکہ وہ پاک ون کے کو پائلٹ ساجد کے قریب تھا لہٰذا اس نے ساجد کی برین واشنگ کی۔ اس کے نتیجے میں پرواز کے دوران ساجد نے جان بوجھ کر کنٹرول سسٹم خراب کر کے جہاز تباہ کر ڈالا۔ اس شبہ کی بنیاد پر رمیض کو حادثے کے بعد گرفتار کر لیا گیا، وہ چھ سات ہفتے زیر تفتیش رہا اور اطلاعات کے مطابق تفتیش کے دوران اسے اذیت بھی دی گئی۔ آخر کار ائیر فورس کے اعلیٰ حکام اس کی مدد کو پہنچے۔ سامنے کی دلیل یہ تھی کہ پائلٹ کے ہوتے ہوئے کو پائلٹ اگر چاہتا بھی تو جہاز نہیں گرا سکتا تھا۔

شیعہ مکتب فکر کو سانحے میں ملوث دکھانے کے لئے کچھ اور کہانیاں بھی گھڑی گئیں اور خفیہ دستاویزات کے نام پر بعض بھدے سے فوٹو سٹیٹ ملک کے سینکڑوں اخبارات اور جرائد کو بھجوائے گئے اس کے پیچھے بھارت سمیت کئی عناصر کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ بھارتی اس سے بڑھ کر کوئی چیز پسند نہ کریں گے کہ پاکستان جو سندھ میں لسانی کشمکش کے المیے سے دوچار ہے، شیعہ سنی فسادات کی زد میں آ جائے۔

قادیانیوں پر بھی الزام لگایا جاتا رہا اور یہ بھی اصل مجرموں سے توجہ ہٹانے کی کوششوں کا حصہ ہی معلوم ہوتا ہے۔

جولائی 1989ء میں پنجاب پولیس نے اپنے طور پر تفتیش کا آغاز کیا اور ایک مرحلے پر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مجرموں کو جا لے گی لیکن پر اسرار ہاتھ حرکت میں آ گئے۔ امریکی ایف بی آئی، جرائم کی تحقیقات کرنے والی امریکی کانگرس کی ذیلی کمیٹی اور پاکستانی آئی ایس آئی کی طرح اسے کام کرنے سے روک دیا گیا۔

صدیق سالک مرحوم کے صاحبزادے سرمد سالک نے ناقص حفاظتی انتظامات

کے ذمہ داروں کے خلاف دس کروڑ روپے ہرجانے کی رٹ دائر کر رکھی ہے 1989ء کے آخر میں عدالت نے سرمد سالک کے حق میں یک طرفہ طور پر فیصلہ دے دیا کیونکہ حکومت نے اپنا موقف پیش کرنے سے گریز کیا تھا۔ بعد ازاں حکومت نے اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ ہی میں اپیل دائر کی جو ابھی زیر سماعت ہے۔ اب یہ ایک دوسرے جج کے پاس ہے جبکہ فیصلہ دینے والے جج تبدیل ہو کر لاہور آ گئے ہیں۔

سرمد سالک کی طرف سے دائر کی گئی ایک دوسری رٹ میں عدالت کے اس فیصلے کے بعد جس میں پنجاب پولیس اور ایف آئی اے کو سرگرمی سے تحقیقات نہ کرنے کا ذمہ دار قرار دیا گیا تھا، بعض متاثرہ خاندانوں نے وزیر اعلیٰ نواز شریف سے رابطہ قائم کیا اور انہیں یاد دلایا کہ عدالتی حکم کے بعد نتیجہ خیز تحقیقات پنجاب پولیس کی ذمہ داری ہے جس کی حدود میں یہ واقعہ پیش آیا۔

جولائی 1989ء میں وزیر اعلیٰ نواز شریف نے ملتان کے ایس ایس پی احمد نواز خان نیازی کو طلب کیا اور کہا کہ وہ پوری آزادی اور ذمہ داری کے ساتھ مجرموں کا سراغ لگانے کی کوشش کریں۔ احمد خاں نیازی چند ہفتوں کے اندر یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ 17 اگست 1988ء کو بہاولپور میں 'الذوالفقار' کے سات ایجنٹ موجود تھے اس نے بعض گواہیاں ریکارڈ کیں اور یہ پتہ چلا لیا کہ اس میں را کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

اسے اپنی تفتیش آگے بڑھانے کے لئے ایف آئی اے کے تعاون کی ضرورت تھی۔ اس کی تجویز پر پنجاب پولیس نے سرکاری طور پر ایف آئی اے کو لکھا کہ وہ سانحہ بہاولپور کے سلسلے میں 1988ء میں شروع کی جانے والی اپنی تفتیش کے نتائج سے پنجاب پولیس کو آگاہ کرے اور متعلقہ دستاویزات اس کے حوالے کی جائیں ایف آئی اے کے مرکزی دفتر نے اس درخواست کا کوئی جواب نہ دیا چنانچہ یاد دہانی

کے کئی خط لکھے گئے، اور جب انہوں نے جواب لکھا تو اس میں کہا گیا تھا کہ پنجاب پولیس کو سانحہ کے ایک سال بعد تحقیقات کا خیال کیوں آیا خط میں کہا گیا تھا کہ پنجاب پولیس اسلامی جمہوری اتحاد کے کہنے پر سیاسی مقاصد کے لئے تحقیقات کرنا چاہتی ہے پولیس کا جوابی استدلال یہ تھا کہ ملک کے صدر اور 28 اعلیٰ فوجی افسروں کے قتل کی تحقیقات محض اس لئے ختم نہیں کی جاسکتی کہ اس کے نتائج سیاسی ہو سکتے ہیں۔ نیازی نے گواہوں اور شواہد کی بنیاد پر یہ رائے قائم کی کہ 17 اگست کے سانحہ کی منصوبہ بندی را نے کی تھی جس کی مدد سے 'الذوالفقار' کے ایجنٹ بہاولپور سے 114 کلومیٹر دور بھارتی سرحد سے پاکستان میں داخل ہوئے۔

حتمی نتائج اخذ کرنے کے لئے وہ 17 اگست کو بہاولپور کے ہوائی اڈے پر حفاظتی انتظامات کے ذمہ دار بعض فوجی افسروں سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے بعض اہلکار فوجی رجمنٹوں میں بھیجے لیکن کسی نے انہیں گھاس نہ ڈالی نیازی جلد ہی شکایت کرنے لگا کہ نہ صرف تحقیقات سے چمد الگ ہو جانے والی آئی ایس آئی بلکہ خود اس کا اپنا محکمہ بھی اس کی نگرانی کرتا ہے وہ گھبرایا ہوا تھا اور سہارے کا طالب تھا لیکن کسی نے اس کی مدد نہ کی

نومبر کے آغاز میں ملتان میں متعین، لاہور کے ایک انگریزی اخبار کے نمائندے کو معاملے کی سن گن مل گئی اور اس نے ایک رپورٹ اپنے اخبار کو ارسال کر دی لیکن یہ رپورٹ شائع نہ کی گئی۔

اسی شائع ادارے کے اردو اخبار نے یہ خبر 29 نومبر 1989ء کو پہلے صفحے پر 6 کالم شہ سرخی کے ساتھ شائع کر دی خبر میں کہا گیا تھا کہ پنجاب پولیس مجرموں کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گئی ہے اس پر ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا اگلے ہی روز پنجاب پولیس کے انسپکٹر جنرل سلمان قریشی نے خبر کی تردید کی۔ اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا مجرموں کا سراغ ملنے کا سوال ہی کیا ہے کیونکہ

پنجاب پولیس تو سرے سے تفتیش ہی نہیں کر رہی اسی روز وفاقی حکومت کے ایک ترجمان نے بھی ایک بیان جاری کیا۔ اس بیان میں مجرموں کا سراغ ملنے کی اطلاع کو اسلامی جمہوریہ اتحاد کے ڈس انفارمیشن سیل کی کارروائی قرار دیا گیا تھا ترجمان نے کہ موجودہ حکومت اگست 1988ء میں اقتدار میں نہیں تھی اور نہ ہی اس کے پاس ایسے ذرائع تھے جس سے وہ تحقیقات میں مداخلت کر سکتی۔ اس کے علاوہ اگر مرحوم صدر ضیاء الحق اور جنرل اختر عبدالرحمٰن کے بیٹوں کے پاس کوئی شہادت موجود ہوتی جیسا کہ رپورٹ میں کہا گیا ہے تو موجودہ حکومت کے برسر اقتدار آنے سے کافی پہلے پنجاب کے موجودہ وزیر اعلیٰ کو جو اس وقت نگران وزیر اعلیٰ تھے آسانی کے ساتھ پیش کر سکتے تھے اگر کسی کو شبہ ہے کہ سانحہ کی تحقیقات پر پردہ ڈالا گیا ہے تو پھر یہ سوال اس وقت کی، پنجاب کی نگران حکومت سے کیا جانا چاہئے۔

پنجاب پولیس کے آئی جی اور وفاقی حکومت کی طرف سے جاری کردہ تردید کے بعد، جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ تفتیش کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ 30 نومبر کو خبر فائل کرنے والے رپورٹر کو اظہار وجوہ کا نوٹس جاری کر دیا گیا۔ گھبراہٹ کے عالم میں اس نے معلومات فراہم کرنے والے ذرائع سے رابطہ کیا۔ اس کی نوکری خطرے میں تھی۔

اگلے روز وہ بھاگم بھاگ ہوائی اڈے پر پہنچا جہاں وزیر اعلیٰ کسی تقریب کے سلسلے میں موجود تھے۔ صرف ایک چیز اس کی نوکری کی ضمانت دے سکتی تھی کہ وزیر اعلیٰ تفتیش کی تصدیق کر دیں، دوسری صورت میں اسے ہوائی اڈے سے دفتر کی بجائے سیدھے اپنے گھر چلے جانا چاہئے تھا اس وقت رپورٹر کی جان میں جان آئی جب وزیر اعلیٰ نے کہا 17 اگست 1988ء کے سانحہ بہاولپور کے سلسلے میں پنجاب پولیس کی تفتیش جاری ہے اور اس سلسلے میں کچھ پیش رفت بھی ہوئی ہے۔ اس سانحہ کے بارے میں ہائی کورٹ نے بھی حکومت پنجاب سے رپورٹ مانگی ہے جو ہم عدالت

میں پیش کریں گے جس سے تمام صورتحال منظر عام پر آجائے گی جب ان سے سوال کیا گیا کہ آئی جی نے تو تفتیش سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے تو انہوں نے کہا پنجاب پولیس ایسے واقعات کی تفتیش سے غافل نہیں رہ سکتی اور یہ پولیس کا فرض ہے کہ جہاں بھی اس نوعیت کا واقعہ رونما ہو چاہے کوئی دوسری ایجنسی اس کی تفتیش کرے یا نہ کرے پنجاب پولیس اس کی تفتیش ضرور کرے گی۔ رپورٹر کے چہرے پر رونق آ گئی، اس کی نوکری محفوظ تھی لیکن سوال یہ تھا کہ آئی جی سلمان قریشی تردید کیوں کر رہے تھے؟ اخبارات نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی البتہ اسی روز آئی جی کا ایک بیان اخبار میں شائع ہوا کہ پنجاب میں سندھ ایسی صورتحال پیدا ہو رہی ہے

یکم دسمبر 1989ء کو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے اپنے اس اعلان کو دہرایا کہ پنجاب حکومت حادثہ بہاولپور کی تحقیقات کرے گی اور رپورٹ عوام کے سامنے پیش کی جائے گی۔ وزیر اعلیٰ کے الفاظ یہ تھے شہید جنرل محمد ضیاء الحق کے طیارے کا حادثہ ایک بہت بڑی تخریب کاری تھی، جس سے ملک کا صدر اور کئی ایک فوجی جرنیل شہید ہو گئے موجودہ وفاقی حکومت نے اس سلسلے میں کوئی تفتیش نہیں کی اور ایف آئی اے کو آرام سے بٹھا دیا کہ تفتیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ حکومت پنجاب نے ایف آئی اے سے رابطہ کیا کہ اس نے اس المناک حادثہ کے بارے میں جو شواہد جمع کئے ہیں وہ حکومت پنجاب کے حوالے کر دیئے جائیں لیکن انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اس انکار سے بڑا جرم کیا ہو سکتا ہے

وزیر اعلیٰ کے خطاب کے ٹھیک تین دن بعد آئی جی سلمان قریشی نے ڈی آئی جی ملتان کو حکم دیا کہ ایف آر نمبر 252 سانحہ بہاولپور کی تفتیش اس وقت تک روک دی جائے جب تک ہم وزارت قانون کی قانونی رائے نہیں جان لیتے۔ آئی جی نے یہ حکم اس وقت جاری کیا جب وزیر اعلیٰ کو عمرہ کے لئے حجاز روانہ ہوئے چند گھنٹے

گزرے تھے ٹیلیکس کے ذریعے بھیجے جانے والے اس پیغام کی نقل اخبار نویسوں کے ہاتھ لگ گئی اور 6 دسمبر کو کراچی اور اسلام آباد کے دو اخبارات نے یہ خبر شائع کر دی اس خبر میں بتایا گیا تھا کہ سلمان قریشی یہ سب کچھ وفاقی حکومت کے ایما پر کر رہے ہیں جن سے بعض مرکزی وزراء نے امریکہ میں مقیم ان کے بھائی کے توسط سے رابطہ قائم کیا ہے۔ اور یہ کہ اگر انہیں آئی جی کے منصب سے ہٹایا گیا تو انہیں ایف آئی اے کی سربراہی سونپ دی جائے گی 24 گھنٹے کی خاموشی کے بعد آئی جی نے ایک مختصر سا بیان جاری کیا جو 8 دسمبر کے اخبارات میں اس طرح چھپا انسپکٹر جنرل پولیس پنجاب سلمان قریشی نے وضاحت کی ہے کہ پنجاب پولیس نے سانحہ بہاولپور کی تحقیقات ختم نہیں کی ہے۔ انہوں نے کہا اعلیٰ سطحی ٹیم اس ہوائی حادثہ کی تحقیقات کر رہی ہے اور ایف آئی اے کو متعلقہ فائل واپس کرنے کو کہا گیا ہے۔

آئی جی نے خبر کی تردید کر دی مگر انہوں نے یہ وضاحت نہیں کی کہ کیا انہوں نے تفتیش روکنے کا حکم دیا تھا یا نہیں۔ وہ اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ اس بارے میں صاف صاف بیان جاری کر سکتے کیونکہ اخبار نویسوں کے پاس ان کے ٹیلیکس سے بھیجے گئے، پیغام کی فوٹو کاپی موجود تھی۔ آئی جی نے اس بارے میں بھی یکسر خاموشی اختیار کر لی کہ ٹھیک 9 دن پہلے انہوں نے یہ دعویٰ کس طرح کیا تھا کہ تحقیقات کا آغاز اب تک نہیں ہوا اور اب کس بنا پر وہ کہہ رہے تھے کہ تفتیش ترک نہیں کی گئی۔ آئی جی کے بیان میں کلیدی جملہ وہ تھا جس پر کسی نے غور تک نہ کیا اور جس کی حقیقت اگلے ہفتوں اور مہینوں میں کھلی ایف آئی اے کو متعلقہ فائل واپس کرنے کو کہا گیا ہے ایف آئی اے تو دسمبر 1988ء ہی سے تفتیش ترک کر چکی تھی اور اس نے جولائی ہی میں پنجاب پولیس کو فائل دینے سے انکار کر دیا تھا۔ پنجاب پولیس کا سربراہ اب دسمبر میں اس فائل کا حوالہ کیوں دے رہا تھا کیا اس کا مطلب اگلے دنوں میں کیس کو آگے بڑھانے سے روکنے کے لئے ایک بہانہ تلاش کرنا تھا؟

بدترین اندیشے درست ثابت ہوئے اور 8 دسمبر کو جاری کردہ تردید کی بجائے آئی جی کے 4 دسمبر کے پیغام پر عمل درآمد ہوا۔ کچھ عرصہ بعد احمد نواز نیازی کا تبادلہ ملتان سے لاہور کر دیا گیا۔ آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل حمید گل نے جو سرکاری ملازمت میں رہتے ہوئے سچ بولنے پر مصر تھے اور غیر ملکی سازشوں کی مزاحمت کر رہے تھے فروری 1990ء میں سانحہ بہاولپور کی تحقیقات کرنے والے ونیٹی فیئر کو بتایا تھا کہ ان کے ادارے کو تفتیش سے الگ کیا جا چکا ہے، ایف آئی اے سے کسی توقع کا سوال ہی نہیں تھا اور اب پنجاب پولیس کے محاذ پر بھی سازشی جیت گئے تھے جن کے ہاتھ بہت بہت ہی لمبے تھے

احمد نواز نیازی بعد میں لاہور چلا گیا اور اس کے بارے میں سلمان قریشی کی طرح کئی کہانیاں سننے میں آتی رہیں تفتیش اب ایک اور افسر کے سپرد کر دی گئی، جسے ابتدا سے کام کا آغاز کرنا تھا۔

کیا صدر جنرل محمد ضیاء الحق اور جنرل اختر کے قاتلوں کا سراغ لگایا جائے گا یا وزیر اعظم لیاقت علی خان کی شہادت کے سانحہ کی طرح اسرار کا پردہ گہرا ہوتا جائے گا 1951ء کے برعکس 1988ء کا سانحہ اپنے پیچھے بہت سے نشانات چھوڑ گیا ہے قاتل زندہ ہیں اور ان کے خلاف زندہ اور جیتے جاگتے ثبوت بھی موجود ہیں جواب ضائع نہیں کیے جا سکتے۔ ایک ممتاز شخصیت کا خیال ہے کہ اگر دو فرانٹ تھانیداروں کو آزادی، اختیارات اور وسائل کے ساتھ یہ ذمہ داری سونپ دی جائے تو مجرموں کو ایک ہفتے کے اندر کٹہرے میں کھڑا کیا جا سکتا ہے اس مصنف کی رائے بھی یہی ہے

امریکہ پردہ پوشی پر تلا ہوا ہے یہ خود امریکی اخبارات کی رائے ہے محترمہ بےنظیر بھٹو کے نزدیک جن کے والد کو صدر ضیاء الحق کے دور اقتدار میں پھانسی دے دی گئی تھی یہ خدائی انصاف تھا۔ 'الذوالفقار' کے سربراہ میر مرتضیٰ بھٹو شام میں پناہ گزین

ہیں جہاں 1981ء میں اغواء کیا جانے والا پی آئی اے کا طیارہ لے جایا گیا تھا۔

اگر ملک کی ایک بھی طاقتور سیاسی جماعت یا طاقتور پریشر گروپ پوری طاقت سے یہ سوال اٹھا سکتا تو حکومت کے لئے مشکلات پیدا ہو جاتیں لیکن سیاسی جماعتیں یہ سوال کیوں اٹھائیں، انہیں اس سے کیا حاصل ہوگا؟ صوبائی اسمبلیوں، قومی اسمبلی اور سینٹ میں جہاں کسی رکن سے کسی سرکاری افسر کے الجھ پڑنے پر استحقاق کی تحریک پیش کی جا سکتی ہے اس سوال کا باضابطہ طور پر زیر بحث لانے کی ایک بھی معقول کوشش نہیں کی گئی اخبار نویس دانشور اور سیاسی کارکن سانحہ 17 اگست کو بھول جانا چاہتے ہیں طاقتور ادارے، حکمران اور پردے کے پیچھے حرکت کرنے والے پر اسرار ہاتھ سرگرم ہیں لیکن ان کی کامیابی ادھوری ہے ضیاء الحق اپنے پیچھے کوئی جماعت چھوڑ کر نہیں گئے مگر بے شمار دلوں میں وہ اب بھی زندہ ہیں 8 اگست 1989ء، 1990ء اور 1991ء کو اتنے لوگ اسلام آباد میں جمع ہوئے کہ اس شہر نے اپنی تاریخ میں ایسے اجتماعات اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

وہ ایک عجیب جنگ تھی جو افغانستان میں لڑی گئی۔ تاریخ انسانی کی سب سے بڑی چھاپہ مار جنگ، تاریخ کی سب سے زیادہ خفیہ جنگ، دو جرنیلوں نے یہ جنگ اپنی قوم کے بغیر لڑی اور اپنی فوج کے بغیر بھی، ایک خفیہ ادارے کے بل پر جنگوں کی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا اور شاید آئندہ بھی کبھی ایسا نہیں ہو سکے گا جب وہ لمحہ آیا جس سے آگے تاریخ کی جاودانی تھی تو وہ قتل کر دیئے گئے۔ تکمیل پاتے ایک خواب کے ساتھ وہ بہت سے دوسرے خواب دیکھ رہے تھے۔ افغانستان کے بعد کشمیر کی آزادی کا خواب اور افغانستان میں خائب و خاسر ہو کر لوٹ جانے والے سوویت یونین کی زنجیر میں جکڑے مسلمانوں کی آزادی کا خواب، پاکستان، ایران ترکی اور آزاد افغانستان پر مشتمل ایک اتحاد کی تشکیل کا خواب، جو مسلمانوں کی

آزادی کو مکمل کر دے اور صدیوں کے ادبار سے انہیں نجات دلا دے۔ ان کی اپنی قوم تو اس خواب کی رفعت سے آشنا نہ ہو سکی لیکن دشمن اسے پہچان گئے بھارتیوں نے اسے سمجھ لیا جن کے ہاتھوں سے پنجاب اور کشمیر کو نکل جانا تھا۔ روسیوں نے اسے جان لیا جنہیں اپنی تاریخ کی سب سے زیادہ الم ناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اور امریکی تو ان جرنیلوں کو خوب جانتے تھے۔ جن کی بہترین کوششوں کے باوجود انہوں نے ایٹمی پروگرام اور ایران پالیسی پر سمجھوتے سے انکار کر دیا تھا۔

کیا اب یہ خواب کبھی پورا نہیں ہو سکے گا؟۔ اور ہماری آزادی ادھوری رہے گی۔ 1989 کے وسط میں ایک نوجوان امریکہ گیا۔ اس نے دنیا مین سب سے زیادہ پڑھے جانے والے جریدے سے متعلق ایک اخبار نویس سے ملاقات کی، اس کے کمرے میں زخمی افغان بچوں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ اور ایک پاکستانی جرنیل۔ جنرل اختر عبد الرحمان کی تصویر۔۔۔۔ اس نے کہا، جب وہ مایوس اور آزردہ ہو جاتا ہے تو وہ ان تصاویر کو دیکھتا ہے۔ اور ان سے اکتساب نور حاصل کرتا ہے۔

نومبر 1989ء میں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے ایک پاکستانی اخبار نویس کو مقبوضہ کشمیر جانے کا موقعہ ملا، واپسی پر اس نے لکھا کہ "کشمیر کے ہر گھر میں (آمر) ضیا الحق کی تصویر مسکراتی ہے"۔

افغانستان سے آنے والے خبر دیتے ہیں کہ ایک ہزار سے زیادہ جنگی مورچوں میں ہر کہیں ان کی تصاویر دیکھی جا سکتی ہیں۔ جنھیں ان کی قوم فراموش کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

وقت اب بھی حرکت میں ہے۔ زمین اور آسمان پر اب بھی اسی کی بادشاہت ہے۔ جس نے انسان کو ارادہ عمل کا اختیار بخشا، اور خواب دیکھنا سکھائے۔ جو شہید ہوئے۔ وہ شہید ہوئے۔ اب یہ ان پر ہے جو زندہ ہیں۔ اور آرزو کر سکتے ہیں؟۔ کیا وہ آرزو کریں گے یا تاریخ کے چوراہے پر لمبی تان کر سو جائیں گے؟۔

ختم شد
